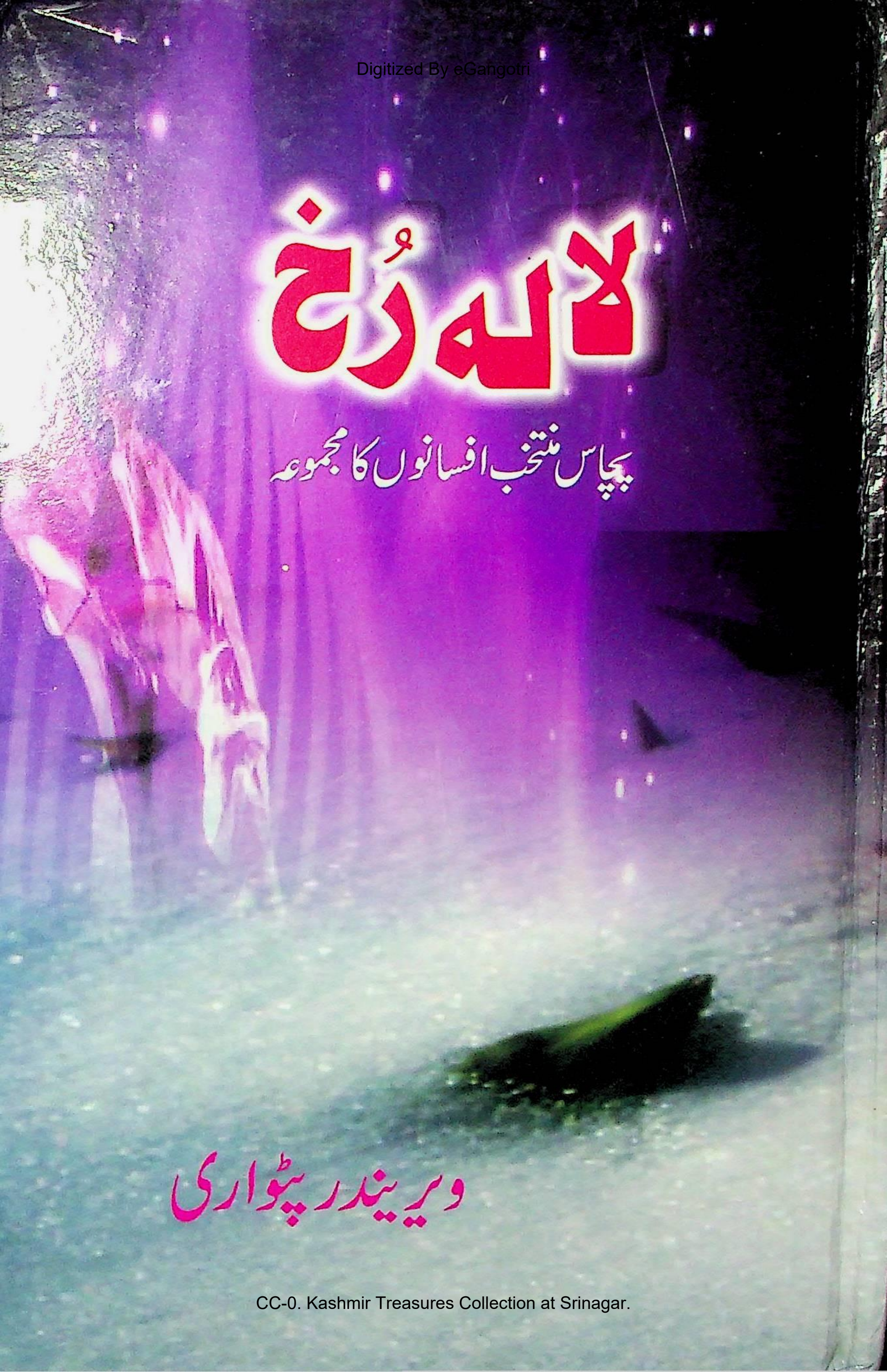


لالہ رُخ

پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ

ویریندر پٹواری

لالہ رُخ

ویریندر پٹواری

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869, Mobile : 9312566664
Email: vijaybooks@yahoo.com

LALLA RUKH (Fifty Selected Short Stories) **2013**
By: **Veerindar Patwari** **₹350/-**

لالہ رُخ

(پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ)

ویریندر پٹواری

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

C/o Dr. Ashok Patwari,
Reader Flat No. 2,
Lady Harding Medical College Campus,
Bangla Sahib Road, New Delhi-110001

کتاب کا نام : لالہ رُخ (پچاس منتخب افسانوں کا مجموعہ)
مصنّف کا نام : ویریندر پٹواری
سنِ اشاعت : 2013
قیمت : تین سو پچاس روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : زاہد مختار
مطبع : ایچ! ایس! آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 978-81-8042-259-1

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

فہرست

انتساب

میں اپنے پچاس برس لمبے، ادبی سفر کے دوران اُردو ادب کی خدمت کر پایا ہوں، یا نہیں؟

یہ میرے افسانوں کے قارئین!
میرے ریڈیو ڈراموں کے سامعین!
میرے ٹیلی ڈراموں اور سیریلوں کے ناظرین!
اور ناقدین ہی بتا سکتے ہیں!

میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر وہ سب، میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو "لالہ رُخ" جو میرے افسانوں کا نواں مجموعہ ہے، وجود میں نہ آیا ہوتا!

اور اگر برصغیر کے تقریباً پچاس عدد معیاری جرائد کے مدیران میرے افسانوں کو قارئین تک پہنچا نہیں دیتے تو میرے افسانے، میری فائلوں میں، چہرہ چھپا کر، سسک رہے ہوتے!-!!

میں اپنا یہ مجموعہ اِن کے ہی نام منسوب کر رہا ہوں!
کیونکہ وہ نہ ہوتے تو میرا وجود ہی نہیں ہوتا!!

میں ایک طویل عرصے سے بیمار ہوں!
چل پھر نہیں سکتا! بول بھی نہیں سکتا!!
ہاں مگر سوچ سکتا ہوں! سمجھ سکتا ہوں!!

گرد و پیش نظریں دوڑا سکتا ہوں! اور اپنے مشاہدوں کے دوران، اُبھرے ہوئے، خیالات، جذبات اور احساسات کو، اپنے تصورات کے دائروں میں قلمبند

کرسکتا ہوں!

عمل اذیت ناک ہے مگر نتائج سکون بخش ثابت ہورہے ہیں!!

اور اگر، میرا چھوٹا بھائی، **ڈاکٹر اشوک پٹواری**، جو میرا واحد ہم سفر ہے، میرا ساتھ دیتا رہے گا تو افسانوں کے، بلکہ ڈراموں کے بھی، کئی مجموعے شائع کرسکوں گا!

''لالہ رُخ'' ڈاکٹر اشوک پٹواری کے نام منسوب کرتے ہوئے مجھے سکون مل رہا ہے!!

ویریندر پٹواری

مجھے کچھ کہنا ہے!

نہیں نہیں! کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر میں بڑبڑا نہیں رہا ہوں! بلکہ ایک پراسرار حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے دبی دبی آواز میں صدائیں دے رہا ہوں!!

نہیں نہیں! میں رستم کی طرح اپنے بیٹے کو گود میں اُٹھا کر اُس کو زندہ کرنے کی ایک کوشش کرنے نہیں آیا ہوں! بلکہ میرا بیٹا ہی مجھے گود میں اُٹھا کر میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے!! اور نہیں تو کیا!؟

میرے وطن سے ہزاروں کوس دُور ایک سمندر کی چھوٹی بڑی آتی جاتی لہروں کو دیکھنے آیا تھا! حیران ہوں نہ تو دُور دُور تک پھیلے سمندر کی سطح پر کہیں کوئی لہر نظر آرہی ہے! اور نہ کناروں پر دوڑ رہی! بھاگ رہی! چل رہی! یا رینگ رہی! مخلوق نظر آرہی ہے! اور تو اور نہ پانی میں کوئی کشتی یا جہاز نظر آرہا ہے!! بلکہ آسمان میں بھی نہ کوئی اُڑ رہا پرندہ نظر آرہا ہے!! اور نہ آس پاس کوئی کیڑا اُڑتا ہوا نظر آرہا ہے!! چونکہ میں سانس لے رہا ہوں اس لیے ہوا کی موجودگی کا یقین ہو رہا ہے! پھر؟ کوئی تو بتا دے؟ کہ یہ کیسا مقام ہے جہاں ہوا ہے! پانی ہے! زمین ہے! آسمان ہے! آسمان پر آفتاب ہے! مگر زندگی نہیں ہے!! کہیں یہ مقام کسی شیطانی قوت کا فریب تو نہیں ہے؟ کوئی میری صدائیں سن کر اس سناٹے کو توڑ کیوں نہیں دیتا ہے!؟

میں اپنے آپ سے کیوں؟ گھبرا رہا ہوں؟؟ آج برسوں بعد بچپن، لڑکپن بلکہ اپنی جوانی کے دِنوں کی یادیں ستا رہی تھیں! اس لیے ان کو تازہ کرنے اور سمندر کو دیکھنے کی خاطر یہاں چلا آیا ہوں! یہاں کوئی جھیل نہیں ہے نا؟ اس لیے!! اپنے بچپن اور لڑکپن میں اپنے والدین کے ساتھ، اپنے شہر میں واقع ایک پُرکشش جھیل

میں ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی لہروں کو انگلیوں سے چھوکر ایک دلکش آواز سن کر، خوشی سے جھوم اُٹھا کرتا تھا! جبکہ بڑی لہروں کی گود میں جھول جھول کر ڈر کے احساسات کو مستی کے محسوسات سے حاوی ہو کر بھگا دیا کرتا تھا! جبکہ جوانی میں جھیل میں غوطے لگا کر اپنے اِردگرد پسندیدہ لہروں کو جنم دے کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا! یا پھر سنجیدہ ہو کر ہر موسم میں سحر سے شام تک کناروں پر چلتے چلتے یا گھنٹوں بیٹھ کر آتی جاتی چھوٹی بڑی لہروں کو دیکھا کرتا تھا! لمبی لمبی ایک دوسرے سے شانہ بشانہ چل رہی ہزاروں لہریں یوں نظر آیا کرتی تھیں گویا جھیل کے اُس پار موجود کمل کے پھولوں کی مہک کو اپنی چہک سے ہم آہنگ کرتے ہوئے فرشتے کناروں پر ان کا استقبال کرنے والوں کو امن اور بھائی چارے کے پیغامات دینے کی خاطر آ رہی ہوں!! کبھی کبھی اُچھل اُچھل کر بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرا کر پھر گلے لگا کر جیو اور جینے دو کا پیغام دے رہی ہوں!! کبھی کبھی مشینی کشتی سے پیدا کی ہوئی غیر فطری لہروں کو دبوچنے کی خاطر کناروں پر کھڑے لوگ ایک ہو کر انقلابی بن کر ایک ہی آواز میں انتقامی حملہ آور کو روک رہے ہوں! ٹوک رہے ہوں! بلکہ للکار رہے ہوں!!

ایسے ہی مناظر دیکھنے کی خاطر میں اس مغربی بحر کو دیکھنے آیا تھا! اور جو دیکھ چکا ہوں! اس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا! ہاں مشرق میں ذکر ہوتا ہے جب قیامت کا تب ایسے حالات کے بارے میں فکر ہوتی رہتی ہے! جیسے اساطیری کہانیوں میں ہوتا رہتا ہے! کاش ویسے ہی کوئی مسیحا آس پاس نمودار ہو کر یہ تو بتا دیتا کہ یہ سمندر خاموش کیوں ہے!؟

مگر اچانک؟ یہ آواز ہے؟ یا سمندر کا فریب؟؟

یہ کیا؟ آواز میں درد ہے! اور لرزش بھی! کوئی میرے آس پاس ہے! مگر وہ سامنے کیوں نہیں آ رہا ہے؟ کہیں میرے کان تو نہیں بج رہے ہیں؟!—!؟

نہیں نہیں! آواز صاف ہو چکی ہے! اور ہر جملے کا تعلق سمندر سے ہے! جملوں کو جوڑ کر میں یہ جان گیا ہوں کہ ہزاروں صدیوں پہلے، یہ سمندر اپنی طاقتور لہروں کے زور پر زمین پر آباد مخلوق کو برباد کر کے خالقِ جہاں کو اکثر ڈرایا کرتا تھا! پھر ایک بار اپنے آبی گرداب سے جب اپنے اِردگرد بستیوں کو بیابانوں میں بدل کر زمین کو

مکمل طور پر زیرِ آب کر دینے کی دھمکیاں دیتا رہا تب خالقِ کائنات نے سمندر کی لالچی خصلت کا فائدہ اُٹھا کر سمندر کو مالا مال کر دینے کا وعدہ کیا! اور پھر دونوں کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ جب تک سمندر بولتا رہے گا سمندر میں نمک کی مقدار میں اضافہ ہوتا رہے گا!!

آخر نمک کی زیادتی سے لہریں اُٹھ نہیں سکیں! گویا اپنے ہی لالچ میں آ کر تب سے اب تک وہ نہ بول سکتا ہے! اور نہ اپنے زندہ ہونے کا تاثر دے سکتا ہے! زندہ ہے مگر اپنی نرالی کیفیت کی وجہ سے مردہ سمندر (Dead Sea) کہلاتا ہے!

دراصل مالکِ دوجہاں نے قتلِ عام کرنے والے ایک مجرم کو پھانسی کی بجائے ایک اذیت ناک عمر قید کی سزا دی ہے!!

چونکہ آواز میں درد اور تڑپ کا تاثر تھا اس لیے مالکِ دوجہاں کا نام لے کر جب چند قدم چل کر ہاں ہاں! ہانپتے ہوئے!! تب اپنے پاؤں کے نیچے ایک انسان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر میں کانپ اُٹھا! سوچتا رہا کہ میرا بیٹا اپنے عملے کے ساتھ جلد از جلد آ جائے تاکہ میں عالَم کو لہروں کے حوالوں سے مل جل کر رہنے کے جواز پیش کرنے سے پہلے یہ جانکاری حاصل کروں کہ ہمارے شہر کی جھیل میں لہریں اُٹھ رہی ہیں یا نہیں!

آواز نے ایک بار پھر چونکا دیا!

میں اس انسان کے جسم کو نوچ نوچ کر کھا چکا ہوں! یہ خودسر لالچی انسان خالقِ کائنات کو اپنی تخلیقی توانائی سے آگہی دے کر یہ کہہ کر یہاں آیا تھا کہ اگر وہ ہیروشیما یا ناگاساکی کا وجود مٹا سکتا ہے تب وہ اپنے منصوبوں پر پانی ڈالنے والوں کو شعلوں کا کفن اوڑھ کر کروڑوں کو اپنی ہی راکھ میں دفن کر سکتا ہے!

یہاں آ کر وہ عمر قید کاٹنے والے سمندر سے نمک نکال کر دُنیا پر قابض ہونے کے آپسی اشتراک پر بات بھی نہیں کر سکا! کیونکہ ایک شدّت کے قلبی دورے کا شکار ہو کر وہ گر پڑا! تب میں نے اس کے جسم کو نوچ کر کھا لیا!

گویا وہ خوش بخت تھا جو سزائے موت پا گیا! غالباً اس لیے کہ جرم کرنے کا ارادہ تھا مگر وہ مجرم نہیں تھا!!

پھر ہمت باندھ کر جب میں نے اپنے نیک ارادوں کو ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ میں کائنات سے محبت کرنے والا ایک قلم کار ہوں تب وہ بول پڑا!

سمندر اور اس لالچی انسان کی طرح میں بھی ایک مجرم ہوں! اپنے انجام سے بے خبر ہوکر میں بھی خالق کی عطا کی گئی خوبیوں کا غلط استعمال کر چکا ہوں!!

رب نے مجھے ایک لمبی عمر سے نوازا تھا! بہت طاقتور پر دیے تھے! جن کی بدولت میں شاہین کی طرح بہت ہی اُونچی اُڑانیں لیتا رہا ہوں! شاہین کی نظریں آسمان کی بلندی پر جمی رہتی ہیں! جبکہ میری نگاہیں ہمیشہ زمین پر پڑے مُردہ جسموں کی متلاشی رہتی ہیں! میری نگاہوں نے ایک گمشدہ بیاباں میں ایک انسان کو پہلی بار سمندر سے باتیں کرتے دیکھا! دیکھ کر حیرت ہوئی تھی! مگر وہ جب قلبی درد سے تڑپ تڑپ کر مر گیا! تب میں بے حد خوش ہوا تھا!! وہ اس لیے کہ میں آسمان میں اُڑ رہا واحد گدھ تھا! یہ سوچ کر کہ مجھے منڈلاتے ہوئے دیکھ کر اور بھی گدھ میرے ساتھ زمین پر اُتر کر ایک جسم کی بوٹیوں کے حصے دار بن جائیں گے اس لیے میں زمین پر آ کر کھاتا رہا! کھاتا رہا!! اور پھر آخری بوٹی شکم میں ڈال کر اُڑان کے لیے جب اپنے پروں کو پھیلا کر اپنی مسرت کے اظہار کی خاطر رقص کرنا چاہا! تو اُڑان لے نہیں پایا! زندگی میں پہلی بار، اپنا بوجھ بھی نہ اُٹھا پانے کا احساس ذہنی کوفت کا مواد بن گیا! اور یوں اُڑان نہیں لے پایا!

اور اب کئی دنوں سے کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن کر ایک اذیت ناک ابدی سفر طے کر رہا ہوں!

خالقِ دو جہاں کی عدالت میں انصاف ہوتا ہے! ہوتا وہی ہے جو منظورِ خالق ہوتا ہے!

انسان کے انجام پر غصہ آ رہا ہے!

اپنے انجام پر مجھے ترس آ رہا ہے!

جبکہ سمندر کے انجام پر رونا آ رہا ہے!! کیونکہ وہ سن سکتا ہے! دیکھ سکتا ہے! مگر بول نہیں سکتا! یعنی زندہ ہے مگر مُردہ سمندر (Dead Sea) کہلاتا ہے!!

جھیل اور سمندر سے جڑے واقعات! اور پھر ان سے اُبھرے حالات کی حقیقی

اور تصوّراتی، منطقی اور علامتی، جنونی اور جذباتی عمل اور ردِّعمل کو بیان کرتے ہوئے میں نے خود کلامی اور اپنے خیالات اور احساسات کے تسلسل کے اسلوب کو اپنا لیا تو ایک واقعات سے جڑی کہانی ایک افسانہ بن گیا!

گویا واقعات ہی افسانوں کو جنم دیتے ہیں! ہاں رنگ برنگی دُنیا میں ایک ہی واقعہ کسی کے لیے خوشیوں اور کسی کے لیے غموں کی بارش برسا دے! وہ اس لیے کہ کڑی دھوپ ایک کمہار کے لیے ایک ضرورت ہے جبکہ ایک دہقان کے لیے ایک زحمت ہے! پھر اگر اچانک زور کی بارش ہو جائے! تو مہرِ خدا کمہار پر قہرِ خدا کا تاثر چھوڑ جاتی ہے!!

واقعات کسی کے گھر میں، محلے میں، گاؤں میں، شہروں میں، کھیتوں میں، صحراؤں میں، بیابانوں میں، بلکہ سرحدوں کی حدود میں رونما ہو سکتے ہیں!

واقعات سے اُبھرے حالات، حالات سے جڑے موضوعات، موضوعات سے وابستہ غموں اور خوشیوں، زحمتوں، رحمتوں، دوریوں اور قربتوں، نفرتوں اور محبتوں کے تاثرات!

تاثرات سے جڑے احساسات، محسوسات اور خیالات جب ایک ساتھ یوں نظر آتے رہتے ہیں گویا آغاز سے انجام تک، فیصلہ کُن دوڑ لگانے والے، اپنی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے ایک دلچسپ تجسس اور تذبذب کے کھنچاؤ اور دباؤ کے باوجود، اپنا، شروعات سے اختتام تک کا سفر طے کر دیں تب ایک افسانہ وجود میں آتا ہے! گویا ایک سفر کی کہانی اپنے حقیقی رنگوں کی بجائے تصوراتی رنگ ڈھنگ میں نظر آ کر، اُن نقطوں کو نمایاں طور پر عیاں اور بیاں کرتی رہتی جو افسانہ نگار کے اپنے نقطۂ نگاہ سے مطابقت رکھتے ہوں! کیونکہ ہر تخلیق کار کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ واقعات سے اُبھرے حالات کو اپنے خیالات کے دائروں میں دیکھ کر، اپنے عمیق مشاہدوں سے جڑے حالات کو نمایاں ترجیح دے کر کچھ ظاہر کر پائے! اپنی تخلیقی قابلیت اور اپنے ہنر کی مخصوص صلاحیت کی بدولت یہ طے کر جائے کہ کہانی کے سفر کو چھوٹا یا لمبا رکھے!؟ کرداروں یا مسافروں کو حقیقی یا علامتی رنگوں میں اُجاگر کرے!؟ بلکہ سفر کے دوران مسافروں کی ذہنی اور خیالاتی کیفیت کیا ہو گی!؟ سفر آرام دہ ہوگا یا تکلیف دہ ہوگا!؟ یہ سبھی نقطے تخلیق کار کے ذہن میں اُبھر کر، جب ایک منفرد ترتیب طلب کرتے ہیں تب ایک مخصوص اسلوب وجود میں آ جاتا ہے!؟ واقعات تو اریخی ہوں،

سماجی ہوں، یا سیاسی ہوں! حالات اچھے ہوں یا برے ہوں! خیالات اور احساسات انقلابی ہوں یا انتقامی ہوں! میں اپنے اس مجموعے میں شامل افسانوں کے حوالوں سے یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جیسے ایک موسیقار ایک کلاسیکل راگ کو نغمے میں بدلنے کی خاطر معقول بحر اور لفظوں والی شاعری کو اپنا لیتا ہے ویسے ہی افسانے کا مواد یہ طے کرتا ہے کہ اس کا سفر مختصر ہو یا طویل ہو، یعنی افسانہ بہت ہی چھوٹا ہو یا بہت ہی طویل ہو! 'روبوٹ' جیسا ہو یا پھر 'وراثت' جیسا ہو! بلکہ 'زندگی' جیسا ہو یا 'کروٹ' جیسا ہو! 'کرب' کی طرح بیانیہ (Narrative) ہو یا 'ایک ادھوری کہانی' کی طرح استعاری (Allegoric) ہو! 'پیاس' کی طرح علامتی ہو یا 'گھر' کی طرح ایک منفرد اسلوب میں پیش کیا گیا ہو! 'طوطا' کی طرح احساسات و خیالات کے تسلسل یا خود کلامی (Stream of Consciousness) میں سنایا گیا افسانہ ہو! 'دشمن' یا 'فیصلہ' جیسے علامتی افسانے ہوں، 'مینا بازار' کی طرح استعماری افسانہ ہو، 'ڈرپوک' کی طرح خود کلامی میں بیان کیا گیا افسانہ ہو یا 'بُودنا بوُدٗ' جیسا چونکا دینے والا ایک مختصر مگر سمندر کو کوزے میں بند کرنے والا علامتی افسانہ ہو! 'مہمان' کی طرح ایک نفسیاتی بیماری کو عیاں کرنے والا افسانہ ہو یا 'سامان' کی طرح 'آج' اور گزر چکے 'کل' کی ترجمانی کرنے والا افسانہ ہو، یا پھر 'کرب' یا 'لالہ رُخ' کی طرح ایک دوسرے سے جڑے، واقعات سے اُبھرے حالات کے شکار، مختلف کرداروں کا افسانہ ہو!

دراصل میں ان تمام افسانوں کے حوالوں سے بس اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر کہانی اور میرے ہر افسانے کے مرکزی خیال اور مواد نے خود مجھ سے اسلوب طلب کیا ہے!

میں یہ نہیں جانتا کہ وجوہات کیا ہیں؟ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے بلند ذوق قارئین کو اپنی ہر کہانی کو یوں سنانے کی کوشش کی ہے گویا آنکھوں دیکھا حال سنا رہا ہوں! بالکل ویسے ہی جیسے میری ماں مجھے بچپن میں، بلّیوں، بندروں یا دیگر جانوروں کی زبانی دلچسپ کہانی سنایا کرتی تھیں! وہ کہانیاں 'پنچ تنتر' کی معنی خیز کہانیوں جیسی ہوا کرتی تھیں اس لیے میں نے بھی 'فریاد' اور 'جانور' جیسے کئی افسانے لکھ دیے ہیں!

سنجیدہ موضوعات پر 'ایک اور ایجاد' جیسے علامتی افسانے اور 'شرم'، 'گردش' اور 'آزمائش' جیسے افسانے بھی لکھے ہیں تا کہ قارئین کو اپنے نقطۂ نگاہ کے بارے میں جانکاری دے کر، خیالاتی ہم آہنگی کی اُمیدیں پال سکوں! اور مخدوم کے اس شعر کو اپنا سکوں!!

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارا جہاں ساتھ لے کے چلو

پچاس برس پہلے جب میں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا تب میں پیشے کے اعتبار سے ایک سول انجینئر تھا! ایک بہت ہی کامیاب سرکاری افسر جو اپنی فنونِ ادب میں دلچسپیوں کو زندگی کا واحد مقصد سمجھ بیٹھا تھا! دن بھر وی کے پٹواری ایک انجینئر ہوا کرتا تھا اور شام کو گھر لوٹ کر گئی رات تک پڑھنے یا موسیقی سننے والے ویریندر پٹواری کے لیے، انگریزی اور روسی ادب کے علاوہ اُردو ادب کا مطالعہ کرنا ایک عادت بن گئی تھی! 'بیسویں صدی' دہلی، 'شاعر' بمبئی اور نیم ادبی نیم فلمی جریدے 'شمع' دہلی میں مرحوم خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور مرحوم راجندر سنگھ بیدی کے افسانے وہ بطور ایک طالب علم پڑھتا رہا! رفتہ رفتہ مرحومہ عصمت چغتائی، مرحوم رام لال، جناب جوگندر پال، جناب بلراج مینرا، مرحوم سریندر پرکاش، جناب نورشاہ اور مرحوم پشکرناتھ کے افسانے دلچسپی سے پڑھتا رہا اور ان کے اسلوب کو اپنا کر لکھتا رہا! مرحوم کنہیالال کپور اور مرحوم فکر تونسوی کے مشورے پر طنزیہ افسانے بھی لکھتا رہا!

سن ۱۹۶۵ء میں میری پہلی کہانی بعنوان 'سسکیاں' شائع ہوئی تھی، تب سے اب تک تقریباً ۲۷۵ افسانے لکھ چکا ہوں، جن میں ۲۵۰ عدد افسانے مطبوعہ ہیں!

'لالہ رُخ' تازہ ترین افسانہ ہے! (جون ۲۰۱۲ء)

میں اُن چند خوش بخت، اُردو کے افسانہ نگاروں میں ایک ہوں، جن کو اُردو کے معیاری جرائد کے مدیران کی حوصلہ افزائی کا شرف حاصل ہوا ہے!

شروعات میں میرا ادبی سفر نہایت دشوار رہا! میں افسانے لکھ کر مدیران کو بھیجا کرتا تھا! بیشتر افسانے لوٹائے جاتے تھے! اور منتخب افسانے بھی ایک سال کے انتظار کے بعد ہی منظرِ عام پر آیا کرتے تھے! اور یوں ایک سال کے دوران دو یا تین افسانوں کی اشاعت ممکن ہوا کرتی تھی! اس لیے مقبول ہونے کے امکانات نظر نہیں آیا کرتے تھے!

شاید اپنے کئی ہم عصروں کی طرح میں نے بھی، مجبور ہو کر، یا اُردو میں لکھنا بند کر دیا ہوتا یا پھر اپنی مادری زبان کشمیری میں بھی لکھنا چھوڑ دیا ہوتا! پھر ایک ذہین تخلیق کار کے مشورے پر میں نے کشمیری میں لکھنا بند کر دیا تھا اور انگریزی میں بھی کچھ لکھنے کی بجائے اُردو میں ہی لکھتا رہا! وہ عظیم کہانی کار و ڈرامہ نگار تھے مرحوم علی محمد لون!! ان کے علاوہ جموں کے ایک قد آور

شاعر مرحوم وید پال دیپ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے بھی لکھتا رہا جب 'بیسویں صدی' دہلی میں میری ایک کہانی شائع ہوئی تب میں سمجھ بیٹھا تھا کہ مجھے وہ مقام مل چکا ہے جہاں میں ایک بھیڑ میں نظر آؤں گا! لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا! بلکہ صرف مشہور و معروف ادبی جریدوں میں شائع ہونے کی کوشش میں، میرا نیم ادبی فلمی جریدوں سے بھی ناطہ ٹوٹنے لگا! اور میں نے لکھنا بند کر دیا!

پھر اچانک ایک مسیحا میری زندگی میں آیا! 'شاعر' بمبئی کے مدیر مرحوم تاجدار صدیقی نے نہ صرف میری چند کہانیاں اور ایک ڈرامہ شائع کر دیا بلکہ چند اہم اور ثمر آفریں مشوروں سے بھی نوازا! اور میں گرد و پیش پر نظریں جما کر، اخبارات میں خبریں پڑھ کر دورِ حاضرہ کے سماجی، سیاسی اور دیگر مسائل پر افسانے لکھتا رہا! اب جب میں جسمانی طور پر معذور ہوں تب بھی لکھ رہا ہوں! افسانے! نثری نظمیں! ریڈیو ڈرامے! ٹیلی ویژن کے سلسلے وار ڈرامے! اور فلمیں بھی!

اب تک میرے آٹھ عدد افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں چار عدد مجموعے مختلف اکادمیوں کے مالی تعاون سے شائع کر چکا ہوں! اور بلند ذوق قارئین، سامعین اور ناظرین کے علاوہ ناقدین میں بھی مقبول ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہوں!

ان کی حوصلہ افزائی سے محروم رہ کر کیا میں کچھ کر پاتا؟

ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!!

اور چاہتا ہوں کہ وہ سب مل کر، میرے پچاس افسانوں کے مجموعے کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے میں میری مدد کریں!

ضمناً یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ تقریباً تیس برس پہلے میں نے انگریزی زبان میں او ہنری (O. Henry) کی پچاس کہانیوں کے ضخیم مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلوب کے انتخاب کے بارے میں، ایک تربیتی جانکاری حاصل کی تھی! اُمید کہ میرے پچاس افسانوں کے مطالعے سے، نئے قلم کاروں کو، اپنے افسانوں کو بہتر سے بہترین بنانے کی خاطر، اسلوب کا انتخاب کرنے میں آسانی ہوگی! باقی اللہ جانے!!

—— ویریندر پٹواری

قاہرہ، مصر

مینا بازار

جانے یہ کون سی صدی ہے!

اور میں یہاں کیسے پہنچ گیا ہوں! کہیں سے اُڑ کر آیا ہوں یا پھر کہیں سے اُکھڑ کر آیا ہوں! مجھے کچھ بھی یاد نہیں! سچ پوچھیئے تو مجھے اپنا نام تک بھی یاد نہیں ہے!!

یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ کہہ نہیں سکتا! کیونکہ شناخت کے لیے نہ تو کوئی انسان نظر آرہا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی مکان!

اتنا جانتا ہوں کہ دُنیا گول تھی یا پھر اب بھی گول ہے! اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ مشرق میں کھڑا ہوں یا مغرب میں! شمال میں ہوں یا جنوب میں!!

میں بذاتِ خود کس نسل سے تعلّق رکھتا ہوں! یہ بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا! چہرے پر گوشت رہا نہیں! اس لیے!!

میں آریہ ہوں، منگول ہوں، چینی ہوں، حبشی ہوں، گورا ہوں یا کالا ہوں! یہ یاد نہیں آرہا ہے! ہاں، اُن دھماکوں کی آوازیں اس وقت بھی فضا میں گونج رہی ہیں جن سے میرے درودیوار پھٹ کر میرے جسم پر گر پڑے تھے! اور میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے اوپر گر پڑا تھا!! نظریں اٹھاتا ہوں تو اس وقت بھی آسمان سے آگ برس رہی ہے! اور زمین سے دھول اور دھواں اُٹھتا ہوا نظر آرہا ہے! لیکن پھر بھی پچھلی صدی کی طرح یہاں اس کھلے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے! کس نے لگایا ہے مجھے معلوم نہیں مگر ویسا ہی بازار ہے جیسے پچھلی صدی میں سجا سجایا رہتا تھا! فرق صرف اتنا ہے کہ اس صدی میں یا اس سے بھی پہلی صدی میں گاہکوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی! اور اس وقت یہاں میرے اِردگرد فقط تین گاہک نظر آرہے ہیں!

شاید یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں تب بھی ایک سیلزمین ہوا کرتا تھا اور اب بھی ایک سیلزمین ہوں!

ہاں تب میرے کئی ساتھی تھے! مختلف کاؤنٹروں پر کھڑے سیلزمین! کوئی بچّوں کے کھلونے بیچتا رہتا تھا اور کوئی رنگ برنگی چوڑیاں!

اِس وقت میرے واحد کاؤنٹر پہ نہ تو کھلونے ہیں اور نہ ہی چوڑیاں! مگر پھر بھی یہ تینوں

گاہک ایک دوسرے کی موجودگی کو، بالکل نظر انداز کر کے، میرے اکاؤنٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں!

ان میں ایک شخص شاید ایک مصور ہے یا پھر بُت تراش! کیونکہ وہ برش تلاش کر رہا ہے! رنگ تلاش کر رہا ہے!. کینوس تلاش کر رہا ہے! تیشہ تلاش کر رہا ہے! گاہے گاہے وہ اُچھل کر میرے اکاؤنٹر پر رکھی مختلف چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بڑبڑا رہا ہے! دیوانہ ہے شاید! جبھی تو میں ہنس رہا ہوں! اور کبھی رو رہا ہوں! حیران ہوں کہ یہ شخص سر کو دھڑ سے جوڑ کے کیا کرے گا! شاید دانستہ طور پر مجھے پریشان کر رہا ہے! کیونکہ اس شخص کے ساتھ چند قدم چل کر میں بھی بے وقوفوں کی طرح سوچنے لگا ہوں! ورنہ یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے کہ پہلے مُرغی تھی یا انڈا؟ پرندے تھے یا چرندے؟ پہلے انسان پیدا ہوا تھا یا شیطان؟؟

دوسرا گاہک شاید کوئی جادوگر ہے! وہ اپنی انگلیاں ہلا رہا ہے، اور وہی جانا پہچانا جادوئی ڈنڈا جس کی معمولی حرکت سے میرے اکاؤنٹر پر رکھی چیزیں یوں بکھر جاتی ہیں جیسے زلزلے سے کھنڈر کے پتھر! اور پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں، ہاتھ میں ایک فہرست لے کر دائیں بائیں دیکھتا رہتا ہے! پھر فہرست کو دستاویز سمجھ کر فاتحانہ قہقہہ لگا کر، مجھ پر رُعب ڈالتا ہے! گویا میں ایک سیلز مین نہیں بلکہ اس کا ایک خادم ہوں! یعنی وہ بادشاہ اور میں رعایا! کیا کروں بے بس ہوں!! میرے بازوؤں میں دَم ہوتا تو بہت پہلے اس کے ہاتھ سے اُس کی یہ جادوئی چھڑی چھین کر لے جاتا جس سے میرا اکاؤنٹر بار بار یوں ہل رہا ہے! کھلونے فرش پر گر کر بچوں سمیت آگ کی تپش سے پگھل رہا ہے! اور چوڑیاں بیواؤں کی مانگ کی طرح اُجڑ گئی ہوں!

یہ تیسرا گاہک کون ہے؟ یہ کہہ نہیں سکتا! وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے! اور اِکاؤنٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو یوں گن رہا ہے جیسے ووٹوں کی گنتی کر رہا ہو! اس نے کئی بار میرے سر پر بھی اپنا نشان لگا دیا ہے! اور اب وہ بہت خوش نظر آ رہا ہے! لگتا ہے کہ وہ کچھ خریدنے کی بجائے اپنے لگائے ہوئے نشانات کی بنا پر میرے اِکاؤنٹر کا خود ساختہ مالک بن گیا ہے!

خیران تینوں کی بات چھوڑیئے یہ فقط چاند ستاروں کی طرح میرے اِردگرد نظر آ رہے ہیں! مجھے معقول خریدار کی ضرورت ہے! اس دُنیا میں ہے کوئی جو میرے اِکاؤنٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو خریدنا چاہتا ہو؟ کوئی تو ہوگا! ارے ہاں یہ تو بتادوں کہ میرے اِکاؤنٹر پر کیا ہے!

چند کھوپڑیاں! چند ہڈیوں کے پنجر راکھ کے ڈھیر! اور بموں کے خول!!

OO

بود۔نابود

اِس بیج کو کون سمجھائے کہ آخر معاملہ کیا ہے! حقیقت کیا ہے! اور افسانہ کیا ہے! حالانکہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے! وہی صدیوں پرانی حکایتیں!!

اس بار بھی جب بے چارے بیج کو کسی نے زمین میں ڈال دیا تب اس کو ایک ڈراؤنا اندھیرا نظر آیا! یوں لگا جیسے کوئی کالا دیو، چاند دھرتی اور تاروں کو روشنی دینے والے سورج کو نگل گیا ہو! غالباً ویسے ہی لگ رہا ہوگا جیسے ایک مجاہدِ آزادی کو پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر اس وقت لگ رہا ہوگا جس وقت جلّاد اُس کے چہرے کو کالے کپڑے سے ڈھانپ دیتا ہے!

بیج کی یہ کیفیت دیکھ کر زمین نے سرگوشیانہ انداز میں کہا! ڈرو نہیں تم اپنی ماں کی کوکھ میں آ گئے ہو! کچھ دیر بعد جب تم ایک ننھے پودے کی شکل میں باہر آ ؤ گے تب تمھیں روشنی ہی روشنی نظر آئے گی!! پُر کیف ہوائیں تمھیں اپنی گود میں لے کر جھولا جھُلائیں گے! بارش تمھیں نہلائے گی! بدلتے موسم تمھارے خواب بن کر تم سے آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے! تمھاری خواہشات کا ہاتھ تھام کر رقص کرتے رہیں گے! تم دن کو سورج سے اور رات کو چاند ستاروں سے باتیں کرتے رہو گے! پھر ایک دن تمھاری شاخوں سے لٹکتا ہوا پھل دیکھ کر میں تم سے پوچھوں گی! اے تناور درخت! یاد ہے وہ دن جب تم ڈر گئے تھے! کوکھ کے اندھیرے سے!

بیج خاموش رہا! کوکھ کی ہلکی ہلکی سی آنچ محسوس کرتے ہوئے وہ انتظار کی گھڑیاں گِنتا رہا اور چپ چاپ بیٹھا رہا!!

اچانک ایک شور برپا ہوا! ایک پرندے نے چونچ مار کر بیج کو باہر نکالا اور وہ کوکھ سے نکل کر اس کے پیٹ میں چلا گیا! بیج کچھ بھی نہ کہہ پایا! مگر دھرتی چیخ پڑی! اُس کا حمل گر چکا تھا!!؟

OO

سامان

چھوٹے قد کے اوتار کرشن کو اپنی قد آور مقبولیت کا احساس ہوا تھا جب ممبئی کے ہوائی اڈّے پر ایک ایئر ہوسٹس (Air Hostess) نے اس کو اپنا بریف کیس اٹھانے میں مدد کرتے ہوئے ان کو 'بابوجی' کہہ کر یاد دلایا تھا کہ وہ وہی لڑکی ہے جس کی ماں کے آپریشن کا خرچہ ایک اجنبی افسرِ اعلیٰ نے اٹھالیا تھا!

جذبات کی رو میں بہہ کر، لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کر، ماضی کی جھلکیاں یوں سامنے آتی رہیں گویا ایک یادگاری البم میں ترتیب سے رکھی ہوئی تصویریں — تصویریں جو بول رہی تھیں اور یادیں تازہ کررہی تھیں!

بچپن کی —! جوانی کی — یعنی زندگی کے سفر کی —!

اس کے والدین اُس کو پانچ سال کی عمر میں 'پیارے بابو' کے لقب سے آوازیں دے کر اپنے گھر کے علاوہ محلے والوں کے چھوٹے بڑے کام کرایا کرتے تھے!

بابو — بازار سے سبزی لے آئے کیا؟

بابو — میرے لیے دوائی لائے کیا؟

بابو — پڑھائی بعد میں بھی ہوسکتی ہے! اپنے باپ کی دُکھ رہیں ٹانگیں دباتے رہو تب تک جب تک وہ سو نہیں جاتے!

بابو — اپنے لیے سبزی خریدنے جانا تو پیسے لینے آنا، تاکہ ہمارے لیے بھی خرید کرسکو گے کیا؟

کیا کریں تمھارا دوست برف باری میں گھر سے باہر جانا پسند نہیں کرتا نا! تمھاری طرح دلیر نہیں ہے نا؟

زندگی کا ایک دشوار سفر طے کرنے کے بعد جب اوتار کرشن ایک افسر بن گیا تھا تب محلے والوں نے، رشتے داروں نے، دکانداروں نے بلکہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں نے اس کو بابو

سے بابو جی سے بابو جی بنا دیا تھا! اور وقتاً فوقتاً طرح طرح کی امداد لینے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اس کے اسکوٹر پر اپنا سامان گھر سے باہر لے جانے یا گھر کے اندر لانے کے عادی ہو گئے تھے! اس کی مرحومہ بیوی بھی اس کو بابو جی کے نام سے آوازیں دے کر، گھر آئے مدد کے طلب گاروں کی رُوداد سن لینے کے لیے مجبور کرتی تھی!

ایئرپورٹ کے استقبالیہ ہال میں اپنے بیٹے، اپنی بہو اور دونوں پوتوں کے اُن کے سینوں سے لگائے ہوئے پھولوں کے گلدستے دیکھ کر، ماضی کی یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور وہ نیم دوڑ کر ان کے پاس گیا تھا!

اور پھر جب اپنے خاندان کے چاروں افراد، جو امریکہ میں تین سال گزار کر ممبئی میں رہنے کے لیے آئے تھے، نے اپنے وطن کی مخصوص پوشاک پہن کر روایتی انداز میں اُس کے پاؤں چھو کر اُس کا استقبال کیا تھا تب آشیرواد دینے کے بعد اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا تھا کہ کیا اُس کا ایک ہفتہ قبل ارسال کردہ سامان ممبئی پہنچ چکا ہے؟ بیٹے نے یہ اطلاع دی تھی کہ سامان آچکا ہے اور سامان کو 'ہال' میں رکھا گیا ہے!

اُس وقت اوتار کرشن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ممبئی کے چھوٹے چھوٹے فلیٹوں کے ایک واحد قدرے بڑا کمرہ 'ہال' کہلاتا ہے! جبکہ اُس کے ذہن میں اپنے گھر کا بہت بڑا ڈرائنگ روم (Drawing Room 20 x30) اُبھر کر سامنے آیا تھا! پھر اپنے محل نما گھر سامنے آیا تھا — وہ گھر جس کو وہ ایک مکان کی شکل میں چھوڑ کر آیا ہے خالی خالی کمرے جن کے دروازوں پر تالے بھی نہیں لگے تھے!

ہوائی اڈّے سے اپنے نئے گھر تک جاتے جاتے ایک لمبے سفر کے دوران اُس کو اپنے گھر سے جڑی یادیں تعاقب کر رہی تھیں جبکہ بیٹا سمجھ رہا تھا کہ بابو جی تھکان کی وجہ سے سو رہے ہیں!

سبکدوش ہونے سے دو سال پہلے جب اُس کی بیوی ایک لاعلاج بیماری کی شکار ہو کر، اس کا ہاتھ جھٹک کر، زمین چھوڑ کر ہوا میں کھڑی ہو کر، ہوا کی طرح نظر نہیں آئی تھی، تب اُس نے یادوں کو چھتری بنا کر، کڑی دُھوپ یا برف باری میں اپنا سفر جاری رکھا تھا — مگر اب بھٹک جانے کی بجائے یا بہک کر بھڑک کنے کی بجائے اُس نے اس مکان کو جس کو میاں بیوی نے تنکے سے تنکوں کو جوڑ کر اپنا گھونسلہ بنایا تھا اُس کو دیوار پر آویزاں ایک تصویر کی مانند ایک خالی خالی کمرے میں رکھ کر، دروازہ خود ہی بند کر دیا تھا! اور ایک جیکہ مہکتے چمن کو موسم بہار میں خزاں کے حوالے کر دیا تھا!

گویا ایک عالیشان سجے سجائے شادی کے منڈپ پر خود ہی دُلہن کے چمک دمک والے کپڑے اُتار کر، اس کو بیوہ کا پیرہن پہنا دیا تھا!

وہ ایک نوحہ گر ہے یا ایک ستمگر؟ جانے کیوں یہ خیال بھی اس کو بار بار چونکا تا رہا — گھر میں برسوں سے موجود قیمتی قالین، اُن پر ہمیشہ بہار پھولوں کی طرح نظر آنے والا فرنیچر، سجاوٹ کے لیے ہر کمرے میں رکھے خوبصورت بت، کھڑکیوں اور دروازوں پر لہک دار شاداب پردے، کمروں میں سردی اور گرمیوں کی شدت کا مقابلہ کرنے والی چھوٹی بڑی، بجلی پر چلنے والی مشینیں، راتوں کی تاریکیوں کو دن کے اُجالوں میں بدلنے والی، چھتوں پر لٹک رہیں قندیلیں، کھانے پینے کے لیے طرح طرح کے سودیشی اور بدیشی برتن، کھانے بنانے کے جدید ترین الیکٹرانکس (Electronics) ہر کمرے میں رکھے پلنگ، لحافیں، کمبلیں، جدید طرز کے گدے (Matresses) ٹی وی اور پانچ ستارہ ہوٹلوں کے کمروں جیسے منسلک غسل خانے — یہ تمام چیزیں اوتار کرشن نے ایک لاچار، اپنوں کے ٹھکرائے ہوئے ادھیڑ عمر کے لوگوں کے آشرم کو بطور کارِ نیکی اور بجائے انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے دان کر دیتے ہیں —

بابو جی کا نام شہر والوں نے اپنے دل و دماغ میں کرید کر درج کر لیا تھا! اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہے —! مگر اچانک ایک غزل، جو وہ اپنے قریبی دوستوں کے اصرار پر گایا کرتے تھے، کچھ لوگوں کے لیے یادگار بن کر، ذہن میں بطور ایک تلخ حقیقت درج ہو چکا تھا جبکہ چند لوگوں کی سوچ میں سوالیہ نشانات بن کر اُبھر کر آئے تھے! غزل یہ تھی:

وفائیں کتنی ہی مستقل ہوں
جفا کے خوُگر جفا کریں گے

جفا، بابو جی کے چاند جیسے اُجلے چہرے پر ایک داغ کھوجنے والے چند بدخو لوگ یہ جان کر حیران تھے کہ ممبئی کا پروگرام طے کرنے کے بعد، چھ روز پہلے جو سامان انھوں نے اپنے کمرے میں رکھا تھا اور جس کو کمرے کی لوہے کی مضبوط الماریوں میں رکھا گیا تھا! وہ کیا تھا —؟

وہ جو بابو جی کی ذاتی نگرانی میں، خاص طور پر بنائے گئے صندوقوں میں کیا رکھا گیا تھا؟ اور وہ کسی کی مدد لیے بغیر بڑے بڑے ٹرنکوں میں رکھ کر، ایک ٹرک میں ممبئی کے لیے روانہ کیا گیا تھا؟ سامان؟ وہ کیا تھا؟

پھر جب گھر کے ملازموں سے یہ کہا تھا کہ اپنی بیوی کی بے وقت موت کے بعد پچھلے چار

برس کے دوران بابوجی گھر کے ملازموں کو بھی اپنے کمرے میں داخل ہونے نہیں دیتے تھے! تب شکوک کے دائرے کی محیط پھیلتی ہی رہی تھی! اور خوگروں کو یقین ہوگیا تھا کہ سامان کو مقصداً پوشیدہ رکھا گیا تھا!

بقول گھر کے ملازمین وہ اپنے بہت بڑے بیڈروم کی صفائی بجلی کی مشینوں سے خود ہی کرتے رہتے تھے — کسی نوکر کی مدد لیے بغیر —! آخر کیوں؟

اپنے کپڑے، یا دیگر مطلوب چیزیں وہ ملازموں سے دروازے پر ہی روک کر لیے رہتے تھے! یوں گویا اُس کو کسی کو کمرے میں جھانک کر دیکھ لینا بھی گوارہ نہ تھا! آخر کیوں؟

حالانکہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں، کھانے کے کمرے میں، گھر کے دیگر کمروں میں، چھت پر بیٹھ کر یا اپنے گھر کے خوبصورت باغ میں بیٹھ کر یگانوں اور بیگانوں کے ساتھ غم اور خوشی کے خیالات، جذبات، احساسات اور محسوسات کے تبادلے کیا کرتے تھے؟ کبھی کبھار چند دوستوں کے ساتھ جام بھی ٹکراتے رہتے تھے لیکن جب وہ اپنے کمرے میں جایا کرتے تھے تب وہ دروازہ بند کر کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی گویا نہیں ہوا کرتے تھے —! آخر کیوں؟

اُس کا فائدہ لے کر اُن لوگوں کو جن کو چمن کی خوشبو میں بھی اپنی تصوراتی بدبو کا ذکر چھیڑ کر یہ ظاہر کرنے میں آسانی ہوتی رہی کہ بابوجی نے دودھ کی نہر بہا تو دی ہے مگر مکھن نکال کر — یعنی وہ بابوجی پر کالا دھن ممبئی بھیجنے والے ایک مکار کا داغ لگا چکے تھے اور یہ اطلاع ایئر ہوسٹس نے انے محسن کو دی تھی غالباً بچاؤ کرنے کی خاطر! وہ اوتار کو کچھ اور بھی بتا چکی تھی اس لیے وہ گھبرا گیا تھا کیونکہ تمام صندوقوں کی چابیوں کا اس کے بریف کیس (Brief Case) میں ہونے کی وجہ سے خدشات کا بوجھ سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا! اگر صندوقوں کو، اس کے گھر پہنچ جانے سے پہلے زبردستی کھولا گیا تو کیا ہوگا؟ زندگی میں پہلی بار اپنی ذہانت پر داغ لگنے کا شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس کو اپنے بیٹے کا اڈریس کا لکھنے کی بجائے ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر سے خود ممبئی آ کر صندوق لینے چاہیے تھے — یہ خیال اس کے تذبذب کی وجہ بن گیا تھا نا؟ اس لیے خدشات کا سبب بھی!؟

کار میں اس کے ساتھ چپک کر بیٹھا اُس کا بڑا پوتا گود میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر، جانے کیا کھوج رہا تھا مگر کچھ اور دیکھ کر جب بے ساختہ ہنس پڑا تھا تب اوتار کے خدشات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا!

اس سے پہلے پہلے کہ وہ پوتے سے پوچھ تاچھ کر لیتا پوتا اپنے مخصوص انگریزی لہجے میں بول پڑا تھا: با. بوجے (بابوجی) [illegible] (تناسب) سے ملا دیا تھا

جیسے سورج کی روشنی، پرزم (Prism) میں نظر آتے ہیں! لیکن رزلٹ (نتیجہ) غلط نکلا! I Mean to say (میرے کہنے کا مطلب ہے) سفید رنگ نہیں بناپایا! ایسا کیوں؟ You Must be Knowing.

اوتار اپنی عادت سے مجبور ہو کر جواب سمجھانے سے پہلے شعر بول پڑا تھا:

رنگ باتیں کریں، اور باتوں سے خوشبو آئے

پوتے نے دادا کی بات کاٹ کر کہا تھا You singso well (آپ اچھا گانا گا لیتے ہو) مگر ایک بار پھر پوتا دادا کے ہل رہے ہونٹوں کو سی کر بول پڑا تھا بابو جی، کیا آپ جانتے ہیں کہ آیل پینٹ (Oil Paint) کی (ایجاد) I Mean Invention ہیومن فلش (Human Flesh) کو دیکھ کر ہوا! (ہوئی)!

اوتار نے پوتے کو اشارہ دکھا کر چپ کراتے ہوئے کہا تھا— جبکہ یہ وہ اطلاعات ہیں جو مل جاتی ہیں پڑھ کر، دیکھ کر یا پوچھ کر— میں تمھیں دکھانے کی خاطر اپنے تجربات کے وہ رنگ اپنے ساتھ لے آیا ہوں جن میں تمھیں زندگی کے رنگ ہی تمھارے سوالات کے جوابات دیں گے— ذاتی تجربات میں ایک اٹوٹ وابستگی ہوتی ہے!

پوتا اپنے دادا کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا تھا اس لیے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا— اوتار کی بہو نے بگڑنے والی صورتِ حال پر قابو پا کر بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ بابو جی یہ بتا رہے تھے کہ تجربات یعنی Experiances ایجاد کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتی ہیں!

''نہیں، نہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے! یہ پاپا روز کہتے رہتے ہیں!'' بیٹا ماں کو ٹوک کر بول پڑا تھا— اور ضدی ہونے کا مظاہرہ کر رہا تھا! ماں اوتار کے چہرے پر سنجیدگی اور بے چینی کے ملے جلے تاثرات دیکھ کر بیٹے کو خاموش رہنے کا اشارہ دکھا کر اپنے شوہر سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی تھی!

اوتار کے دونوں پوتے الیکٹرانک گیمز (Games) کھیلتے رہے جبکہ اوتار اپنے خیالات اور احساسات کے تسلسل سے یوں وابستہ ہو گیا تھا گویا وہ جو بھی کہہ رہا تھا وہ اپنے پوتے کو سنا رہا تھا، بلکہ سمجھا رہا تھا کہ:

☆ ہاں ہاں ضرورت ایجاد کی ماں ہے!

☆ مگر ضرورت کی ماں کون ہے؟ یقیناً تجربات! ذاتی ہوں تو بہتر— گویا تجربات

میں ضروریات کا احساس دلاتی رہتی ہیں!

اور پھر احساس دلا کر ایجادات کرنے کا خیال دماغ میں ڈال دیتے ہیں! اتنا ہی نہیں، وہ ماضی کو حال سے اور پھر حال کو مستقبل سے، مستقل طور پر جڑے رہنے کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں — آج کیا ہے، اُس کو آنے والے کل میں کیا اہمیت ہوگی! یہ دیکھ لو — یہ میلی کچیلی پچاس برس سے زیادہ، نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی، مصر کی ممیز (Mummies) کی طرح رکھی گئی! یہ لحاف — پھٹی پرانی — ٹانکوں کی مدد سے — اپنے وجود کو بچا کر — اُن قیامت خیز دِنوں کی، صدمہ خیز کہانی ہے جب قبائلی حملہ آوروں نے ایک اسکول ماسٹر کا گھر اکھاڑ کر اجاڑ دیا تھا! یہ لحاف اُس وقت کے حالات عیاں کر دے گی! جب تجربات کے حوالے سے، تمھارے لیے ایک تواریخی دستاویزی ہے — بلکہ ایک انمول ماخذ بھی ہے! سال کی پہلی برف باری ہوئی تھی اور اسکول ماسٹر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رات بھر ٹھٹھر ٹھٹھر کر چھوٹی سی لحاف سے سبھی کو ڈھانپنے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہوئے ایک دلچسپ، خود پر گزری کہانی سناتا رہتا تھا — اذیتوں کے احساسات پر قدرے حاوی ہونے کی خاطر! اسکول ماسٹر اوتار کا باپ تھا!!

حالانکہ وہ کہانی دو سو بار پہلے بھی سن کر، رامائن کی طرح، دلچسپی کا مرکز اس لیے بن جایا کرتی تھی کیونکہ ہم سب سردی کا مقابلہ کر رہے تھے — اور اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تھے! ہر رات — قیامت خیز رات!!

یہ وہی لحاف ہے جو میں نے ایک ماخذ کی طرح اُسی وقت کے ایک ٹین کے ٹرنک میں گویا ایک ٹائم کیپسول (Tume Capsule) کی طرح سنبھال کر رکھ لی ہے — تمھیں دکھانے کی خاطر — اسکول ماسٹر کا بیٹا اوتار کرشن ہے! جو تمھارا دادا ہے — جس کی بی اے (B.A) پاس کرنے کے بعد شادی ہوئی تھی اور وہ ایک کلرک بن گیا تھا مگر پوسٹنگ ایک ایسے گرم علاقے میں ہوئی تھی جہاں کے موسم کے مطابق ہمارے پاس کپڑے بھی نہیں تھے، یہ وہ پھٹے پرانے کپڑے ہیں! بوسیدہ ہیں! مگر میں ان سے میں بہت پیار کرتا ہوں! میرے تجربات کے جُز ہیں یہ چھو کر تو دیکھ لو — ! بدبُو خوشبو میں بدل جائے گی! ہیں نا کتابوں میں رکھے پھولوں کی طرح؟ ایک دور کی کہانی بیان کر رہے ہیں! یہ ماخذ! اکھڑ کر اُجڑ چکی اقتصادیات کی کہانی سنا رہے ہیں!

ہمارے کمرے میں گرم ہواؤں کے ساتھ مچھر بھی ہم پر حملے کرتے رہتے تھے! عذاب دِہ حملے! پھر ہم نے تمھارے پاپا کے لیے تمھاری دادی کا ایک زیور بیچ کر ایک چھوٹا سا فرش پر رکھنے

والا بجلی پر چلنے والا پنکھا خرید لیا تھا— پھر بچے کو باری باری گود میں لینے کے بہانے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے لیتے رہتے تھے— یہ وہی پنکھا ہے! تاثیر مسیحائی والا پنکھا—!

میں گھر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر ایک امیر گھرانے کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا! ان کے گھر میں بہت ساری کتابیں تھیں اور میں ان کو پڑھا کرتا تھا— دل لگا کر! حالانکہ ان کو یہ پتہ بھی نہیں ہوا کرتا تھا کہ کون سی کتاب کہاں ہے— ہے بھی یا نہیں—! اس لیے اگر میں چوری کرتا تو پکڑا بھی نہیں جاتا مگر جب بھی میں ان کا خوبصورت دنیا کا اٹلس دیکھا کرتا تھا تب چوری کرنے کو جی چاہتا تھا— اس لیے کہ تمھارے پاپا کو دکھا سکوں کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور رنگین ہے!

پھر جب بھائی بہن کے جھگڑے میں اٹلس پھٹ گیا تھا تو اس کو پھینکا گیا تھا! میں اٹلس ردی کی ٹوکری سے نکال کر اپنے گھر لے آیا تھا تو وہ محلے کے بچوں کو دکھاتے دکھاتے اور ملکوں کے بارے میں معلومات دیتے دیتے میں سب کا دوست بن گیا تھا—! یہ وہی اٹلس ہے! میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا ورنہ اب تک کاغذ کے کیڑوں کی خوراک بن گیا ہوتا—! چھُو کر تو دیکھ لو! ہے نا ملائم—؟ گویا میں نے تمھارے لیے دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے! دنیا کی جغرافیہ تب کیا تھی اور اب کیا ہے— ہے نا ایک انمول ماخذ؟

یہ دیکھ لو یہ خوبصورت پلیٹ (Plate) تمھارے پاپا کانسی کی تھالی میں کھانا ڈال کر اس کو اٹھا نہیں پاتا تھا نا اس لیے میں نے اُس کے لیے خرید کر لائی تھی پہلی بار جنم دن کا تحفہ دینے کی خاطر!

اور ہاں اُسی دن اُس کی جنم پتری بھی مل گئی تھی! دیکھ لو—!! ہماری مادری زبان 'شاردا' میں لکھا ہر لفظ ہاتھ سے لکھا ہوا ہے اور یہ بھگوان شنکر کی تصویر ہاتھ سے بنائی گئی ہے! پھولوں کے رنگوں سے بنائی گئی یہ مصوری کا انمول تحفہ میں تمھارے لیے لایا ہوں!!

اب نہ تو زبان زندہ ہے اور نہ لکھنے پڑھنے والے— تم چاہو تو شاردا زبان کی داستاں سنا سکتے ہو! دنیا والو کو—! تم اگر ایسا کر پاؤ گے تو تمھارے دریافت ایجاد کہلائے گی! اور نہیں تو کیا؟!

ہاں— پھر میں جب آئی اے ایس (I.A.S) کا امتحان پاس کرنے کے بعد بطور انڈر سکریٹری (Under Seeretary) اپنی پہلی تنخواہ سے میں نے تمھارے پاپا کے لیے جو ٹرانسسٹر (Tranister) خرید لیا تھا وہ یہی تو ہے—! اور یہ ریکارڈ پلیئر اس کے بعد آ گیا تھا! پھر ہمارے گھر میں ٹی وی (T.V) وی سی آر (V.C.R) آ گئے تھے! ویڈیو اور آڈیو کیسٹ آتے رہے میری پسند پر— بلکہ سب کی پسند پر! میرے پاس پرانی فلموں کے بے شمار ریکارڈ ہیں! کسی فلم کا نام تو— اس کے

ریکارڈ میرے پاس ہیں! دیکھ ہو— سن لو! سچ مچ!!

یہ دیکھ لو موسیقی، سازوں اور آوازوں کا انمول خزانہ! برصغیر کا شاید ہی کوئی کلاسکل سنگر ہوگا جس کا ریکارڈ میرے پاس نہ ہو! استاد امانت علی خاں، استاد حسین بخش کیا آوازیں بھی میرے اثاثوں میں شامل ہیں! خان صاحب عبدالکریم خاں، پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر، بڑے غلام علی خاں جیسے قدر آور استادوں کے ریکارڈز میرے پاس ہیں— گویا ان ٹرنکوں میں کئی عجائب گھر ہیں! اور خزانے بھی! دیکھ لو! چُھوکر! سن کر یقین کرلو!!

کِس کِس کا ذکر کروں— بس میرے سنگیت کے خزانے میں غزلوں اور گیتوں کے نادر نمونے! جو اپنی داستانیں بیان کر رہے ہیں! سنا دو دنیا کو اور میری پچاس برسوں میں جمع کی گئیں کتابیں چھوکر دیکھ لو! ادب کی دھڑکنیں اپنے زندہ ہونے کی تصدیق کردیں گی! بقول میرے ہم عصروں کے! سمندر کی عمیق گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں کے درمیان زمین پر کہیں کوئی متوازی گنجینۂ ادب نہیں پاسکو گے! خاص طور پر شاعری میں اُردو کے تمام قلمکاروں کے نسخے پالو گے— غالبؔ، ذوقؔ، داغ، مخدوم، اقبال، نسیم، ظفر، ساحر اور آج کے نامور شعرا کی کتابیں یا پھر جرائد میں چھپے بے مثال تراشے پالو گے! دنیا کی بہترین فلموں کے ویڈیوز بھی مل جائیں گے کسی نہ کسی ٹرنک میں! وقت کی قید نہیں— کیونکہ اپنا اثاثہ تمھیں سونپنے آیا ہوں—! ٹائم کیپسول کھود کر نکالا جاتا ہے اور میں ٹرنک کھول کر— تمھارے سامنے رکھ رہا ہوں—! فقط تمھارے فائدے کے لیے!

ارے ہاں— تمھاری مرحومہ دادی کی دھارمک کتابیں، مادری زبان میں لکھی گئیں تصوف، وحدت اور شادی بیاہوں میں عام طور پر گائی جانے والی لیلائیں بھی ساتھ لایا ہوں— اور اپنا یہ سرمایہ تمھیں دینے کے لیے لایا ہوں— قبول کرلو! میرے ننھے پودو! تم آنے والے کل کے فلک شگاف درخت ہو! میں سچ بول رہا ہوں! سچ کے علاوہ کچھ بھی نہیں! تمھاری قسم!!

اوتار کے تصورات کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا! جب ایک عالیشان فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اوتار کے دونوں پوتوں نے خود ہی اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر بنائے گئے ایک خوبصورت پوسٹر پر We Welcomeour BABUJEEinour Home کا جوشیلے انداز میں مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو چونکا دیا تھا!

اوتار کرشن کی سیمابی کیفیت بھانپ کر اس کے بیٹے نے نہایت ادب و احترام سے اس کو

پلنگ پر آرام کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے اپنے بریف کیس سے چابیاں نکال کر ہال میں جانے کی ضد پکڑ لی! اپنا سامان کھول کر دِکھانے کی ضد!!

بیٹا باپ کی نس نس سے واقف ہونے کے سبب مزاحیہ انداز میں اطلاع دے گیا کہ وہ ہال میں ہی بیٹھے ہیں اور چونکہ ہال میں بہت سارے صندوقوں نے جگہ گھیر لی تھی اس لیے وہ اپنے ملازموں کو اطلاع دے چکا تھا کہ بابو جی کا سامان اسٹوریج اپارٹمنٹ میں رکھا جائے!

اس سے پہلے کہ اوتار کرشن کچھ کہہ پاتا بیٹے نے وی سی ڈی (V.C.D) میں ایک سی ڈی (C.D) ڈال کر نہایت ادب واحترام سے کہا—

بابو جی! میری ایک بدیشی کمپنی سے میٹنگ ہے اس لیے جانا پڑے گا— آپ کے پوتے، اپنی ماں کے ساتھ آپ کی آمد کی خوشی میں ایک پارٹی دینے کے سلسلے میں بازار جا چکے ہیں—

یہ سی ڈی آپ ہی نے ہمیں بھیج دی تھی! ظاہر ہے آپ کی پسندیدہ فلم ہوگی! آپ دیکھ لیں— ورنہ آرام کریں—!

اس سے پہلے کہ اوتار کچھ کہہ پاتا اس کا بیٹا چل پڑا—

اور فلم شروع ہوگئی—!

اوتار نے فلم دیکھی تھی— اور بے حد پسند بھی کی تھی— اس لیے بار بار دیکھ لی تھی— اس لیے اس بار ایک آہ بھر کر، گھر کے ایک ملازم کے ساتھ، اپنا ارسال کردہ سامان دیکھنے گیا—

ظاہر ہے کہ بلڈنگ کے بیسمنٹ (Basement) میں جانا پڑا!— اور وہ سامان کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا!

آنکھوں کے سامنے پہلے سینما ہال کی طرح فلم شروع ہونے سے پہلے اندھیرا چھا گیا تھا! ایک کمرے کے اندر سوئچ آن کرنے کے بعد ہی سامان صاف صاف نظر آ گیا! گویا وہ فلم منظر بہ منظر فلم کا کلیدی کردار اپنے گاؤں میں اپنی مقبولیت پر فخر کرنے والا، اپنے بے حد خوبصورت جسم پر ایک چیتے کی طرح بناوٹ اور سجاوٹ کے نشانات لگا کر جب شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے، ایک باوقار، خوددار رقاص کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ کسی بھی ناظر کی دلچسپی کا موضوع نہیں بن پایا ہے تو وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جو سرکس میں اصلی چیتے کا رقص یا کرتب دیکھنے جا رہے تھے— ایسا فلم میں دکھایا گیا تھا!

رقاص، سرکس کے جوکر کی طرح ہنستے ہنساتے رو پڑتا ہے!

گویا وہ اپنے آپ کو پہچان کر سجاوٹ اور بناوٹ کو بارش میں دھو کر خود ہی فرش پر لیٹ کر ایک لاش کی طرح نظر آتا ہے!

اوتار کو اپنا سامان ویسے ہی نظر آیا — گویا تابوتوں میں لاشیں! یا لحد میں ابدی نیند سو رہے بے روح جسم!

بلکہ اُس کی اشک بار آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی اُبھر کر آیا جب اُس نے اپنی مرحومہ بیوی کو پلنگ سے اُتار کر، کڑاکے کی سردی میں، ایک برف کی سِل پر دیکھا تھا — وہ بھی اس لیے کہ لاش آخری رسومات کروانے کی خاطر، اپنے امریکہ سے چل پڑے اکلوتے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی! سر کے قریب رکھے ایک چراغ کی لَو میں — جبکہ اس کا سامان کس کا انتظار کر رہا ہے؟ وہ بھی دن میں، ایک نیم اندھیرے کمرے میں! وہ سوچتا رہا!

کاش اُس نے خود ہی اپنا انمول اثاثہ کسی قدر دان یا مورخ کو سونپ دیا ہوتا — تا کہ ماضی کی فکر کرنے والے زندگی کے سفر کا ذکر کرتے! کھنڈروں میں دریافت کیے گئے ماخذوں کے مانند اس کے سامان کو زبان دے کر —!

بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے جونہی وہ اپنے بیٹے کے فلیٹ میں داخل ہوا تب ایک پسندیدہ آواز سن کر اس کا دل ویسے ہی دھڑکنے لگا جیسے وہ تیس برس پہلے یہ آواز سن کر دل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر، جھوم اٹھا کرتا تھا!

آواز ہال سے آ رہی تھی اور اوتار کی بہو بے حد خوش تھی کہ وہ اپنے پیارے بابو جی کو ان کی پسندیدہ غزل سنا رہی تھی اور بابو جی کے ساتھ ساتھ وہ بھی غزل گا رہی تھی — غالباً اپنے بابو جی کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر! مرحوم شکیل بدایونی کی غزل کی گلوکارہ مرحومہ بیگم اختر نے یہ ریکارڈ خود اپنے معقول مداح اوتار کرشن کو اپنے آٹوگراف کے ساتھ بطور ایک یادگار تحفہ دیا تھا:

دُور ہے منزل، راہیں مشکل، عالم ہے تنہائی کا
آج مجھے احساس ہوا ہے اپنی شکستہ پائی کا

اوتار کو اپنے خدشات پر اس قدر غصّہ آیا کہ وہ خوشی کے آنسوؤں کو روک نہیں پایا! اس کی بہو جانتی ہے کہ بابو جی ایسی ہی کیفیت کے شکار ہو کر غزلیں سننے کے عادی ہوا کرتے تھے اس لیے جب اپنی گرج دار آواز میں چونک پڑی بہو سے یہ جان لینا چاہا کہ اس نے یہ ریکارڈ اُن کے سامان سے تو نہیں نکالا — سراسیمگی کے عالم میں اس نے انکار کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ

ان کے تمام پسندیدہ نغمے، غزلیں، کلاسیکل گاین وغیرہ انٹرنیٹ (Internet) پر دستیاب ہیں، تب اوتار کو یوں احساس ہوا گویا وہ اپنے سامان کے بوجھ کے نیچے دب کر، اپنا سرمایۂ زندگی کو بکھیر کر جہاں سے اُٹھ رہا ہے! کاش اس نے صحیح وقت پر اپنا ذاتی سرمایہ بھی خیرات میں دیا ہوتا تو شاید ایک پھٹی لحاف کسی ننگے بچے کو ڈھانپ سکتی — پھر شدت سے احساس ہوا کہ اُس کی سمجھ ہی نا سمجھ ہے — اور سوچ کھوکھلی ہے!

اچانک اُس کو ایئر ہوسٹس کی باتوں کا آخری حصّہ، جو اُس نے سن کر ایک خیالِ بد کی طرح، اپنے ذہن سے فوری طور پر نکال دیا تھا، ایک برق بن کر اس کے وجود پر گر پڑا —

اس نے اپنے محسن کو سرگوشیوں میں ایک راز کی بات سنا دی تھی اور اس افواہ کے بارے میں اوتار کرشن کو اطلاع دی تھی کہ ان کا خیرات میں دیا گیا سامان آشرم کے منتظمین نے اپنے گھروں میں رکھ لی ہیں! جانکاروں کو یہ اطلاع دے کر کہ وہ سامان کی کل قیمت اوتار کرشن کو بھیج رہے ہیں — برق کا تاثر اپنی شدّت سے ایک کیچڑ میں کھلے، ایک خوبصورت مہک دار، لچک دار اور لہک دار، صدا بہار پھول کو غرق کر چکا تھا! اوتار کی بہو اور پوتے سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بابو جی آنکھیں بند کر کے غزل سن رہے ہیں یا تھکاوٹ کی وجہ سے سو پڑے ہیں —!

اوتار جاگ رہا ہے اور اُس کو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا ایک ٹھوکر کھا کر، نیند میں چلنے پھرنے بلکہ کام کاج کرنے والا، جاگ پڑا ہو!

اور پنے سامنے ایک گہری کھائی دیکھ کر لرز پڑا ہو!!

بہو نے جاننا چاہا کہ کیا وہ کم عمر میں وفات پانے والے گلوکار مرحوم ماسٹر مدن کی غزل 'یوں نہ رہ رہ کر ہمیں ترسایئے' سننا پسند کریں گے یا جگموہن کے نغمے "مجھے نہ سپنوں سے بہلاؤ" ماضی کو آواز دینا چاہیں گے؟؟

اوتار کرشن نے لیپ ٹاپ پر سرسری نظر ڈال کر، جب ان تمام نایاب نغموں کے اشارے پڑھ لیے تب پوتے کی ایک نئی نوٹ بک پر اُردو میں چند سطور لکھ دیں اور پھر اپنے بریف کیس میں رکھی چابیاں نکال کر، اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سو پڑا!

شام کو اس کا بیٹا ایک بہت بڑا 'خوش آمدید بابو جی!' لکھا ہوا کیک لا کر جب بار بار اپنے باپ کے دروازے پر دستک دیتے مایوس ہو گیا تب اس نے اپنی بیوی کو بتایا گویا بابو جی اس عمر میں بھی اپنی طرزِ کی زندگی جی رہے ہیں!

"کتنے بجے ان کو جگانا ہے کہیں لکھ کر رکھا ہوگا؟" وہ بڑبڑانے لگا—

بیوی نے نوٹ بک دکھادی اور یہ کہتی رہی کہ وقت بدل جاتا ہے دن رات بھی اپنے رنگ بدل دیتے ہیں! بقول بابو جی راگ راگنیوں کی شکل اور تاثر کی طرح! صبح کی راگ جے ونتی اور شام کو راگ مالکونش کہا جاتا ہے— بھیروی رات میں دن میں کبھی بھی گائی جاسکتی ہے، دکھ میں، سکھ میں اسی لیے تو وہ سہاگن راگ کہلائی جاتی ہے— زندگی بھیروی راگ بن جائے— یہی خواہش ہے! جبکہ اوتار کا بیٹا یہ کہتے کہتے کہ زندگی میں سنگیت یا فنونِ لطیفہ سے وابستہ، بے شمار ضرورتوں میں ایک ہے! واحد نہیں! اچانک بیٹا اپنے باپ کی تحریر پڑھ کر چونک پڑا!!

وقت بدلتا نہیں! چلتا رہتا ہے! پلٹ کر دیکھتا نہیں! زندگی یقیناً رنگ بدلتی ہے!

تجربات زندگی کو بیان کرتے رہتے ہیں! کیا؟ یہ سوچ کر سمجھنے کی بات ہے!

تصورات خواہشات کو عیاں کرتے رہتے ہیں! کیا؟ یہ سمجھ کو سوچنے کی بات ہے!

حالات بدلنے کی خاطر— قول کو عمل کا ہم سفر!

اور ہم نفس بتانے کی خاطر—! شورش سمجھ کر بھی!!

پاک نگاہوں سے— دُور دُور تک دیکھنے کی بجائے— نادان انسان آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر— بھول جاتا ہے کہ:

صندوق میں، ایک ماخذ کی طرح رکھی ایک میلی کچیلی لحاف!

کسی ٹھٹھر رہے بچے کو— ڈھانپ کر— زندہ رکھ سکتی تھی!

پوتے کی نوٹ بک جو اوتار کے بیٹے کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر یوں نظر آئی گویا ایک ٹوٹ چکے ستون کا وہ حصہ جس پر کچھ کرید کر لکھا گیا ہو!

اوتار کا بیٹا اپنے باپ کی کیفیت سے آشنا ہے اور سطور کا مفہوم بھی سمجھ گیا ہے!

بہو بابو جی کے بارے میں فکر مند ہے جبکہ بیٹا سوچ رہا ہے کہ ایسا کیا ہوسکتا ہے جو اس کے دونوں بیٹے لحاف جیسے سامان میں دلچسپی پیدا کی جاسکے! کہیں بابو جی نے واپس لوٹ کر جانے کے بارے میں سوچا تو؟ اپنے آئینے میں فقط اپنے عکس کو دیکھ کر اگلا قدم اٹھالیا تو؟؟

کیا بیٹا خود بھی آئینے میں اپنے عکس سے نظریں ملا پائے گا؟

یا ایک بار پھر وہ اپنے باپ سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو جائے گا؟

OO

ناصِح

ناصح — یعنی نصیحت کرنے والا — !

جو نہ انسان اور نہ بھگوان ہے بلکہ دونوں کی رضامندی سے انسان کی ایک کرشماتی ایجاد ہے! ایک ایسی ایجاد جو ایٹم بم کی طرح تباہ کن بھی ہو سکتی ہے اور ثمر آفریں بھی ثابت ہو سکتی ہے!!

ناصح، کیونکہ ایک ایسی ایجاد ہے جو اکثر مددگار ثابت ہوتی آئی ہے اس لیے کمپیوٹر کہلاتی ہے! مگر ناصح وہ کمپیوٹر 'جی' نہیں ہے جو سوالات پوچھ کر صحیح جواب کے لیے نقد انعامات دیتی رہتی ہے! جیسے آج کل ایک بے حد مقبول ٹی وی کھیل 'کون بنے گا کروڑ پتی' میں ہوتا رہتا ہے ویسے ہی ناصح وہ کمپیوٹر ہے جس سے سوالات کر کے جواب یا جوابات سن کر آپ کو اپنی الجھی ہوئی زندگی کو سلجھانے میں ثمر آفریں نتائج مل سکتے ہیں! مشورے، رائے کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی ایک دوسرے سے جُڑ کر مل سکتے ہیں!!

جی ہاں! اور ناصح سے رجوع کرنا بھی بہت آسان ہے! کوئی بھی خود آ کر 'کمپیوٹر' جس کو آپ لوگوں نے اپنی مقبولیت کی وجہ سے کمپیوٹر مہاراج یعنی کے. ایم (K.M) کا لقب دیا ہے، آمنے سامنے بیٹھ کر اپنی مشکل یا مشکلات بیان کرنے والوں کو معقول نصیحت یا مشورہ دے سکتا یا سکتی ہے! یعنی وہ مرد بھی ہے اور عورت بھی ہے! بلا جھجک رجوع کریں!

کوئی ای میل، ایس ایم ایس (S.M.S) یا فون کرنے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی ہے اُن کو جن کو آپسی راز داری پر بھروسہ ہو، براہِ راست رجوع کر سکتے ہیں!

اپنے شکوک کو، اُبھرنے سے پہلے نیست و نابود کرنے کی خاطر، ایک حلف نامہ کمپیوٹر مہاراج میں درج کرنے کے بعد، نصیحت حاصل کرنے والے کو ایک موٹی رقم جمع کرنی پڑتی ہے، رقم کتنی ہوگی یا ہے یہ راز کے گہرے تہہ خانے میں بند رہتی ہے بلکہ انکم ٹیکس والوں کی باز جیسی نگاہوں سے بھی چھپی رہتی ہے! شرطیہ یقین کرنا پڑے گا صاحبان، قدر دان اور ضرورت مندگان!!

کے ایم کی بس اتنی کہانی ہے! کون آئے گا اور کون چلا گیا ہے یہ کسی اور کو بلکہ سراغ لگانے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا یا ہو سکتا ہے! گویا نہ انکم ٹیکس کا چکر اور آمدنی کے ذریعے کے بارے میں پوچھ تاچھ—! دعویٰ شرطیہ اور قابلِ یقین ہے! کارروائی کے مرحلے بھی اتنے آسان ہیں کہ ایک اَن پڑھ بھی 'کے ایم' کے سامنے نڈر ہو کر اپنی راز کی باتیں بھی خوف و خطر خدشات کے بغیر کہہ سکتا ہے— وضاحت کی ضرورت نہیں—! جواز یا وکالت کی مدد درکار نہیں— جی ہاں! آزما کر خود ہی دعویٰ کو حقیقت کے رنگوں میں پا لیجیے! صاحبان! قدردان! ضرورت مندگان!!

کارروائی کا آغاز نصیحت کا طلب گار اپنی زندگی کا خاکہ لکھ کر، بول کر یا کسی سے لکھوا کر کے 'کے ایم' حوالے کر سکتا ہے۔ جس پر فوری کارروائی ہوتی ہے—!

پھر 'کے ایم' جائزہ لے کر اگر کہہ دے یا لکھ دے 'کے ایم قبول کرتا ہے' تو کارروائی جاری رہے گی! بصورتِ دیگر جمع کی ہوئی رقم کا پچاس فیصدی حِصّہ لوٹا دیا جاتا ہے اور حلف نامے کے تحت کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی ہے— ہاں للکارنے والے خود ہی اپنے گلے کا ناپ قانون کے رکھوالوں کو دیں گے— جی ہاں!!

کارروائی کے دوران اگر کوئی 'بے ہودہ سوال' پوچھا گیا اور 'کے ایم' نے اپنے غصّے کا تاثر دیا تو جن سوالات کے جوابات درج ہو چکے ہوں وہ بھی طلب گار کو دینے سے پہلے مٹا کر، اس کو فوری طور پر دفع ہو جانے کا حکم سنا کر، جمع کی ہوئی رقم کے بارے میں سوچنے کے لیے بھی منع کیا جاتا ہے— نرم یا گرم لہجے میں— کندھے پر ہاتھ رکھ کر، افسوس کے احساسات کے ساتھ یا دھکے مار کر دہشت کے معنی خیز خیالات کے ساتھ—! اور اگر 'کے ایم' نے تاثر دیا کہ 'کے ایم خوش ہوا' تو نصیحت کا طلبگار مقررہ سوالات کی تعداد کے علاوہ، بغیر مزید رقم جمع کیے ایک اور سوال پوچھ سکتا ہے! مگر کسی خوش بخت کے سوالات سن کر اگر 'کے ایم بہت خوش ہوا' کمرے میں گونج اٹھے تو بحث بھی ہو سکتی ہے یا کمپیوٹر کی زبان میں لمبی چیٹ "CHAT" یا گفتگو بھی ہو سکتی ہے! وقت کی ٹوک کے بغیر—! کسی بھی پابندی کی روک کے بغیر!!

نندو جو نندن چندن سے نندکمار بن گیا ہے، وہ پہلا خوش بخت ہے جس نے بے ہودہ زون سے نکل کر اور قبول ہونے کے بعد، نہایت صاف گوئی سے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بول کر 'کے ایم' سے بار بار یہ سن لیا ہے 'کے ایم بہت بہت خوش ہوا'! ایسا کیوں؟

کیونکہ ذہین ہونے کی وجہ سے اُس نے بے ہودہ سوالات کو اپنے دماغ میں کبھی جگہ دی ہی

نہیں تھی تو اب کیوں اپنے ذہن میں وہ ایسے بیج بوڈالتا جن کو اس نے کیڑوں مکوڑوں کے سپرد کردیا تھا! مثلاً کسی کو آزمانے کے لیے کے ایم سے پوچھا جائے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان؟ میری عمر کیا ہے، بتایئے؟

اندھا من کی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے؟ یا اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر یہ کہ میں امتحان میں پاس ہوجاؤں گا یا فیل؟

کیا آپ آئی.اے.ایس کے سوالات کا پرچہ مجھے بتا سکتے ہیں؟
کیا ملک کے غریب ایک ہوکر کیا اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں؟
کیا میں چاند پر رہ سکتا ہوں یا ستاروں کا بے تاج بادشاہ بن سکتا ہوں؟
کیا آپ نے بھی غیر ملکی بینکوں میں کھاتے کھولے ہیں؟
کم از کم کوئی راستہ بتا دیجیے کہ کیسے؟

مثالی کردار نند کمار نے اپنے بارے میں جو کہا تھا 'کے ایم' میں درج ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے!

میں نند سے نندن چند اور اب نند کمار ہوں! زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکا ہوں! مجھ میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی ہیں! اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ہیں! مجھے یہ خوبرو چہرہ اور چہرے پر امٹ معصومیت کے تاثرات، مجھ میں میری ماں کی شناخت کرار ہے ہیں! میری ماں کی خوبصورت آنکھوں میں بینائی نہیں ہے! مگر خوبصورت ہیں!

میری یادداشت بے مثال ہے اور اپنی ماں کی طرح، میں جو بھی ایک بار سن لیتا ہوں وہ مستقل طور پر یادداشت کا حصہ بن جاتا! گویا ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہوئی آواز ہو— کون سا حصہ سنانا پڑے، بٹن دبا کر، بول پڑتا ہوں—!

جی ہاں! ماں نے مندروں میں جا کر رامائن سن کر یاد نشین کر لی تھی اور میں نے ماں سے ان کی سنائی گئی اساطیری کتھائیں، حکایتیں اور داستانیں ایک بار سُن کر، اپنی یادداشت کے خزانے بھر دیئے ہیں—!

جہاں بھی جاتا ہوں سامعین کو متاثر کرتا ہوں—!

جی ہاں! اپنی ماں کی طرح، میں بھی، گرم بات کو نرم لہجے میں بول کر، لال رنگ کے تپ رہے لوہے کو برف میں ڈال کر کالا بنا دیتا ہوں! اور ٹھنڈا کر دیتا ہوں! ضرورت پڑے تو ٹھنڈے لوہے سے گرم لوہے کو کاٹ سکتا ہوں یا اپنی مرضی کے مطابق شکل دے سکتا ہوں!

جی ہاں! میرا یہ خوبصورت جسم، میرے باپ کی وجاہت کا نمونہ ہے! ان کی طرح میں بھی احمق نظر آتا ہوں مگر ہوں ذہین — بہت ذہین!

ہاں مگر باپ کی صحبت میں رہ کر، منفی سوچ کو اپنی ذہانت کی زرخیز زمین میں اُگاتے نند کمار بن گیا ہوں ورنہ نندو ہی ہوتا!

لیکن پھر بھی میں شاد بھی اور ناشاد بھی ہوں!

ہم لوگ ایک پہاڑی علاقے میں رہتے تھے! راجماش اور مرچیوں کی کاشت کیا کرتے تھے! اور بہت خوش رہا کرتے تھے —! میرا باپ، میرے نانا کا نوکر تھا! ان کی اِکلوتی اندھی بیٹی سے شادی کی تو اپنے گاؤں کے، ان سبکدوش ہوکر، گاؤں لوٹ کر آئے فوجیوں کو دیکھ کر، حسد کی آگ میں جل جانے کی عادت اپنا کر، اپنے خوبصورت جسم سے، فوج میں بھرتی کرنے آئے افسروں کو، متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا! تو غرور کو ہم سفر بنا گیا! تب جب میں پانچ سال کا تھا! ایک سال بعد فوج میں نوکری کرنے کے بعد گاؤں لوٹ کر آ گیا! سبکدوش ہوکر یا لڑائی کے دوران اپنی ٹانگ کٹوا کر آیا ہوتا تو پنشن پر آیا ہوتا —! مگر ایسا نہیں ہوا تھا! تب وہ خواب جس کو دیکھ کر وہ فوج میں بھرتی ہوگیا تھا یعنی وہ بھی ملٹری کی قمیض یا بنیان پہن کر، روز داڑھی بنا کر، مونچھوں کو تاؤ دے کر، اپنی قمیض کے کاج میں لال دھاگہ ڈال کر، دھاگے کے ساتھ چاقو باندھ کر، چاقو کا ایک جنگی توپ کی طرح مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے ملٹری مگ (Mug) میں کینٹین سے رعایتی داموں میں خریدی گئی رَم (Rum) پیتے ہوئے، دوسرے فوجیوں کو یوں دیکھتا رہتا تھا جیسے ہاتھی پر سوار ہوکر ایک راجا پیدل چل رہے سپاہیوں کو دیکھ رہا ہو! وہ خواب پورا ہوا نہیں تھا — جس کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار تھا کیونکہ اُس نے اپنے افسر کا پستول چرا لیا تھا! بیچ ڈالنے کی خاطر! بھاگتے بھاگتے افسر نے ٹانگ پر گولی چلا کر اسپتال بھیج دیا تھا! ٹانگ کاٹنی پڑی تھی اور کورٹ مارشل کے بعد گھر بھیجا گیا تھا —! وہ گاؤں میں جہاں وہ اکثر اپنے یونانی دیوتاؤں کے مانند جسم کی، غرور کی انتہا چھُو کر، نمائش کیا کرتا تھا وہاں بیساکھی کے سہارے چل کر اپنے ہی اندر چل رہی انتقام کی آگ سے حسد کے خیالات اُبل اُبل کر، بدکاری کے ارادوں میں بدل گئے تھے! شراب اور شباب سے اپنے شکستہ دل کو بہلانا اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا! شراب وہ شہر سے خرید کر لایا کرتا تھا جبکہ میری ماں کا شباب اُس کو سکون پہنچا دیا کرتا تھا —!

شراب کے نشے میں دل کی باتیں زبان پر آجایا کرتی تھیں اور نغموں میں صرف یہ ظاہر ہوا کرتا تھا کہ ایک خوبصورت جسم والے کے کندھوں پر ہی افسروں کے کندھوں پر سجتے ہیں اور جس

کرنل کا وہ اردلی تھا وہ اس کی نظر میں ایک وردی میں ایک کاٹھ کا پتلا تھا—!

نانا، نانی کی موت کے بعد، اُس نے شہر کے تاجروں کو، زمین پر کاشتکاری کا حق فروخت کرڈالا تھا! اور رقوم کو شراب بنا کر پیتا رہتا تھا! پھر جب زمین تاجروں نے ہڑپ لی تب وہ خود شراب بنا کر پیتا رہتا تھا—یا پھر اپنے جسم کو دیکھ کر اپنے آپ کو فوجی افسر سمجھ کر ہنستا رہتا تھا!

جنگلات کا ایک افسر خراب موسم کی وجہ سے گاؤں کے واحد پکّے مکان میں چند روز رہ کر، مہمان نوازی، خاص طور پر لذیذ کھانے کھا کر، اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ میرے باپ کو اپنے سرکاری ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار اور باورچی بنا دیا تھا—افسر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کھانا میری ماں بنایا کرتی تھی! گھر میں بھی اور ریسٹ ہاؤس میں بھی—باپ کو یہ غلط فہمی تھی کہ افسر اس کی چال ڈھال پر نثار تھا!

ریسٹ ہاؤس میں کبھی کبھار افسران آیا کرتے تھے اس لیے چھوٹے شہر میں جب میرے باپ نے ریسٹ ہاؤس میں چوری چھپے مے کشی کرنے والوں کو دیسی شراب کے ساتھ کھانے کی سہولیات بھی میسر کر دی تھیں تب وہ سلسلے کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوا تھا—چونکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر پی لیا کرتا تھا اس لیے خوش تھا!

ناجائز طریقوں سے بنائی گئی مقامی شراب سائیکل کے ٹیوبوں میں ڈال کر میں لایا کرتا تھا—اور گاہکوں کو پلایا کرتا تھا! ماں کو معلوم نہیں تھا جبکہ میں باپ کا فرماں بردار بیٹا تھا! باپ کو خوش کرنے کی خاطر اُس کی بدکاری میں شریکِ کار تھا بند بوتلوں میں دیسی شراب ملایا کرتا تھا—شہر سے دُور دیسی بھٹیوں سے شراب بھی لایا کرتا تھا! ایک بار پکڑا گیا مگر چہرے کی معصومیت اور ماں سے سن کر رٹے ہوئے منتر بول کر بری ہو گیا تھا! مگر اس کے بعد حوصلے بلندیوں کو چھو لینے لگے تھے!

گاہکوں کی گفتگو، جو انگریزی میں ہوا کرتی تھی اور پھر مادری زبان میں ترجمہ کر کے مجھے یا میرے باپ کو سنائی جایا کرتی تھی! سن کر اور لفظ بہ لفظ یاد رکھ کر، جب میں گاہکوں کے علاوہ اسکول میں بھی روانی اور صحیح تلفظ کے ساتھ بولا کرتا تھا تو سننے والے دھنگ ہو جایا کرتے تھے! مگر چونکہ میں امتحانات میں کورا کاغذ استادوں کو دے دیا کرتا تھا تب وہ چونک کر حیران ہوا کرتے تھے!

بار بار آس پاس کھڑے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جانے کی وجہ سے، میں نے اسکول جانا بند کر دیا تھا—وہ لوگ مجھے کوئی روحانی قوت والا لڑکا سمجھ کر میرے پاؤں چھو کر مجھے بھاگ جانے کے لیے مجبور کیا کرتے تھے!

میرا باپ خوش تھا جبکہ ماں کو کوئی بیماری لگ گئی تھی—دس سال کے لڑکے کے لیے، حمل کا ٹھہرنا

اور حمل کا گرنا یا گرانا، اس کی سوچ اور سمجھ کے دائرے میں تو نہیں آ سکتا تھا نا؟ ہاں اپنی ماں کے کرب کو محسوس کیا کرتا تھا! جب میں اُس کو کُرید کُرید کر یہ پوچھا کرتا تھا! ماں تم کہہ رہی تھی کہ بہت جلد میرا بھائی یا بہن آنے والا یا آنے والی ہے! کیوں کوئی نہیں آیا؟ وہ اپنے لب سی لیا کرتی تھی — جبکہ باپ ہنس پڑتا تھا — بلکہ فاتحانہ قہقہے لگانا اس کی عادت بن گئی تھی —!

میں سولہ سال کا تھا جب میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی تھی جس کی پولیس کو تلاش تھی!

میں نے اس کو موت کے منہ سے نکال کر اُس کے زخموں پر مرہم لگایا تھا! بدلے میں وہ میری تقدیر کو اپنی تدابیر سے بدل گیا! سوچ اُس کی ہوا کرتی اور عمل میری ہوا کرتی تھی! قدم سے قدم ملانے کی بجائے سوچ کو عمل پر حاوی ہونا ہماری دن دوگنی رات چوگنی ترقی کا انقلابی طریقہ بن گیا! اور میں کیا سے کیا بن گیا! ایک بار سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا تو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے رامائن کی کتھا کے لیے گاؤں والوں نے بلایا ہے! اور پھر پوچھ تاچھ کے دوران میں نے رامائن اُسی لَے، لہجے اور اعتقاد سے سنادی تھی جیسے مجھے ماں سنایا کرتی تھی، تو بی ایس ایف (B.S.F) کے افسر اعلیٰ مجھے خود اپنی سرکاری کار میں ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ کر آیا تھا — وہ واقعہ یادگار بن کر گویا میرے باپ کے کندھوں پر کئی ستارے بن کر اس کی بدکاری کی تاریکیوں کو اُجالوں میں بدل کر بے خوف اور نڈر بنا گئی تھی اور میرے بھی حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے — اپنے عزم کی بلندیوں پر چڑھ کر کبھی چرس، کبھی سونے کے بسکٹ اور کبھی پستول و جدید ترین دھماکہ خیز پاؤڈر آر ڈی ایکس سرحد کے آر پار لے کر، میں نے اتنی دولت کمائی کہ اپنی دلیری اور عقلمندی کا ثبوت دے کر، بڑے بڑے شہروں میں رہائشی فلیٹ خرید لیے ہیں اُن کا ہر ماہ لاکھوں روپے کرایہ وصول کرتا رہتا ہوں — خوب عیش کرتا رہتا ہوں اور زن، زمین یا جائیداد جس پر دل آ جائے پالیتا ہوں!

اپنے ماں باپ کو گاؤں بھیجا ہے! زمین تاجروں کو دوگنی قیمت دے کر، اپنی ماں کے نام کردی ہے! کاشتکاری کے لیے بہت ہی اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھ دیے ہیں اور رقم ماں کو دیتا ہوں مگر وہ اپنے پتی کے حکم کی غلام ہے! وہ خوش تو میرے ناخوش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — میرا باپ اب اپنے جسم کی بجائے دولت مند ہونے کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے!

میرا باپ پہلے شراب پی کر یا تو سو جایا کرتا تھا یا پھر اپنے آپ پر خود کے سوچے اور ترتیب دیئے قصیدے بآواز بلند، آسمان سے مخاطب ہو کر، بولتا رہتا تھا اور اب چونکہ میری خریدی ہوئی اعلیٰ معیار کی وہسکی پیتا رہتا ہے اس لیے ہر جسکی کے ساتھ گویا وہ بھڑک بھڑک کر دہک رہے انگاروں

پر اُبھری ہوئی راکھ کو ہٹا کر انگاروں سے مخاطب ہو کر، تپش کو محسوس کرتے ہوئے، اپنی شوخیوں کے بارے میں ذکر کرنے کی بجائے اُن گاؤں کو لوٹ کر آئے، سبکدوش فوجیوں کو غموں کے بحر میں پھینک کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کے بارے میں سوچ سوچ کر تڑپتا رہتا ہے ـــ جبکہ میری ماں میرے نذر کیے گئے رقوم سے گاؤں والوں کی مدد کرتے ہوئے اپنے والدین کی روایات قائم اور دائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے! گاؤں والوں کے چہروں پر اپنے من کی آنکھوں سے اُبھرتا ہوا نُور دیکھ کر بھگوان کو دیکھنے کا دعویٰ کر رہی ہے! جبکہ میں دولت کے ایک ایسے پہاڑ کا مالک ہوں جو نمک کے پہاڑ کی طرح کاٹ کاٹ کر اپنا وجود کھو نہیں پاتا ہے! نہ موسم کے اثر سے اور نہ زلزلوں کے تاثر سے!

'کے ایم نے پہلی بار کسی کی باتیں صبر و تحمل سے سن کر کہا'' کے ایم متاثر ہوا' یعنی اب نصیحت کے ساتھ مشورہ بھی مل جانے کا یقین دلایا تھا!

یہ جان کر نند کمار نے درد بھری آواز میں فریاد کی!

کمپیوٹر مہارج! میرے پاس دولت تو ہے مگر شہرت نہیں ہے! عزت نہیں ہے! کیونکہ میرے پاس میری شناخت نہیں ہے! یوں لگ رہا ہے گویا ایک تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہونے کے سبب الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے! کوئی قریب آنے سے اس لیے گریز کر رہے ہیں کہ کہیں ان پر نہ گر پڑوں اس لیے اب لگتا ہے کہ میرا وجود ہی نہیں ہے ـــ!

میرے پاس سب کچھ ہے! رہنے کے لیے ایک شاندار بنگلہ ـــ بنگلے میں آرام سے دن اور راتیں گزارنے کے لیے ایسی سہولیات جو ہر موسم کی شدت کو کم کر دیتی ہیں! یعنی جھلسا دینے والی گرمی کو ٹھنڈی ہوا دبوچ لیتی ہے اور باہر اگر سرد ہوائیں ٹھٹھر رہے جسموں پر قاتلانہ حملے کرتی ہوں، میرے بنگلے کے ہر کمرے میں سہانی آنچ ہوتی ہے ـــ

گھر میں نوکر چاکر ہیں اور میں حکم دے کر ایک مہاراجہ کی طرح زندگی گزار رہا ہوں! میرے پاس ایک بدیشی کار ہے اور جب مجھے اپنے فیشن ڈیزائنر (Fashion Designer) کے بنائے ہوئے ملبوسات میں کار میں بیٹھتے یا کار سے نکلتے، دیکھنے والی ہر نظر مجھ پر جم جاتی ہے مگر کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا ہے! میں پہل کروں! تب بھی نہیں ـــ!

شہر کی سب سے اچھی کالونی میں ایک شاندار بنگلے میں رہتا ہوں! کالونی میں جہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں وہاں وہ مجھے اپنے قریب آنے نہیں دیتے ہیں اور اگر میں کسی سے دوستی

کرنے کی کوشش کرتا ہوں تب وہ میرے قیمتی تحائف کو ٹھکرا کر غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے میرے، ان کے گھر سے نکلتے ہی، دروازے کے بند کرنے کے انداز سے، نفرت کا احساس دلاتے ہیں! فقط مجھے اور کسی اور کو نہیں! ایک بھکاری کو بھی نہیں! کیونکہ میں کوئی بھی زبان بول سکتا ہوں مگر پڑھ نہیں سکتا اس لیے صبح سویرے اخبار والا میرے پھاٹک کے سامنے رُکے بغیر اگلی کوٹھی کے سامنے رُک جاتا ہے! میں کلب میں جاتا ہوں تو میرے کپڑوں پر چھڑکی گئی بدیشی عطر میری آمد کا احساس دلاتی تو ہے، مگر کلب کے ممبران میرے ساتھ بیٹھ کر، اسکاچ وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے، آمنے سامنے بیٹھ کر، نہ تاش یا شطرنج کا کھیل کھیلنے کی رضامندی دیتے ہیں اور نہ کسی بھی سیاسی، سماجی یا ثقافتی موضوع پر بحث کرتے ہیں — گویا میں ایک بے رنگ لفافے کی طرح اپنے گھر لوٹ کر آتا ہوں — روز اپنے عالیشان بنگلے کے گیٹ پر لگی اپنی خوبصورت نیم پلیٹ پر اپنا نام اور اپنا پتہ پڑھ لیتا ہوں — اس کے ساتھ لگے اپنے لیٹر بکس میں جھانک کر دیکھتا رہتا ہوں مگر بجلی، فون، پانی اور کالونی کے دیکھ بھال کے بلوں کے علاوہ کبھی کچھ نہیں دیکھ پاتا ہوں —!

کبھی کبھار خود رقوم جمع کرنے جاتا ہوں یہ سوچ کر کہ کوئی ہمدم کوئی دوست مل پائے مگر بے رُخی کا شکار ہو جاتا ہوں — بار بار! میں اپنے آپ کو ایک آسیب سمجھتا ہوں جو چہروں کے جنگل میں ہر شناسا یا غیر شناسا چہرہ دیکھ تو سکتا ہے مگر اس کو کوئی دیکھ نہیں پاتا ہے — اگر کوئی دیکھ پاتا تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے — گویا میرے چہرے کی معصومیت کی بجائے ان کو ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا ہو! ہاں شہر کے باہر کبھی کسی تیرتھ استھان پر جب کسی کے سنائے گئے سنسکرت شلوکوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ نہ بولنے کے لیے ٹوکتا ہوں تو سامعین مجھے اپنانے کی بجائے میرے بارے میں سوچتے رہتے ہیں — قیاس ارائیاں کرتے رہتے ہیں — پھر جانے کیا ہوتا ہے کہ میں ایک میلے میں بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں —

کمپیوٹر مہاراج میں زندہ تو ہوں مگر اپنی زندگی سے بیزار ہوں! نہ میرا کوئی ہم سفر ہے، نہ میں کسی کاروان میں شامل ہوں — نہ منزل کا تصور ہے! نہ پڑاو کی شناخت ہے — نہ دن میں کوئی راستہ نظر آرہا ہے اور نہ رات کو جرس کی آواز سنائی دے رہی ہے — کیا میں تنہا ہوں؟ یوں کیسے کٹ سکے گا زندگی کا سفر؟ یہ پوچھنے آیا ہوں؟ کمپیوٹر مہاراج؟

کمپیوٹر مہاراج نے بے حد متاثر ہونے کا اشارہ دیا تو نند کمار کو نصیحت کے علاوہ رائے دینے کا بھروسہ دلا کر نہایت صوفیانہ انداز میں آواز سنائی دی! آواز کے ایم (K.M) کی تھی — گویا آواز

آسمان سے آرہی تھی!

نند کمار! جو انسان اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں خود جانتا ہے وہ خود دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرسکتا ہے—
فیصلہ کسی وکیل کے بغیر، جواز یا وضاحت کے بغیر ہوگا اور ملزم ہی جج بن کر یہ ثابت کردے گا کہ جرم کے دھبے کیسے دھو لیے جاسکتے ہیں!
غور سے میری باتیں سنتے رہو!
تمھارا باپ ہاتھی پر سوار ہوکر، انتقامی ارادوں سے، شناسا لوگوں کو بلاوجہ چیونٹیوں کی طرح مسلنے کے آگے بڑھتا رہتا ہے! گویا ہر لمحہ لمحوں کے کارواں میں شامل ہوکر، وقت کی طرح چلتا رہتا ہے!
وقت کبھی رُکتا نہیں ہے! اپنی طے شدہ رفتار پر چلتا رہتا ہے— کبھی پلٹ کر دیکھتا نہیں ہے، مگر اچھے یا بُرے نشانات چھوڑ جاتا ہے! تمھارے باپ کو چیونٹیاں اس لیے نظر نہیں آرہی ہیں کیونکہ اس کے غرور کی اُونچائی بلند ہے جبکہ تم دولت کے پہاڑ پر کھڑی ہوکر بھی کسی کو نظر نہیں آرہے ہو!
جو نظر نہیں آتا اُس کی شناخت کیسے ہوسکتی ہے؟ دُھند یا دُھول میں چہرہ دیکھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے مگر تمھارے اِردگرد گندک کے دھویں سے آنکھیں جلن کی وجہ سے بند ہوجاتی ہیں! اور یہ تم خود بھی جانتے ہو! جانتے ہو نا؟

سانسوں کو بارود کی بدبو دبوچ لیتی ہے— خوف سوچ اور سمجھ پر دستک دیتا رہتا ہے! چاہت کے جذبے کو نفرت کی مضبوط گرفت دبوچ لیتی ہے— پھر حالات دوریاں ہی پیدا کرسکتی ہیں! نفرت کے جنون سے! محبت اگر اُلفت کا نام ہے تو نفرت ذلّت کا نام ہے— ہے نا؟
محبت کی خوشبو کو قید نہیں کیا جاسکتا اور نفرت کی بدبو کو چھپایا نہیں جاسکتا! سمجھ گئے نا کہ تمھاری شناخت پر گرہن لگانے والی تمھاری بدبودار دولت ہے! یہ ایک خامی ہے جو تمھیں، باپ کے خون اور پرورش سے ملی ہوئی ہے! ملی ہے نا؟

ماں زندگی کی علامت ہے— کپڑوں کو اُجلا بنانے والی نیل اُگا دینے والی زرخیز زمین ایک فصل کے بعد چار سال تک بنجر بن کر رہ جاتی ہے! قصور زمین کا نہیں ہے— کاشتکار ہے—! ہے نا؟ وہ چاہے تو نیل کی کاشت کرنا بند کرکے زرخیز زمین میں اناج یا پھول اُگا سکتا ہے، ورنہ اپنے مطلب اور مقصد کو جاری رکھ سکتا ہے! یہ سچ ہے نا؟

ماں نے تمھیں ایک معصوم چہرہ، ایک حساس دل اور شاطر دماغ میں ایک خوبی ڈال دی

ہے، وہ ہے تمھاری یادداشت کی انمول خوبی — ! ہے نا؟ تم اپنے اِردگرد لوگوں کو نیکی کی حکایت سنادو یا گمراکن بدی کی داستانیں، یقیناً سامعین پر اثر انداز ہوں گی! ہوں گی نا؟

اچھا یا بُرا تاثر چھوڑ کر سوچ کر اپنے آپ کو سمجھا دو — !

میرا یہ مشورہ ہے کہ تم اپنی شناخت درج کرانے کی کوشش میں اپنے معصوم چہرہ اور یادداشت کو اپنی رختِ سفر بنادو! فائدہ ہوگا یا نقصان یہ اپنی سمجھ سے پوچھ لو!

لیکن نئے سفر میں نئے راستے کا انتخاب تب کرلو جب سوچ تمھارا ساتھ دے!

اور ایک نئی منزل کے خدوخال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کردو — ! میں...... مشورے دے سکتا ہوں!

میرا پہلا مشورہ سُن لو — تم کسی دوسرے بڑے شہر میں اجنبی لوگوں کے دل ودماغ میں اپنی شناخت درج کرانے کی کوشش کرو — شاید کامیاب ہو جاؤ — اور اس کے لیے میری رائے میں تم اپنے نام کے ساتھ کوئی انقلابی یا جنونی تخلص جوڑ کر، یا وہی نام مستقل طور پر اپنا کر شاعر بن جاؤ — اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر — ! تخلص اپناتے وقت یہ مت سوچو کہ 'دانش' تخلص اپنا کر کیا تم نے آج تک کوئی دانش مندی کا کام کیا ہے یا نہیں! چوہا بھی اپنی مونچھیں دیکھ کر اپنے آپ کو شیر کا نام دے تو بلّی کو اس پر اعتراض کیوں ہوگا! 'ڈنکہ' تخلص اپنا کر یہ کسی کو سوچنے کا موقع ہی مت دو کہ وہ تم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا تم نے اپنی کسی تخلیق سے کسی بھی سیاسی، سماجی، ثقافتی یا اقتصادی موضوع پر ڈنکے کی چوٹ پر معاشرے کو چونکا دیا ہے! ہاں مگر احتیاطاً بلّی کو دیکھ کر چوہے کی طرح بھاگ جاؤ! چونکہ اب بدل چکے حالات میں شاعر کی پہچان پھٹے پرانے کپڑوں سے نہیں ہوتی ہے بلکہ چار مینار سگریٹ سے مستی میں رہنے کی خاطر شراب پینے یا نشیلی دوائیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے! بلکہ شاعر اپنے آپ سے بے خبر ہونے کی خاطر لمبے بال، لمبے ناخن، میلے دانتوں کی نمائش کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے! یہ جان کر مان لو! مشاعروں میں چھا جانے کی خاطر نامور شعرا کا کلام رٹ کر ویسے ہی سناتے رہو جیسے ایک چالاک طالب علم نے 'چاند پر میرا تصوراتی سفر' پر ایک مضمون لکھتے وقت چاند پر کھیلے جانے والے فٹ بال میچ کے بارے میں لکھ ڈالا — وہ اس لیے کہ اُس نے یہی مضمون رٹ لیا تھا — فقط امتحان میں پاس ہونے کی خاطر — یا پھر اجنبی شعرا کے مشاعروں میں شرکت کی خاطر اپنے آپ کو اُردو شاعری کا متوالا ظاہر کردو --- چاہو تو اپنی دولت کے پہاڑ سے کچھ پتھر نکال کر ماضی کے نشانات کو وہاں سے ہی مٹا کر — ایک ایسا آشیانہ بنا کر — اُس

میں چند کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے معقول شعرا کو پناہ دے کر— ان کی مدہوشی میں کہے کلام کو اپنے یادداشت کے خزانے میں ڈال کر— ان کے کلام کو اپنا کلام بتا کر— اپنی شناخت بنا ڈالو— فائدہ ملے گا! شرطیہ! اور نئی روشنی میں نند کمار نظر ہی نہیں آئے گا! بلکہ ایک شاعر ہی نظر آئے گا— یعنی ایک نئی شناخت نظر آئے گی! ارے کوئی تم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نندو سے نند کمار کیسے بن گئے؟ یہ سوچ کر کہ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام کیا تھا وہ ان کے بیشتر مداح بھی نہیں جانتے تھے! پھر اپنے خرچ پر اپنے البم بنا کر خود ہی خرید کر کالا دھن سفید دھن بن جائے گا!

میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کسی گاؤں میں ایک جوگی بن کر رامائن کی کتھا سنانا شروع کرو— پھر—؟ یہ قصہ غور سے سن لو! فائدہ ہوگا! شرطیہ! ایک کتھا واچک (قاری) نے اپنے آشرم کے باہر ایک چھوٹا مٹکا رکھا! مٹکے کے اوپر سفید کپڑا رکھ دیا اور اپنے بھگتوں سے کہا کہ وہ علی الصبح مٹکے میں، اپنی مالی حیثیت کے مطابق دودھ ڈالیں— تا کہ کس نے کم اور کس نے زیادہ ڈالا یہ کوئی نہ جان پائے کہ کون امیر ہے اور کون غریب! کون بڑے دل والا ہے اور کون کنجوس! دوپہر کو جب اُس نے کتھا سنانے کے بعد اور بھگتوں کے جانے کے بعد، مٹکے پر کپڑا ہٹا کر دیکھا تو مٹکے میں پانی تھا— دودھ نہیں! وہ اس لیے کہ سبھی یہ سمجھ بیٹھے کہ مٹکے میں دودھ ڈالنے والے بے وقوف بھگتوں کی کمی اس ملک میں ہو ہی نہیں سکتی— اس پر ہنسا جائے یا رویا جائے یہ وہ موضوع ہے جس پر سوچ وچار کرنا نادانی ہے!

ایک شاطر نام نہاد باباجی نے یہ دیکھ کر— اپنے ٹیپ ریکارڈر پر مشہور گلوکاروں کے بھجن سنا کر، مٹکے میں پہلے ہی دودھ ڈال کر اُس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا! لہٰذا پانی ڈالنے والے بھرا مٹکہ دیکھ کر خالی لوٹے لے کر آتے جاتے رہے! پھر بابا نے مٹکے کی بجائے دان پاتر (خیرات کی رقوم کے لیے رکھے بڑے بڑے صندوق) رکھ دیے تا کہ دودھ خریدنے کے لیے نقدی حاصل کی جائے— ایسا بھگتوں سے کہا گیا— جبکہ بابا صندوقوں میں پہلے ہی اپنے کالے دھن کے موٹے موٹے بنڈل ڈال دیا کرتا تھا! یوں اُس رقوم سے وہ زمین خریدتا رہا اور زمین کی پیداوار بھی اپنے نام کے آشرم کے کھاتوں میں ڈالتا رہا! اُس کا چہرہ بھی تمہارا جیسا تھا— معصوم! وہ کچھ لوگوں کی مدد بھی کرتا تھا! مگر دکھاوٹ کی خاطر جو عام لوگوں کو ایک سخی بابا کی قابلِ دید سجاوٹ بن کر تاثیرِ غریب پروری کے علاوہ تاثیرِ مسیحائی کا خطاب دے کر— اُس کو ایک شناخت دے گئی تھی! ترکیب اچھی ثابت ہوئی اس لیے سلسلہ جاری رہا!

وقت نے کروٹ لی تو بابا عوام کے مسائل حل کرتے کرتے ایک لیڈر بن گیا! اور پھر سیاست دان — ! بقول اس کے عوام نے اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا! اس لیے تم بھی ویسے ہی بابا بن سکتے ہو — بن جاؤ تو شناخت بھی مل جائے گی اور عوام پھولوں کی خوشبو کی بجائے بارود کی بدبو کو عطر کے طور پر قبول کرلیں گے یا پھر عادی ہو جائیں گے! پھر تم ایک سیاست داں بھی بن سکتے ہو! اس آزمودہ ترکیب کو آزمایا جاسکتا ہے! سوچ لو! دماغ سے، دل سے نہیں!

اب تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتے! بلکہ میں تم سے ایک سوال پوچھ لوں گا — جواب تمھیں دینا پڑے گا! وقت کی قید نہیں — اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ کر — اپنے حالات کو شریکِ کار بنا کر یا واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے! یعنی اپنے بارے میں یا دوسروں کے بارے میں سوچ سمجھ کر!

- کیا تم بغیر شناخت کے زندگی کا سفر طے کرنا چاہتے ہو؟ یعنی حل نمبر ایک اپنا کر؟ ہاں یا نا؟؟
- کیا تم ایک جدید دَور کے شاعر بن جانا چاہتے ہو؟ یعنی حل نمبر دو اپنا کر؟ ہاں یا نا؟؟
- کیا تم ایک مہاتما بن جانا چاہتے ہو؟ اتنا ضرور بتادوں گا کہ مہاتماؤں کے بارے میں کوئی بھی ان کے ماضی کے بارے میں کرید نہیں کرسکتا! اور سادھوؤں کے بارے میں اگر کوئی کریدنا چاہے تو بلوا منگل کا سورداس بن جانا یا انگلی حال جیسے دہشت گرد کا ایک بودھ بھکشو بن جانا — ہزاروں سوالوں کے جواب بن جاتے ہیں! بلکہ جانکاری شورش پر حاوی ہونے والے چرچوں کے موضوعات بن سکتے ہیں — میڈیا کے اچھال اور اُبال کا مواد بھی بن سکتے ہیں! اور نہیں تو کیا!!
- اور اگر تم ایک سیاست دان بن جانا چاہتے ہو — ؟ تو سن لو! سیاست داں کو جب عوام قبول کرلیتی ہے تب وہ مہاتما گاندھی کی طرح اپنی خامیوں اور اپنی کی ہوئی غلطیوں کو فخر سے قبول کرلیتے ہیں — یہاں تک کہ جب ان کو اپنے باپ کے موت کی خبر سنائی گئی تھی تب وہ اپنی بیوی کے ننگے جسم سے لپٹ کر رہنے کو ترجیح دے گئے تھے! ٹیلی ویژن پر قتل عام کرنے والا دہشت گرد اگر انسانیت کے بارے میں بول سکتا ہے تو تم اپنے کارِ بد کے واقعات کو کارناموں کی شکل میں کیوں نہیں پیش کر سکتے؟ کمپیوٹر مہاراج نے متاثر ہو کر نصیحت، مشورہ اور رائے کے علاوہ جوابات دینے کے لیے اطلاعات بھی دی ہیں! کامیابی کے لیے اہم نقطے بھی دیے ہیں نا؟ -؟؟

اب تمھارا جواب ہی تمھاری مشکل آسان کردے گا! ناصح اپنا کام کرچکا ہے!

OO

مہمان

اماں جی عرف مالکن جی کے اِرد گرد مہمان ہوں اور وہ ایک اچھی میزبان بن کر سب کی خواہشیں اور فرمائشیں پوری کرتی رہے! بس یہی اُس کی خواہش ہے! جب پوری ہوجاتی ہے تو وہ بے حد خوش رہتی ہے! بصورتِ دیگر اُس پر ایک نرالی کیفیت طاری ہوجاتی ہے! بے قراری کے عالم میں وہ گھر کے ہر کمرے میں جھانک جھانک کر کسی کی تلاش کرتی رہتی ہے، اور جب کوئی نہیں ملتا ہے تب وہ اپنے کمرے کے اندر، ایک کولہو کے بیل کی طرح چکّر لگاتے ہوئے، بار بار دروازے کو دیکھ دیکھ کر، چند اشعار گنگناتی ہے مثلاً 'وفائیں کتنی ہی مستقل ہوں جفا کے خوگر جگا کریں گے!'' جفا کرنے والو! وفا کرنا سیکھو! وفا کرنے والوں سے دُعا کرنا سیکھو!'' یا پھر بڑبڑاتی رہتی ہے!''جفا کرنے والوں پر مجھے غصّہ آنا چاہیے! مجھے اُن پر ترس کیوں آتا رہتا ہے؟ وفا کرنے والے کیا مجھے پہچان لیتے ہیں؟ یا میں ہی ان کی شناخت کرلیتی ہوں؟ کیا ہم ایک دوسرے پر، کرم کرتے ہیں؟ یا ایک دوسرے سے رحم کی اُمید رکھتے ہیں؟ کہیں ہم ستم تو نہیں کرتے رہتے ہیں ایک دوسرے پر؟

اپنی ہی دُھن میں رہنے والی اس بوڑھی عورت کو اپنی سوچ سمجھ، قول اور عمل سے جُڑے اپنے ہر اختیار پر اعتبار ہے! دوسروں کے دیئے گئے اختیارات پر نہیں! اور یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی 'اماں جی' کی بجائے 'مالکن جی' کا اسّی برس کی عمر میں بھی اس کا ہر دن ایک 'نیا دن' نہیں ہوتا ہے! بلکہ 'ایک اور دن' ہوتا ہے! جو گزر چکے دن، پانچ دن پہلے، پانچ ہفتے پہلے، پانچ مہینے پہلے، پانچ برس پہلے یا پچاس برس پہلے گزر چکے دن جیسا ہوتا ہے! یعنی میزبان اور مہمان یا مہمانوں کے درمیان رشتوں کی ایک جیسی کہانی جو حسّاس، مگر ذی ہوش لوگوں کے لیے، سنسنی خیز نہ سہی حیرت انگیز موضوع بن جاتی ہے یا بن سکتی ہے؟ کیونکہ اماں جی عرف مالکن جی اپنے آپ کو 'مالکن جی' سمجھ کر ایک بہت اچھی میزبان بن جانا ہی اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتی رہتی ہے! اس لیے وہ گھر

آئے ہر مہمان کو بھگوان کا رُتبہ دے کر اُس کا استقبال کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے! سحر سے شام تک اور شام سے سحر تک، ہر موسم میں، اپنے دروازے پر بجائی گئی گھنٹی کی آواز بلکہ دستک یا کتّے کے بھونکنے کی آواز سنتے ہی وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح نشانے پر رُک کر، دروازہ کھول دیتی ہے! ملاقاتی کوئی بھی ہو! بچہ بوڑھا یا جوان ہو! نَر ہو یا مادہ ہو! چوکیدار ہو یا دودھ والا ہو! اخبار والا ہو یا کوئی شناسا چہرہ ہو! مالکن جی سب کو معنی خیز نظروں سے ان کے چہروں پر اُبھرے تاثرات کو دیکھ کر پوچھتی رہتی ہے! کس سے ملنے آئے ہو؟ جواباً اگر ملاقاتی کی زبان پر 'مالکن جی' آ گیا تو وہ اگلے لمحے گھر کا مہمانِ خصوصی بن جاتا ہے! بصورتِ دیگر سراسیمگی کے شکار ملاقاتی کو 'مالکن جی' کی باتیں، اساطیری کتھائیں، بھجن یا نغمے تب تک سن لینے پڑتے ہیں جب تک وہ 'مالکن جی' کی ہاں میں ہاں ملا کر یہ نہیں مان لیتا ہے کہ میزبان ہی نے مہمان کو پہچان لیا ہے! اور پھر 'مالکن جی' کی سوچ سے ہم آہنگ ہو کر وہ یہ جان گیا ہے کہ وہ غافل تھا جو اپنے پچھلے جنم کے ہم سفر کو پہچان نہیں پایا تھا؟ چاہے کوئی مصلحت کا سہارا لے کر، مالکن جی کو اپنائیت کا احساس دلا کر ایک بار یہ کہہ کر وہ ان کے لیے وہ گھر آیا بھگوان ہے اور یوں اُن کا مہمانِ خصوصی بن جاتا ہے!

روز ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن آج کا دن مختلف ہے! مالکن جی کے لیے بھی اور مالتی کے لیے بھی! کیونکہ پچھلے پانچ برسوں میں یہ دن نرالا ہے!

مالکن جی مالتی کے شوہر مادھو کی دادی ہے! اور وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ ہی رہتی ہے!

مادھو ایک سرکاری افسرِ اعلیٰ ہے جس کے گھر، تبادلوں کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں! ہر نئے شہر میں، نئے لوگوں کے ساتھ معاشرتی تعلّقات کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کو اور اس کی بیوی کو میل جول بڑھانے کی خاطر کبھی کسی کا مہمان اور کبھی مہمانوں کا میزبان بن جانا پڑتا ہے!

ایک نئے شہر میں، آج، مالتی نے ایک جان پہچان کی اور کچھ اجنبی عورتوں کو اپنے گھر میں مدعو کیا ہے! اور اُس نے اماں جی عُرف مالکن جی کی عاداتِ میزبانی سے اپنے مہمانوں کو دُور رکھنے کی خاطر، پہلی بار اپنے شوہر کی مدد لی ہے! وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکی ہے! کیونکہ اُس کی اماں جی رختِ مالکن اوڑھ کر، دروازے پر نہ کسی مہمان کا استقبال کر چکی ہے اور نہ کسی کو بھگوان کا درجہ دے کر اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوئی ہے، کیونکہ آج وہ اپنی پُراسرار حرکتوں کا سہارا لے کر مالتی کے مہمانوں کی بزم میں بدمستی یا ڈھٹائی انداز میں شامل نہیں ہوئی ہے

مالتی آج بے حد خوش ہے کیونکہ وہ کئی بار اپنے خدشات یعنی اماں جی کے بزم میں آجانے کے امکانات کو رد کر چکی ہے! وہ اس لیے کہ کئی بار، کسی نہ کسی بہانے کی ڈور پکڑ کر، دَبے پاؤں چل کر، نوکروں کو اشاروں میں ہدایات دے کر، جب بھی اماں جی کے کمرے کے باہر کھڑی رہی ہے، تب اماں جی کے گنگنانے یا بڑبڑانے کی آوازیں نہیں سن چکی ہے! بلکہ ہر بار پردے کا کونہ پکڑ کر جب بھی اُس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہے تب اماں جی کو مالکن جی کے رنگ و روپ میں نہیں دیکھا ہے! جبھی تو وہ بلا خوف یا خطر اپنی بزم کی میزبانی کرنے کی خاطر، مطمئن ہو کر لوٹ کر آتی رہی ہے! مگر ہاں ہر بار اماں جی کی غیر متوقع خاموشی کو متاثر کُن کم اور معنی خیز زیادہ سمجھ کر، تذبذب اور تجسّس کے دباؤ اور کھنچاؤ سے قدرے پریشان بھی ہوتی رہی ہے! خاص طور پر اب جب مہمان، سماجی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیالات و احساسات کے بعد موسیقی میں دلچسپی لینے لگے ہیں! مالتی سازوں اور آوازوں کی دلکش گونج سے خوفزدہ ہو چکی ہے! وجہ یہ کہ اماں جی عرف مالکن جی میں بے شمار خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی جو چند خوُبیاں ہیں اُن میں اس کی موسیقی اور رقص میں دلچسپی بھی ہے! وہ بہت ہی سریلا گاتی ہے اور گاتے ہوئے وہ یوں ناچتی رہتی ہے گویا ایک تتلی پُھدک پُھدک کر، پھولوں کو چوُم چوُم کر، جُھوم جُھوم کر، رقص کرتے ہوئے گا رہی ہو! جب اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب ذی ہوش لوگ اکثر اس کی اعلیٰ مہمان نوازی کے باوجود فرار ہونے کے راستے تلاش کرتے رہتے ہیں! مہمانوں کا یہ رویہ میزبان مالکن جی کو قطعاً پسند نہیں ہے! نتیجتاً وہ بھاگ رہے مہمان یا مہمانوں کے پیچھے یوں پڑ جاتی ہے گویا ایک زخمی شیرنی زخم دینے والوں کے پیچھے پڑ جاتی ہے! یا ایک محسن جفا کرنے والوں کو اپنی وفا کا احساس دلانے کی خاطر ایک جنگ لڑ رہی ہو! ایک ایسی جنگ جس میں وہ غیر متوقع ہتھیاروں کا استعمال کرتی رہتی ہے اور تب تک جنگ جاری رکھ دیتی ہے جب تک وہ اپنی فتح کا اعلان نہیں کر پاتی ہے!! ایسی صورتِ حال سے خوفزدہ ہو کر، مالتی اپنی اماں جی کے عمل اور ردِ عمل سے گھبرا کر، ایک بار پھر بزم سے کھسک کر اماں جی کے کمرے میں جانا چاہتی ہے تا کہ موسیقی کی گوُنج سُن کر اپنا ارادہ بدل کر، بزم میں شامل ہونے کی خاطر، فتوحات کی عادی، ایک سپہ سالار کو روکا جائے! یہ سوچ کر کہ وہ بھی مادھو کی طرح احترامانہ سہی، سختی سے اماں جی کو روک سکے، تا کہ اپنے مہمانوں کو انوکھے عذاب سے بچا سکے! لیکن اُس کی بزم میں شامل اس کی واحد جان پہچان والی مہمان، ڈاکٹر سرسوتی، اُس کی کیفیت بھانپ چکی ہے! وہ کئی بار مالکن جی کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی کر چکی ہے اور جواباً ہر بار

مالتی اس کو بتا چکی ہے کہ اُس کی دادی اماں جی اپنے کمرے میں رامائن پڑھ رہی ہے اور وہ اس کی بزم میں شامل ہونا نہیں چاہتی ہے! اور مالتی یوں جھوٹ بول کر، بزم کو مالکن جی کی انہونی یلغار سے بچا تو گئی تھی مگر حالات نے اچانک ایک کروٹ لی ہے!

جب سرسوتی کے گانا گانے کی باری آئی تو اُس نے اپنی واحد ملاقات کے دوران جو نغمہ مالکن جی کے اصرار پر، اُس کی ہی سُریلی آواز میں وہ سن چکی تھی وہی گا کر سامعین کی اِس قدر داد طلب کرلی ہے کہ سبھی مہمان اشتیاق سے اُس کے سُر میں سُر ملا کر گانے لگی ہیں!

تتلی اُڑی، اُڑ کر چلی، پھول نے کہا آ جا میرے پاس
تتلی کہے میں چلی آکاش!

گانے کا جوش وخروش محسوس کرتے ہوئے مالتی کی سوچ وسمجھ پر خدشات کا بوجھ بھاری ہوتا رہا تبھی اُس نے ایک عزم کے ساتھ بزم سے کھسک جانے کی کوشش ہے!

چونکہ ڈاکٹر سرسوتی کی نگاہیں مالتی پر ہی جمی ہیں اس لیے اُس نے اپنی میزبان کی دادی کا ذکر چھیڑ کر جونہی اُس کو بزم میں شامل ہونے کی بات کی ہے، تمام مہمانوں نے مالکن جی کو فوری طور پر، بزم میں شامل ہونے کی مانگ کی ہے! یہ مانگ مالتی کے لیے گویا ایک اعلانِ جنگ ہے!

اس لیے مالتی ٹال مٹول کرتے ہوئے جونہی کمرے سے نکل پڑی ہے، ڈاکٹر سرسوتی اُس کے ساتھ گویا چپک کر، مالکن جی سے ملنے کی ضد پکڑ بیٹھی ہے!

بزم کی پُر جوش آواز مالتی کے لیے وجہِ خوف ہے اس لیے اپنی اماں جی کے بارے میں وہ سرسوتی کو اپنے ٹال مٹول کی وجہ بتانا چاہتی ہے لیکن یہ سمجھ نہیں پارہی ہے کہ وہ اپنی دادی اماں جی یا مالکن جی کو کس نام سے متعارف کرائے تاکہ مہمان اپنے میزبان کو فوراً پہچان سکے، مگر لغت میں تو کیا قاموس میں بھی اس کے کردار سے مطابقت رکھنے والا لفظ مل نہیں سکتا ہے اس لیے مجبوراً اس کو کوشی سے بن چکی مالکن جی کے زندگی کے سفر کی انوکھی کہانی سنانی پڑی ہے!

اماں جی کا اصلی نام کوشلیا ہے اور بچپن میں پیار سے سبھی اس کو کوشی کے نام سے یاد کرتے تھے! ایک دولت مند تازہ وسُوکھے پھلوں کے بہت بڑی تاجر کی بیٹی کوشی پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی! اس لیے وہ ہمیشہ اپنے اِرد گرد لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھی! گھر میں سال بھر چھوٹے بڑے تاجروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، اعلیٰ میزبانی اور مہمان نوازی کے چرچے اس گھر سے جڑے رہتے تھے! جوان کوشلیا اجنبیوں کو بھی اپنائیت کے احساسات دلا کر یہ

سمجھایا کرتی تھی کہ میں یا تو آپ کا پچھلے جنموں میں لیا گیا قرضہ اُتار رہی ہوں یا پھر اگلے جنم میں قرضہ چکانے کے لیے آپ کی خدمت کر رہی ہوں! ہر شب کو گھر میں بھاگوت کی کتھائیں اور دوسرے مذہبوں سے جڑی حکایتیں سنائی جاتی تھیں! یعنی گھر میں ایک سکون بخش ماحول رہا کرتا تھا! دروازے پر دستک دینے والے یگانے اور بیگانے دونوں ہی گھر کے مہمان ہوا کرتے تھے، اعلیٰ مہمان نوازی کے لیے گھر میں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوا کرتی تھی! ضروریاتِ زندگی کی ہر شئے کثرت میں دستیاب ہوا کرتی تھیں! ایک ایسے ماحول میں آٹھ سال کی عمر سے ہی کوشی پہلے پہل، اپنے پڑوس میں رہنے والے بچوں اور اسکول میں اپنی سہیلیوں کی ایک تحائف دینے والی، ایک چمتکاری لڑکی بن گئی تھی! وجہ یہ کہ کوشی سب کو بلا وجہ اور مانگے بغیر، تازہ اور سُوکھے پھل دیا کرتی تھی! دیکھا دیکھی میں بڑوں نے بھی اُس کو ایک کرشماتی لڑکی کا لقب دے کر اس سے تحائف لینے کی عادات پال رکھی تھیں! رفتہ رفتہ اُس کے اِرد گرد رہنے والوں نے اس کو زمین پر اُتری، سورگ لوک سے تعلق رکھنے والی دیوی بنا کر اس کی خوشنودگی حاصل کر کے، اُس سے اپنی من چاہی مانگیں بھی پوری کرنی شروع کی تھی!

پھر وہ وقت بھی آ گیا تھا جب ایک دھارمک ہندوؤں کی کتھا سے متاثر ہو کر اس نے اپنا نام ساوتری رکھا تھا، تب ستوان ساوتری کی کتھا سنا کر، کوشلیا کو ساوتری کا پُنر جنم بتانے والے نے اپنی بیٹی کی شادی کا تمام خرچہ وصول کیا تھا! کوشلیا نے یہ سوچ کر کہ وہ بھی ساوتری کی طرح ملک الموت سے اپنے شوہر کو بچا سکتی ہے اس لیے اُس نے یہی نام اپنا لیا تھا! مگر اِرد گرد مطلبی لوگوں نے ایک تصوراتی دنیا میں رہنے والی جوان لڑکی کے جنون کو کرشمات کا عنوان دیا تھا!

ساوتری کی شادی ایک بہت ہی امیر جنگلات کے ٹھیکیدار کے ساتھ ہوئی تو وہ گھر کی مالکن بن گئی تھی، گویا اس کو کم عمر میں ہی حکمرانی مل گئی تھی! گھر میں بہت سارے مہمانوں کا آنا جانا تھا اور وہ ایک ایسی میزبان بن گئی تھی جو 'مالکن جی' سن کر مہمان کو بھگوان سمجھ کر خدمت کرتی رہتی تھی!!

قصیدے بازوں نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک گھر کو 'مالکن جی کا آشرم' بنا دیا تھا! گویا ایک ایسا چشمہ وجود میں آیا تھا جس کے میٹھے پانی کی لذت حاصل کرنے کے لیے رشتے دار، ناطے دار بلکہ اجنبی بھی اِرد گرد رہا کرتے تھے! اور چونکہ پانی پی لینے کا موقع فقط اُن کو مل جایا کرتا تھا جو آشرم کے دروازے پر 'مالکن جی مالکن جی' کہہ دیا کرتے تھے اور مالکن جی خود ہی مہمان کو آزمائش کے لیے آئے بھگوان مان کر، اس کی آؤ بھگت کیا کرتی تھی! گویا 'کھل جا سم سم'

کہہ کر ہر غرض مند اور خود غرض مہمان ایک ہیرے جواہرات کی غار میں گھس جایا کرتا تھا!

بے غرض لوگ بھی جب دروازے پر دستک دیا کرتے تھے تب اُن کو یہ جانکاری دیکھ کر یا سن کر مل جایا کرتی تھی کہ پتھروں کی مورتیوں کے سامنے منتروں کا جاپ کرنے سے اچھا ہے کہ وہ مالکن جی کے آگے پیچھے رہیں، ان کے لمبے بھاشن سُنیں! گئی رات تک ان کے گائے بھجن سن لیں، پرانی فلموں کے نغمے سن لیں، ان کی کتھائیں سنیں یا پھر مالکن جی کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لیے اپنے قصیدوں کی طاقت سے اپنی خواہشیں اور مرادیں پوری ہونے دیں!

یوں مالکن جی کا گھر مہمانوں کے لیے 'جنت' کے تصور جیسا تھا! مفت کھانا، مفت رہائشی کمروں میں رہنے والوں کو ان کی زبان پر فرمائش آتے ہی پوری ہو جانے کے بعد کبھی کبھی اُن کو یہ غلط فہمی ہو جایا کرتی تھی کہ وہ سچ مچ ہی بھگوان کے رُوپ ہیں! ورنہ ایسے کرشمات کیوں ہوتے رہتے!؟

چند شاطر لوگوں نے مالکن جی عرف میزبان جی کی لمبی اوب جانے والی تقریروں سے بچنے کی خاطر ان کی ہی کہی باتوں کو قصیدہ گری کی چاشنی لگا کر، ان کو سنانا ایک معمول بنا لیا تھا! گویا آشرم میں رہنے کی شرائط کو اپنے رنگوں سے رنگ ڈالا تھا! اُن میں مالکن جی کے دل کی عمیق گہرائیوں کو چھو لینے والے طریقے جو آسان، آزمودہ اور نہایت کامیاب بھی ثابت ہوتے رہتے تھے! یعنی بہت ہی ہونہار طالب علموں کی طرح عمل کرتے ہوئے امتحانات میں پوچھے گئے تمام سوالات کے جوابات دے کر یہ گزارش کرنا کہ کوئی بھی سوال اگر غلط ہو تو صحیح جوابات کو رد کر دیں اور یوں وہ سب کہہ دینا جو مالکن جی اپنے مہمانوں کو اپنے حوالوں سے بتا دینا چاہتی ہے! گویا اس کے لبوں سے مچل رہے جملوں کو چُرا کر بول کر رنگ برنگی ثمر آفرین قصیدے بن جانا مقبول ہو رہے تھے! مثلاً مالکن جی کے سامنے کھڑے ہو کر یہ کہنا — مالکن جی! تو کیا آپ نے مجھے اپنی پہلی نظر میں پہچان لیا! میں کیا اپنے پچھلے جنم میں بھی ایسا تھا —؟ اب آپ کو ہی یہ بتانا پڑے گا کہ میں نے آپ کا پچھلے جنم میں لیا قرضہ چکانے کے لیے یہ جنم لیا ہے؟ یا پھر آپ سے اس جنم میں لیا قرضہ، اپنے اگلے جنم میں اُتارنے جا رہا ہوں؟ اگر ایسا ہو تو میں خوشی خوشی آپ کے کرم کا بوجھ لے کر مر جانا چاہتا ہوں! آپ کی قسم دیوی ماں! آپ دُرگا ہیں یا ماتا ویشنو دیوی! مالکن جی! میں مستقل طور پر آپ کے آشرم میں رہنا چاہتا ہوں! ایک کرشماتی میزبان کا مہمان بن کر! آپ مجھے بھگوان سمجھیں یا ایک انسان، میرے لیے آپ مہمان ہیں!

مالکن جی؟ سنی سنائی بات ہوتی تو میں ہرگز یقین نہیں کرتا؟ مگر آپ کے آس پاس رہ کر خود سن کر اور دیکھ کر یہ جان گیا ہوں کہ آپ چرندوں، پرندوں بلکہ رینگنے والے جانداروں سے ہم کلام ہوتی ہیں! واہ واہ! کیا بات ہے! میں خوش ہوں کہ آپ کے کرشمات خود ہی ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں! آپ دیوی دیوتاؤں کے وجود سے منکر ہونے والوں کا وجود مٹادینے کے لیے جنم لے چکی ہیں! میری ساری زندگی آپ کے قرب میں گزر جائے! بس یہی ایک ارمان ہے مالکن جی!!

مالکن جی! آج کل امیر ترین لوگوں کے گھروں میں راشن کے اسٹور نہیں ہوتے ہیں جبکہ آپ کی حویلی کے ایک حصے میں آٹا، چاول، گھی، تیل یعنی کھانے پینے کی تمام چیزیں یوں لگ رہی ہیں گویا نمک کا ایک پہاڑ! نکالتے جاؤ، نکالتے جاؤ، اور نکال کر دیکھو تو لگ رہا ہے کچھ نکالا ہی نہیں! لگتا ہے یہ کرشمہ بھی آپ کی ہی بدولت عمل میں آجاتا ہے! واہ! واہ!!

مالکن جی! آپ کی منصوبہ بندی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے! مہمانوں کے لیے ہر کمرے میں ٹی وی رکھے گئے ہیں اس لیے جو مرضی وہ دیکھ سکتے ہیں آپ کے مہمان! ورنہ وہ گھروں میں بھی اپنی پسند کے پروگرام دیکھ نہیں پاتے! آج ٹی وی پر ایک طویل عرصے کے بعد میں نے ایک انگریزی فلم دیکھ لی ہے! ورنہ گھر میں کارٹون دیکھنے پڑتے ہیں یا پھر خبریں! واہ! کیا بات ہے مالکن جی!

مالکن جی! وہ کتھا میں بار بار سننا چاہتا ہوں جس میں میزبان راجہ ایک مہمان کو خوش کرنے کے لیے اپنا راج پاٹھ اور اپنا جسم بھی اس کو سونپ دیتا ہے! آپ بھی ویسی ہی میزبان ہیں ورنہ ایک ٹھٹھر رہے مہمان کے جسم پر آپ اپنا پشمینے کا شال کیوں ڈال دیتے؟ واہ واہ!!

مالکن جی! کسی نے کہا کہ آپ کا ایک ہی بیٹا ہے! راجہ دشرتھ کی بیوی کوشلیا کی طرح! کہیں آپ نے رام کو جنم دینے کے لیے ہی یہ جنم تو نہیں لیا ہے؟ مالکن جی! میں آپ کی خاموشی میں آپ کا جواب سن چکا ہوں! آپ کی قربت میں بیٹھ کر یہی تو سیکھ چکا ہوں!

جب تک اماں جی عرف مالکن جی اپنے گھر میں رہتی تھی تب تک ان کے مہمانوں کی گنتی کبھی کم نہیں ہوتی تھی! گھر بھرا بھرا رہا کرتا تھا! ایک بار جو آتا تھا وہ بار بار آیا جایا کرتا تھا! ظاہر ہے کہ ان دنوں وہ بہت خوش رہا کرتی تھی! مطلب پرست پڑوسی، نزدیکی یا دور کے رشتے دار، اکثر ان کی صبح اور شام کی آرتی میں شامل ہو کر، ناشتے اور شام کے کھانے کو یقینی بنایا کرتے تھے! اخبار والے، دودھ والے، دھوبی ڈاکیہ مالکن جی کی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف تھے اس لیے مصلحتوں

کا سہارا لے کر اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے! ورنہ کسی کو کیا مل جاتا اگر وہ مالکن جی کو بتا دیتا کہ کتا اُن کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر بھاگ گیا تھا نہ کہ یہ سن کر کہ اگر وہ بھاگ نہیں جاتا تو مالکن جی پٹائی کر دیں گی! پرندہ آواز سن کر اُڑ جاتا ہے، نہ کہ کوئی پیارا یا ڈراؤنا جملہ سن کر! ایک آوارہ مویشی کو اگر پھاٹک کے باہر کچھ کھانے کو مل جائے تو وہ مالکن جی کی زبان سمجھے بغیر بھی، آنگن میں ہرگز گھس نہیں جاتا!

اماں جی عرف مالکن جی کے شوہر کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے نے آشرم کو رفتہ رفتہ ایک گھر میں بدلنے کی کوشش کی تھی! امریکہ میں مقیم بیٹا ڈالر بھیجتا رہا مگر مہمانوں پر آنے والے ضروری اخراجات کے پھیلاؤ کے بارے میں اماں جی کی بے فکری آشرم کے زوال کا سبب بن گئے تھے! مہمانوں کی تعداد ماضی کی طرح بے قابو تھی مگر جب ان کے پوتے نے گھر میں ہر چیز ناپ تول کر ہی لانے کی پابندی لگا دی تو آشرم کے رنگ خود ہی پھیکے پڑ گئے تھے! پھر آشرم ایک گھر بن گیا تھا! بدل رہے حالات میں مہمان، نہ مالکن کے استقبال کے لیے دروازے پر نظر آتے رہے اور نہ بھگوان بن کر مالکن جی کو مدد کے لیے صدائیں دیتے رہے! گویا مالکن جی کو مہمان نوازی کے مؤثر موقعے نہیں ملتے رہتے! اور اب چونے کے گھر میں رہ کر نہ وہ کتھائیں سنا سکتی ہے اور نہ بھجن یا نغمے گا سکتی ہے اس لیے بے قراری، تذبذب اور تجسّس ذہنی تناؤ کی وجہ بن گئی ہے! تب سے اب تک خاص طور پر تب سے جب سے وہ اپنے پوتے کے ساتھ نئے شہروں میں رہنے لگی ہے! اپنے اِردگرد اجنبیت کا ماحول دیکھ کر وہ اکثر بوکھلاہٹ کی شکار ہوتی رہتی ہے! وجہ یہ کہ نہ تو کوئی اس کو مالکن جی ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور نہ کسی بھی چہرے میں وہ اپنے بھگوان کا عکس دیکھ سکتی ہے! اس پر یہ طرّہ کہ اس کی عجیب حرکتوں کو دیکھ کر اُس پر ہنسنے والوں یا سنجیدگی سے گھورنے والوں کو وہ اپنی کالی زبان دکھا کر ڈراتی رہتی ہے! وہ اس لیے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی کو بھی شراپ دے سکتی ہے! بلکہ غصّے میں آ کر کسی کو اپنی نگاہوں کی غیبی قوت سے پتھر بنا سکتی ہے! یا ایک پرندہ!!

اماں جی عرف مالکن جی کی ایسی حرکتوں سے خوفزدہ ہو کر، ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی بیوی، مالتی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے کہ اماں جی کا نہ کسی سے تعارف کرایا جائے اور نہ گھر آئے کسی بھی خاص یا عام شخص سے اس کو ملنے دیا جائے! مگر پھر بھی اماں جی ایک پانی کی لکیر کی طرح کہاں سے، اور کب کمرے میں داخل ہو جاتی ہے یہ مالتی اکثر جان نہیں پاتی ہے! اور کبھی کبھی وہ ڈراؤنی صورتِ حال کی شکار بھی ہو جاتی ہے! مثلاً ایک بار اس کے ڈرائنگ روم میں ایک معزز مہمان سو رہا

تھا! اماں جی اپنی پوجا کے بعد پرشاد گھر والوں کو دے کر بے حد خوش ہو رہی تھی! اور سو رہے مہمان کے ہونٹوں پر پرشاد رکھ کر چلی گئی تھی! مہمان کو چھینک آ گئی تھی جس کی وجہ سے لبوں پر رکھا پرشاد گلے میں اٹک گیا تھا اور اگر اُلٹی نہ آ جاتی تو شاید مہمان کی سانس اٹک جاتی!

ایک نئے شہر میں مالتی کے گھر میں، پہلی پارٹی ہو رہی ہے! چار گھنٹوں سے چل رہی، رعنائیوں سے منوّر بزم میں شامل ہونا مالتی کے لیے بزم میں ایک ٹائم بم لانے جیسا ہے! اس لیے وہ اماں جی کو بزم سے دُور رکھنے میں جو خوشی اس کو مادھونے دی ہے، اُس کو وہ ایک صدمے میں بدلنا نہیں چاہتی ہے! سرسوتی کو اپنی اماں جی کے بارے میں مکمل معلومات دے کر اور اپنے خدشات کو بیان کر کے مالتی کو یقین ہے کہ وہ اپنی فرمائش واپس لے گی اور دونوں کوئی بہانہ بنا کر بزم میں مالکن جی کے بغیر ہی شامل ہو جائیں گے تا کہ دھماکہ خیز مواد کو ٹال کر تقریب کو انجام تک پہنچایا جا سکے!

مگر سرسوتی نے اس کو چونکا دیا ہے! وہ اماں جی عرف مالکن جی سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہے! وہ مالتی کا ہاتھ پکڑ کر، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، مالکن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُس کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے!

ڈاکٹر سرسوتی علمِ نفسیات کی ماہر ہے! آج وہ مالکن جی سے دوسری بار ملنے کی خواہشمند ہے! وہ اس لیے کہ اپنی پہلی ملاقات کے دوران جو شکوک اُبھر کر آئے تھے، وہ مالکن جی کی زندگی کی کہانی سن کر یقین میں بدل گئے ہیں! جبکہ مالتی اپنے خدشات کا بوجھ لے کر اپنا ماں جی سے ملنا ہی نہیں چاہتی ہے!

اماں جی عرف مالکن جی کے کمرے کے باہر دونوں ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ کمرے کے اندر داخل ہونا چاہیے یا نہیں! ہاں مالتی آج اماں جی کے تیور دیکھ کر حیران بھی ہے اور پریشان بھی ہے! یہ سوچ کر کہ عام طور پر ذرا سی آہٹ سن کر دروازے پر آ جانے والی مالکن جی آج اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے کیوں نہیں آئی ہے؟ بلکہ آج وہ کمرے میں نہ چکّر لگا رہی ہے اور نہ معمول کی طرح اپنی بے قراری پر قابو پانے کی خاطر گنگنا رہی ہے؟ کیوں؟ بلکہ گھر میں گونج رہے نغموں اور موسیقی کی آواز سن کر وہ آج جُھوم جُھوم کر اپنے گانے والی مہمانوں سے ملنے بھی نہیں آئی ہے! کیا وہ اپنے خفگی کا اظہار کر رہی ہے یا اپنے غصّے کا، اپنے ہی طریقے سے مظاہرہ کر رہی ہے؟

ظاہر ہے کہ مالتی کو احساسِ جرم ہے اس لیے وہ پارٹی کے اختتام سے پہلے اماں جی کا سامنا

نہیں کرنا چاہتی ہے! وہ اس لیے کہ آج پہلی بار مادھو نے، مالتی کے اصرار پر، نہایت تُرش زبان میں، اپنی دادی کو بتا دیا ہے کہ ان کے گھر آیا ہر ملاقاتی اس کا مہمان نہیں ہوتا ہے! اور جو مہمان ہوتا ہے وہ بھگوان نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک اچھا یا بُرا انسان ہوتا ہے! وہ اگر کسی خاص مقصد سے، کسی ایک سے یا سب سے ملنے آتا ہے اور مل کر چلا جاتا ہے! اور پھر آخر میں یہ کہہ دیا تھا کہ آج مالتی کے مہمان آرہے ہیں اس لیے دادی کو اپنے کمرے میں تب تک رہنے کی ہدایت دی تھیں جب تک مہمان اپنے گھر سے چلے نہیں جاتے ہیں! گویا مادھو نے سچ بول کر اپنی دادی سے وفا کی تھی!

مالتی کے سامنے وہ منظر بار بار آرہا ہے جب اپنے پوتے کی گرجدار آواز سن کر اماں جی پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی جیسی ایک فاتح کو اچانک شکست دے کر جنگی قیدی بن جانے کے وقت اُس پر طاری ہو جاتی ہے!

تب دادی کچھ بھی نہیں بولی تھی! گویا وہ مادھو کے حکم کی تعمیل کر چکی تھی! چار گھنٹوں کے دوران جب بھی مالتی، اماں جی کو دیکھنے آیا کرتی تھی وہ دَبے پاؤں چل کر آیا کرتی تھی تاکہ اماں جی کو تاک جھانک کے بارے میں اِفشا نہ ہو! لیکن اس بار اماں جی سب جان کر جانے کیا رویّہ اختیار کرلے، یہ سنجیدگی سے سوچ رہی ہے! خاص طور پر تب جب دادی یہ جان جائے گی کہ جن مہمانوں سے اُن کو دُور رکھا گیا تھا انھوں نے ہی ان کو اپنی بزم میں شامل ہونے کے لیے مدعو کیا ہے! ظاہر ہے کہ مالکن جی اگر بزم میں شامل ہوئی تو اس واقعے کو کسی اساطیری کتھا سے جوڑ کر بزم کا رنگ بدل دے گی اور اپنے رنگ میں نظر آئے گی! بلکہ یہ بھی بتا سکتی ہے کہ اس کو گھر کی مالکن ہونے کے باوجود مہمانوں سے دُور رکھا گیا ہے اور یہ بھی تباہ کن کروٹ ثابت ہوسکتی ہے؟

بحث اور مباحثوں کے بعد دونوں کمرے میں داخل ہو کر حیرت زدہ ہو گئے ہیں! اماں جی عرف مالکن جی ایک کونے میں یوں نظر آرہی ہے گویا کوکھ میں بیٹھا ایک بچّہ ایک شکست خوردہ فاتح جنگی قیدی بن کر، خون کے آنسو بہاتا رہتا ہے، مگر جب کوئی، اپنا یا غیر، اُس کی دلیری کا ذکر چھیڑتا ہے تب اس کے شکستہ دل کو قرار آجاتا ہے! بس یہی سوچ کر سرسوتی مالکن جی سے مخاطب ہے جبکہ مالتی خاموش ہے اور صورتِ حال کا جائزہ لے رہی ہے!

مالکن جی! ہم آپ ہی سے ملنے آئے ہیں! ہم آپ کے مہمان ہیں! ہم پھول ہیں اور آپ ایک تتلی ہو! ہو نا؟ ہم سب مل کر آپ کا پسندیدہ گانا گا رہے ہیں! سن رہی ہیں نا آپ؟ میں آپ کو مدعو کرنے آئی ہوں، نہیں نہیں! آپ ... اب ... چلیے ... بزم کی میزبانی سنبھالیے!

چلیے نا! مالکن جی!؟

اماں جی عرف مالکن جی کی پُر اسرار خاموشی دیکھ کر سرسوتی گھبرا کر بڑبڑا رہی ہے! مالکن جی پر نظریں جما کر وہ مالتی کو سمجھا رہی ہے!

مالکن جی بیمار ہے! اسّی برس کی یہ عورت آٹھ سال کی عمر سے ہی بیمار ہے! کوشی، کوشلیا، دُرگا، شارِکا، مریم اور ساوتری کا علاج اس کے والدین کر چکے ہیں پھر مالکن جی کا علاج اُس کا شوہر اور بیٹا کر چکے ہیں! ہر بیماری کی طرح اس بیماری کی شدت صحیح علاج سے کم ہو جاتی ہے! بلکہ مریض کو شفا بھی نصیب ہو جاتی ہے! مگر غلط علاج بیمار کو ہی کھا جاتا ہے!!

وفا کرنے والوں نے مصلحتاً جھوٹ بول کر کوشی کو ساوتری مان کر، اس کے تصور کو حقیقت کے رنگوں میں قبول کر کے، مالکن جی کو ایک میزبان بنا دیا اور مہمانوں کو بھگوان! اور وہ سب جھوٹ بول کر، وفا سے اس کا صحیح علاج کرتے رہے! بیماری کی شدت کم ہوتی رہی اور بیمار کو قرار آتا رہا! جبکہ مادھو نے سچ بول کر مالکن جی کے ساتھ بے وفائی کی ہے اور جفا غلط علاج ثابت ہو سکتا ہے! یہ اگر اپنی دادی سے بے حد پیار کرنے والے پوتے نے سوچا ہوتا تو آج کا دن اماں جی عرف مالکن جی کے لیے ایک 'نیا دن' ثابت نہ ہوا ہوتا! اگر آج بھی، معمول کی طرح، مادھو مصلحتاً خاموش رہتا تو شاید ایک مہمان اپنی میزبان کو ایک زور کا جھٹکہ نہیں دیتا! یہ سوچ کر مالتی لرز گئی ہے!

اپنی اماں جی کی خاموشی توڑنے کی خاطر مالتی نے اس کے کندھے کو یوں چھو لیا ہے گویا ایک تتلی کے رنگ دار پَروں کو چھو کر اُس کو اُڑنے کے لیے اُکسا رہی ہو! مگر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ!

تتلی بے جان تھی اس لیے اُڑ کیسے پاتی؟

مالتی چیخ پڑی ہے! مہمان گا رہے ہیں اور سارے گھر میں ایک کورس نغمے کی گونج نے مہمانوں تک اس کی درد بھری آواز پہنچنے نہیں دی ہے!

سرسوتی مالتی کو سمجھا چکی ہے کہ کوشی یا مالکن خود ایک مہمان تھی! گلشن میں آئی ایک تتلی کی طرح! اور وہ اُڑ کر چلی گئی ہے!!

OO

بَــرف

کِس نے کِس کے آشیانے کو آگ لگادی؟ کِس نے کِس کا گھر مسمار کر دیا؟ کِس نے کِس کو مار ڈالا؟ کِس نے کِس کو بھگا دیا؟ یہ سب ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا جو اس وقت جھیل کے کنارے برف کی چادر پر بیٹھے دُور دُور نظریں دوڑا کر نوحؑ کی کشتی کو تلاش کر رہے ہیں!

اچانک ایک شور برپا ہوا تو سب سہم کر برف کے ٹکڑے بن گئے! میں بھی اُن میں سے ایک ہوں!! کچھ دیر پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے بھاگتے، ہانپتے کانپتے، گرتے سنبھلتے جھیل کی طرف گئے تھے! دراصل وہ اور کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے! پیچھے برف سے ڈھکا ہوا پہاڑ اور دائیں بائیں ان کا تعاقب کرنے والی طرح طرح کی آوازیں — نعرے، دھمکیاں، اشتعال انگیز فقرے......! دھماکوں و گولیوں کی آوازیں......! دراصل وہ دونوں فرقہ پرستی کی دیواریں توڑ کر، قدم قدم پر موجود دراڑیں پھاند کر فقط ایک دوجے کی پریت کی خاطر، سر پر کفن باندھ کر اپنے گھر سے بہت دُور نکل آئے تھے، مگر آوازیں، ایک ڈراؤنے طوفان کی طرح، قریب آرہی تھیں اور وہ سب، جن سے رشتے ناطے توڑ کر وہ بھاگ گئے تھے، وہی لوگ ان کا پیچھا کر رہے تھے! وہ کون تھے، میں دیکھ نہیں پایا! شاید اس لیے کہ تب زبردست دُھند تھی اور اب زبردست برف باری میں بھی مجھے ہر طرف جانے پہچانے لوگ نظر آرہے ہیں! ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کی ایک لڑکی کو ورغلا کر لے گئے ہیں! جبکہ دوسرے فرقے کے لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اس فرقے کے لوگ اُن کے ایک آدمی کو اِغوا کر کے لے گئے ہیں!!

وہ دونوں جب پاس سے گزرے تھے، تب میں نے ان کی سرگوشیوں کی آواز سن لی تھی اور یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی —! لیکن ان میں کون ہندو اور مسلمان کون تھا، یہ ان کا تعاقب کرنے والے لوگ بھی نہیں جانتے تھے! مگر جذبات کو بھڑکانے کی خاطر ہندو یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکی ہندو ہے جبکہ مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکی مسلمان ہے

چلیے نا! مالکن جی!؟

اماں جی عرف مالکن جی کی پُراسرار خاموشی دیکھ کر سرسوتی گھبرا کر بڑبڑا رہی ہے! مالکن جی پر نظریں جما کر وہ مالتی کو سمجھا رہی ہے!

مالکن جی بیمار ہے! اسّی برس کی یہ عورت آٹھ سال کی عمر سے ہی بیمار ہے! کوشی، کوشلیا، دُرگا، شارِکا، مریم اور ساوتری کا علاج اس کے والدین کر چکے ہیں پھر مالکن جی کا علاج اُس کا شوہر اور بیٹا کر چکے ہیں! ہر بیماری کی طرح اس بیماری کی شدت صحیح علاج سے کم ہو جاتی ہے! بلکہ مریض کو شفا بھی نصیب ہو جاتی ہے! مگر غلط علاج بیمار کو ہی کھا جاتا ہے!!

وفا کرنے والوں نے مصلحتاً جھوٹ بول کر کوشی کو ساوتری مان کر، اس کے تصور کو حقیقت کے رنگوں میں قبول کر کے، مالکن جی کو ایک میزبان بنا دیا اور مہمانوں کو بھگوان! اور وہ سب جھوٹ بول کر، وفا سے اس کا صحیح علاج کرتے رہے! بیماری کی شدت کم ہوتی رہی اور بیمار کو قرار آتا رہا! جبکہ مادھو نے سچ بول کر مالکن جی کے ساتھ بے وفائی کی ہے اور جفا غلط علاج ثابت ہو سکتا ہے! یہ اگر اپنی دادی سے بے حد پیار کرنے والے پوتے نے سوچا ہوتا تو آج کا دن اماں جی عرف مالکن جی کے لیے ایک 'نیا دن' ثابت نہ ہوا ہوتا! اگر آج بھی، معمول کی طرح، مادھو مصلحتاً خاموش رہتا تو شاید ایک مہمان اپنی میزبان کو ایک زور کا جھٹکہ نہیں دیتا! یہ سوچ کر مالتی لرز گئی ہے!

اپنی اماں جی کی خاموشی توڑنے کی خاطر مالتی نے اس کے کندھے کو یوں چھو لیا ہے گویا ایک تتلی کے رنگ دار پَروں کو چھو کر اُس کو اُڑنے کے لیے اُکسا رہی ہو! مگر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ!

تتلی بے جان تھی اس لیے اُڑ کیسے پاتی؟

مالتی چیخ پڑی ہے! مہمان گا رہے ہیں اور سارے گھر میں ایک کورس نغمے کی گونج نے مہمانوں تک اس کی درد بھری آواز پہنچنے نہیں دی ہے!

سرسوتی مالتی کو سمجھا چکی ہے کہ کوشی یا مالکن خود ایک مہمان تھی! گلشن میں آئی ایک تتلی کی طرح! اور وہ اُڑ کر چلی گئی ہے!!

OO

بَــرف

کِس نے کِس کے آشیانے کو آگ لگا دی؟ کِس نے کِس کا گھر مسمار کر دیا؟ کِس نے کِس کو مار ڈالا؟ کِس نے کِس کو بھگا دیا؟ یہ سب ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا جو اس وقت جھیل کے کنارے برف کی چادر پر بیٹھے دُور دُور نظریں دوڑا کر نوحؑ کی کشتی کو تلاش کر رہے ہیں!

اچانک ایک شور برپا ہوا تو سب سہم کر برف کے ٹکڑے بن گئے! میں بھی اُن میں سے ایک ہوں!! کچھ دیر پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے بھاگتے، ہانپتے کانپتے، گرتے سنبھلتے جھیل کی طرف گئے تھے! دراصل وہ اور کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے! پیچھے برف سے ڈھکا ہوا پہاڑ اور دائیں بائیں ان کا تعاقب کرنے والی طرح طرح کی آوازیں — نعرے، دھمکیاں، اشتعال انگیز فقرے......! دھماکوں و گولیوں کی آوازیں......! دراصل وہ دونوں فرقہ پرستی کی دیواریں توڑ کر، قدم قدم پر موجود دراڑیں پھاند کر فقط ایک دوجے کی پریت کی خاطر، سر پر کفن باندھ کر اپنے گھر سے بہت دُور نکل آئے تھے، مگر آوازیں، ایک ڈراؤنے طوفان کی طرح، قریب آ رہی تھیں اور وہ سب، جن سے رشتے ناطے توڑ کر وہ بھاگ گئے تھے، وہی لوگ ان کا پیچھا کر رہے تھے! وہ کون تھے، میں دیکھ نہیں پایا! شاید اس لیے کہ تب زبردست دُھند تھی اور اب زبردست برف باری میں بھی مجھے ہر طرف جانے پہچانے لوگ نظر آ رہے ہیں! ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کی ایک لڑکی کو ورغلا کر لے گئے ہیں! جبکہ دوسرے فرقے کے لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اس فرقے کے لوگ اُن کے ایک آدمی کو اِغوا کر کے لے گئے ہیں!!

وہ دونوں جب پاس سے گزرے تھے، تب میں نے ان کی سرگوشیوں کی آواز سن لی تھی اور یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی — ! لیکن ان میں کون ہندو اور مسلمان کون تھا، یہ ان کا تعاقب کرنے والے لوگ بھی نہیں جانتے تھے! مگر جذبات کو بھڑکانے کی خاطر ہندو یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکی ہندو ہے جبکہ مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکی مسلمان ہے!

مگراس سے پہلے کہ وہ پکڑے جاتے، دونوں کشتی میں سوار ہو گئے! میں خوش تھا کہ دونوں کو نوح کا سفینہ مل گیا ہے! مگر دیکھتے ہی دیکھتے اب کشتی ڈگمگانے لگی ہے اور دونوں طرف سے آ رہی ہوتی گولیاں کشتی کو چھلنی کر گئی ہیں! میں نے آنکھیں بند کر لیں تو ایک برف کا ٹکڑا کھسک کر میرے قریب آیا ہے اور بول رہا ہے کہ یہ نوح کا سفینہ نہیں ہے! یہ میری ناؤ ہے...... ہم لوگ اس کو شکارا کہتے ہیں! لگتا ہے تم یہاں ایک اجنبی ہو یا پھر یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو! ہمارے شکارے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پیارے ہیں! ہم ان کو نام دیتے ہیں! جیسے میرے شکارے کا نام 'جنت' ہے — وہ دیکھو 'جنت' درد کی شدّت سے تڑپ رہی ہے! دیکھو! دیکھو!!

پھر وہ زار و قطار روتا رہا اور بار بار یہی کہتا رہا! یہ دیکھو — یہ جھیل کا وہ گھاٹ ہے جہاں ہر وقت درجنوں شکارے موجود رہتے تھے —! سیاحوں کو جنت کی سیر کرانے کی خاطر —! مگر اب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے! میں بھی اس لیے آیا تھا کہ شاید کوئی سیاح یا سواری ملے تا کہ آج چوتھے دن تو بھوکے بچوں کو کھانا کھلا سکوں! وہ رو پڑا تو میں بھی رو پڑا ہوں اور اُس کی ڈوبتی کشتی کو دیکھ رہا ہوں!

اپنے پھولتے سانسوں کو بار بار روک کر دن گزار دیا ہے اور اب رات بھی گزر گئی ہے!

ابھی بہت سویرا ہے! ہلکی ہلکی برف باری اب بھی ہو رہی ہے! آس پاس برف ہی برف ہے! درختوں کی ٹہنیوں پر دُور تک پھیلے کھیتوں میں، اَدھ جلے مکانوں پر، پہاڑوں پر، گویا ایک کورے کاغذ سے ان حسین وادیوں کو یوں ڈھک دیا گیا ہو جیسے کوئی فریادی کاغذی پیرہن دکھا کر اپنی فریاد سنا رہا ہو!

میری نظریں جھیل کے درمیان واقع جزیرے میں لگے صدیوں پرانے چنار کے چار درختوں پر جمی ہوئی ہیں! وہ بھی برف کی چادر اوڑھے چُپ چاپ یوں کھڑے ہیں جیسے صلیب سے لٹکا ہوا مسیحا یا زنجیروں میں جکڑے ہوئے صوفی سنت! نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ دونوں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ان چناروں کے کھوکھلے تنوں میں بیٹھے سورج کی کرنوں کا انتظار کر رہے ہیں! شاید میری ہی طرح یہ سوچ کر کہ برف پگھل جائے گی! جھیل کا منجمد پانی پھر حرکت میں آئے گا! روپہلی لہریں ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے کناروں تک آ جائیں گی! اور پھر کمل کے پھول دکھائی دیں گے! لیکن دن کی اُجلی دُھوپ کو کالے بادلوں نے دبوچ ڈالا ہے! جھیل کی منجمد سطح بچوں کے تجسّس کا مرکز بن چکی ہے! چونکہ بچے جھیل کی منجمد سطح پر کرکٹ کھیل رہے ہیں یا سائیکل چلا رہے ہیں! بھلا کوئی حالات کو سنگین بنائے تو بھی کیسے؟-!

میرے ساتھ بیٹھی ایک بوڑھی عورت نے جب جھیل کے درمیان ایک الٹ چکی کشتی پر دو انسانوں جیسے برف کے بت دیکھے تب وہ سمجھی شریر بچوں نے برف کے مجسّمے بنائے ہیں! دوسری عورت نے کہا کہ وہ جانتی تھی کہ چاروں طرف لگی آگ کو بجھانے کے لیے آسمان سے برف کے دیوتا اُتر آئیں گے! مگر برف میں دھنس دھنس کر دور سے آئی ہوئی دو درمیانی عمر کی عورتیں جب جھیل کی منجمد سطح پر پھیلتی ہوئی، بار بار گرتی ہوئی الٹی ہوئی ناؤ کے پاس پہنچ گئیں تو دونوں چیختی چلاتی رہیں! پھر اپنے بال نوچتی رہیں اور لاشوں سے برف کی تہیں توڑتی رہیں!

ایک نے کہا ''ہاں، میں اس لڑکے کی بدنصیب ماں ہوں!''

دوسری نے کہا ''یہ میری بدنصیب بیٹی ہے!''

جھیل کے کنارے لوگ جمع ہو گئے تو دو نوجوان ایک دوسرے سے یوں اُلجھ گئے کہ بات ہاتھا پائی سے بڑھ کر گولیوں کی بوچھاڑ تک پہنچ گئی! پھر شور برپا ہوا! فسادات پھر شروع ہوئے اور برف کی چادر پر خون ہی خون نظر آنے لگا! پھر جب ایک مرغابی لرز کر شکاری کے سامنے گر گئی تب میں نے دم توڑ رہی مرغابی سے پوچھا کہ اب کیا ہوا؟ کیونکہ وہ حالات کا مکمل جائزہ لے چکی ہے اس لیے جواباً بول پڑی کہ فسادات کی شروعات کرنے والے ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ دیکھو! جھیل کی سطح پر بھگوان شنکر اور پاروتی! چلو درشن کریں! وہاں ایک مندر بنالیں!

دوسرے نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا دیکھتے ہیں یہ کافر لوگ یہاں بُت پرستی کیسے کریں گے؟ مگر کچھ دیر بعد شکاری مرغابی کی گردن مروڑ کر چل پڑا تو جلوس بھی منتشر ہوا! شہر میں کرفیو لگ گیا جن کے گھر جل گئے تھے وہ خیموں کی تلاش کرنے لگے!!

پھر برف باری شروع ہوئی! میں برف کی نئی تہہ اوڑھ کر سونا چاہتا ہوں مگر لاشوں کے ساتھ نوحہ خوانی کرتی ہوئی دو عورتیں بار بار چیخ چیخ کر فریاد کرتی رہیں!

دراصل وہ اپنے بچوں کے لیے دو گز کفن مانگ رہی ہیں!

میں برف کا ایک ٹکڑا ہوں کچھ کر نہیں سکتا! لیکن سوچ بھی کیسے سکتا ہوں!؟-؟!

OO

سَزا

ابھی بہت سویرا ہے!

دروازہ بند ہے مگر جانے کیسے کھڑکی اَدھ کھلی رہ گئی ہے!

کمرے میں دُھواں ہی دُھواں ہے اور باہر دُھند پھیلی ہوئی ہے! دراصل یہ کمرہ ایک زندان ہے اور میں ایک قیدی ہوں! میری بدبختی تو دیکھئے، بھنور سے نکل کر دلدل میں پھنس گیا ہوں!

میں پچھلے بیس سال سے ایک فوجی قیدی تھا اور ایک اذیت ناک قید سے بھاگ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا کہ ایک زبردست برفیلے طوفان کا شکار ہو کر یہاں آ گیا ہوں! یہ کون سی جگہ ہے، کون سا مقام ہے! یہ مجھے معلوم نہیں!!

بلکہ یہ اُن لڑکوں کو بھی معلوم نہیں تھا جو سرحد پار کر کے جنگی تربیت پانے کی غرض سے یہاں لائے گئے تھے! حالانکہ وہ مہمانِ خصوصی بن کر آئے تھے! ہم نفس ہم نوا ہونے کے دعوے کر رہے تھے! جانے وہ خوش بخت ہیں یا میری طرح بدبخت، مگر اتنا ضرور ہے کہ مجھ سے مجھ پر کیے گئے ظلم و تشدد کی کہانیاں سُن کر، وہ دروازہ بند ہونے سے پہلے تب بھاگنے میں کامیاب ہوئے تھے جب شکاری کھا پی کر سو رہا تھا!

میں بھی بھاگ سکتا تھا مگر برف پر چلتے چلتے میرے پاؤں لال ہو گئے ہیں نا — ! یہی حال کونے میں اَدھ مرے کشمیری ہانگل کا ہے! شکاری اس کو گھسیٹ گھسیٹ کر یہاں لے آیا ہے اور نادان لہولہان ہانگل کو یقین ہے کہ اس کے اپنے، برف پر خون کے دھبے اور اس کے لمبے سینگوں کے نشانات دیکھ کر شکاری کے خفیہ اڈّے کو کھوج کر، اس کو بچا لیں گے!

مگر ہمیں نہ کوئی دستک سنائی دے رہی نہ کوئی صدا......! بلکہ چاروں طرف ڈراؤنی خاموشی چھائی ہے! ہم دونوں نادان جو ٹھہرے!!

رات بھر جب شکاری آتش دان کے چمکتے ہوئے انگاروں پر مرغابیاں بھُون کر کھاتا رہا تب

ہانگل اپنی دَبی دَبی لرزتی ہوئی آواز میں بار بار بڑبڑاتا رہا!''کل میری باری ہے! شاید تمھیں بھی میرے گوشت کا ٹکڑا مل جائے گا! پھر یہ راکشش میری کھال اور میرا سر بیچ کر گولیاں خرید لے گا، بندوق خریدے گا، راکھ اور دُھواں پیدا کرے گا!!

دراصل میں اس کی باتیں سُن سُن کر یہ جان چکا ہوں کہ جس کو میں مسیحا سمجھ بیٹھا تھا، وہ ایک شکاری ہی نہیں بلکہ زندگیوں کی خرید وفروخت کرنے والا تاجر بھی ہے! اسی لیے وہ اب دروازہ بند کر کے، بھاگے ہوئے لڑکوں کی تلاش میں نکل پڑا ہے!

اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ دُھند میں انسان کو تو کیا چرندوں اور پرندوں کو بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے، پھر شکاری کو سب کچھ کیسے دکھائی دیتا ہے؟ شاید ویسے ہی جیسے بھیڑیے کو اندھیرے میں سب دکھائی دیتا ہے تو کیا شکاری ایک بھیڑیا ہے؟ ایک درندہ ہے؟؟

کہیں یہ دُھند، یہ دُھواں، وہ برفیلا طوفان کسی آدم خور جادوگر کا مایا جال تو نہیں ہے؟

دُھواں میری آنکھوں کو جلا رہا ہے، میری سانسوں کو دَبوچ رہا ہے! اُف اُف!!

میں رینگتا ہوا کھڑکی تک تو پہنچ گیا ہوں مگر دھوئیں نے تازہ ہوا کو روک رکھا اور اور دُھند کو دھکیل کر اس سے ایک فاتح کی طرح باتیں کر رہا ہے!-!!

دُھند اندر آنا چاہتی ہے اور دُھواں باہر جانا چاہتا ہے! دونوں روبرو ہیں اور ہم کلام ہیں!

دُھند کہہ رہی ہے کہ میں انسان کی دوست ہوں! قدرت کا وہ کھیل ہوں جو انسان کو سنبھل سنبھل کر چلنا سکھاتی ہے اور تم کائنات کے دشمن ہو، تم سرسبز جنگلوں، ہرے بھرے کھیتوں، مہکتے گلزاروں اور شاداب زندگی سے لپٹ کر ان کو کالا اور بے جان کر دیتے ہو!

دُھواں دھماکوں کی طرح گڑگڑاہٹ پیدا کر کے فاتحانہ قہقہے مار کر چند واقعات اور حادثات کا حوالہ دے کر دھند کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا ہے!

ہاں میں قدرت کا کھیل نہیں، انسان کا پیدا کیا ہوا تماشہ ہوں! میں اگر قہرِ آدم ہوں تو تم بھی تو قہرِ خدا ہو......! یاد کرو وہ دن جب میں نے شہر میں کرفیو نہیں لگوایا تھا! تم نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا! کئی دنوں کی برف باری کے بعد جب ناؤ میں بیٹھی ٹھٹھرتی ہوئی مچھیرن نے برف ہٹا ہٹا کر اپنی بھوکی بیٹی کی خاطر گہری جھیل میں اپنا جال پھینکا تھا تب وہ دیکھ نہیں پائی تھی کہ کب اس کی بیٹی پانی میں گر گئی تھی! کود پڑی تھی وہ، جال میں اپنی ہی بیٹی کے کالے کالے بال دیکھ کر!

ساحل پر بیٹھا بوڑھا مچھیرا پوچھ رہا تھا سورج سے بار بار ایک ہی سوال! کہاں ہے ماں اور

بیٹی، دونوں اور کیا ہے ان کا حال! سورج بھی گھبرا گیا تھا دیکھ کر، دُھند میں چھپا ہوا مہا کال! پھر دیکھتے ہی دیکھتے دُھند اور دھوئیں کی بحث، تکرار کی صورت اختیار کرگئی تو مجھے ہانگل کی دم توڑتی ہوئی آواز سنائی دی! نہ تو کوئی سورج کو سولی پر چڑھا سکتا ہے نہ دھند کو کوئی ہٹا سکتا ہے اور نہ کوئی قید کرسکتا ہے نادان انسان! دھند ہو یا دھواں، گولی ہو یا آندھی، آگ برسے یا برف، شکاری اپنا کھیل کھیلتا رہے گا! وقت کی ڈور جب تک اس کے ہاتھ میں ہے تب تک!

کاش کوئی یہ ڈور کاٹ دیتا! ورنہ جان لو کہ ہمیں تو کاٹنی ہے زندگی! یوں ہی، ویسے ہی، ایک بے جرم سزا ہو جیسے!

مجھے یاد ہے بلکہ ۲۵ سال فوجی قید میں رہ کر یہی تو ایک بات ہے جو میں بھول نہیں پایا ہوں! میری ماں بھی ایک مچھیرن تھی! ہم لوگ ایک کشتی میں رہا کرتے تھے! وہ کشتی برفیلے پہاڑوں کی گود میں دُور دُور تک پھیلی خوبصورت جھیل کے کنارے پر رہا کرتی تھی! کتنے خوش رہا کرتے تھے ہم! برف باری میں، بارش میں، آندھیوں میں، طوفان میں! لہریں جب کشتی سے ٹکراتی تھیں تب میرے دادا مجھے کشیپ رِشی سے نندرِشی تک کی تواریخ سنا کر ہمارے حوصلے بڑھایا کرتے تھے!

میرے پَردادا کو ۱۹۳۱ء میں شاہی راج کی گولی کھا گئی! اور دادا کو ہندوؤں کو بچانے کے الزام میں ۱۹۴۷ء میں قبائلیوں نے قتل کر دیا! ابا کو ۱۹۶۵ء کی لڑائی کھا گئی اور میں ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں چھمب سیکٹر میں قید ہوا — اور اب میرا بیٹا؟؟

وہ ۲۱ سال کا ہوگا! اگر زندہ ہو تو! کہیں وہ اُن معصوم لڑکوں میں سے ایک تو نہیں تھا جن کو پکڑنے کے لیے شکاری نکل پڑا ہے!!

اُف ہانگل دم توڑ چکا ہے! میری سانسیں بھی ٹوٹ رہی ہیں اور کانوں میں دھند اور دُھوئیں کی تکرار کے شور کے ساتھ ساتھ ہانگل کی آواز گونج رہی ہے! قہر خدا ہو یا قہر آدم! نادان انسان!! ہمیں تو کاٹنی ہے زندگی ویسے ہی! ایک بے جرم سزا ہو جیسے!!

OO

کروٹ

غیر متوقع واقعات سے اُبھرے حالات اُس کی دانش مند منصوبہ بندی سے، ایک کروٹ لے کر، حیرت انگیز نتائج دے سکتے ہیں، یہ اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا! یعنی اُس کا اُکھڑ چکا اینٹوں کا بھٹہ، آج موسمِ بہار کی مانند چہکتا مہکتا نظر آئے گا! ایسا اُس نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا!!

دراصل جب سے ایک رات کی غیر متوقع تیز بارش نے اس کی لاکھوں کچّی اینٹوں کو کیچڑ میں بدل کر اُس کا بھٹہ بٹھا دیا تھا وہ ایک زبردست اقتصادی بحران کا شکار ہو چکا ہے! بینک سے قرض لے کر وہ بحران پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے مگر چند ہفتوں کے دوران ہو چکی کارکردگیوں کے نتائج کی آہٹ سن کر آج اُس نے تمام کچی اینٹوں کو زمین پر بچھا کر، ان پر ایک استقبال کے لیے قالین بچھا دیے ہیں! سائبانوں سے سجا کر، اُس کا بھٹہ سج دھج کر آج ایک ایسے مہمان کا انتظار کر رہا ہے جو اُس کو ایک لاکھ امریکی ڈالر بطور ایک عالمی مقابلہ جیتنے کی رقم کا چیک دینے آ رہا ہے! اور یوں اُس کو وہ خوشیاں دے رہا ہے جو اُس نے اپنے تیس برس کے کاروباری دَور میں پہلے کبھی نہیں سمیٹ لی ہیں! ظاہر ہے کہ اُس نے اپنے عالیشان مستقبل کے استقبال کے لیے ایک رنگا رنگ تقریب کا اہتمام کیا ہے! شہر کے معزز شہریوں اور اعلیٰ سرکاری افسران کے علاوہ میڈیا والوں کو بھی مدعو کیا ہے!!

تقریب میں وہ جوڑا بھی شامل ہے جس نے اُس کے نمائندوں کے طور پر مقابلے میں حصہ لے کر، رقم جیت لی ہے! حالانکہ اُن کی بے وقوفی اور شرائط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے انعام کی رقم کا اسّی فیصدی حصّہ کٹ چکا ہے پھر بھی لکشمی نارائن نام کا ایک ٹھیکیدار یعنی جوڑے کا محسن دونوں کو بطور دولت کی دیوی لکشمی اور بھگوان نارائن، متعارف کر رہا ہے اور خود کو ایک احسان مند ظاہر کرتے ہوئے میاں بیوی کے پیر بار بار چُھو رہا ہے اور ہر بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر پھولے نہیں سمارہا ہے!!

بیس برس کا مادھو اور اس کی ہم عمر بیوی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خود ہی اپنی داستانِ غم حاضرین کو سنا کر یہ قبول کر چکے ہیں کہ اگر ٹھیکیدار نے اُن کو روزگار اور ایک خیمہ نہ دیا ہوتا تو وہ بھوک یا سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوتے!

وہ خوش ہیں کہ ان کی بدولت ان کا محسن کچھ پا رہا ہے! بلکہ وہ بھی مطمئن ہیں کیونکہ ٹھیکیدار سے کیے گئے معاہدے کی رُو سے وہ کسی گاؤں میں گھر، زمین، بیلوں کی ایک جوڑی، ایک جرسی گائے، یعنی مال مویشی بھی لے رہے ہیں! گویا وہ سب، جو انھوں نے کھویا ہے، بلکہ اُس سے بھی زیادہ!!

یہ سچ ہے کہ میاں بیوی اپنی سہاگ رات کو ہی اُکھڑ کر اُجڑ گئے ہیں! ہوا یوں تھا کہ وہ شبِ عروس سے پہلے اپنے گاؤں کے مندر میں گئے تھے تب دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کا ایک پُل ندی میں اچانک آئے ہوئے پانی کے تیز بہاؤ سے بہہ کر ان کو مندر میں ہی رات گزارنے کے لیے مجبور کر گیا تھا! پھر چونکہ آناً فاناً نشیبی سطح پر واقع گاؤں، گاؤں والے، دُور دُور تک پیلے کھیت بلکہ درخت بھی پانی میں اپنا وجود کھو بیٹھے تھے! صرف وہی زندہ رہنے میں کامیاب ہوئے تھے! اور چھ دن اور سات راتیں دنیا سے کٹ کر نہایت دُشوار اور عذاب دِہ حالات میں گزار چکے تھے!!

دونوں کو تب ہیلی کوپٹر کی مدد سے شہر میں لایا گیا تھا اور دونوں کی دردناک، تنہائی میں رہنے کی حیرت انگیز کہانی، اخباروں میں شائع ہوگئی تھی! ٹیلی ویژن کے تمام چینلوں پر ان کے اِنٹرویو دکھائے گئے تھے! لیکن چند دِنوں کے بعد ہی وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ میں بھی ویسے ہی الگ تھلگ ہو گئے تھے جیسے وہ مندر میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر تنہائیوں میں رہ گئے تھے! اور پھر نہ گاؤں کا کوئی ذکر کرتا تھا نہ کسی کو یہ جاننے کی فکر تھی کہ گاؤں کو دبوچ ڈالنے والا مارخور پانی، ڈیم (باندھ) کے جُزوی برباد ہونے کی وجہ سے کیوں اور کیسے آیا تھا؟ بحث مباحثوں میں امکانات کا ذکر اچانک یوں ڈوب گیا تھا، گویا گہرے پانی میں ایک پتھر! جو لوگ برق کی شکل میں باندھ پر گر پڑا قہرِ خدا، یا قہرِ آدم کی شکل میں دہشت گردوں کی کارستانی یا پھر سرکاری ملازموں کی غفلت کے حوالے دیتے رہتے تھے، سب خاموش ہو گئے تھے! گویا میاں بیوی ایک سناٹے میں نااُمیدیوں کا بوجھ اٹھا کر کئی دنوں تک ایک عذاب دِہ سفر طے کرنے پر مجبور ہو گئے تھے!

چونکہ شادی کے کپڑے پہن رکھے تھے اس لیے میاں بیوی کو مندروں میں پرشاد تو کیا بھیک بھی نہیں ملی تھی اور ایسے حالات میں جب لکشمی نارائن ٹھکیدار نے ان کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا! تب ان کو یوں لگا تھا گویا بھگوان اِن کے سامنے کھڑا تھا!

دراصل ٹھیکیدار میاں بیوی کے بارے میں، اُن سے حالِ زار سنے بغیر بہت کچھ جانتا تھا! اُس کی ایک خاص وجہ تھی!

چونکہ لکشمی نارائن ٹھیکیدار کی سوچ اور سمجھ پر اُس کا کاروباری عمل حاوی ہوتا رہتا ہے اس لیے وہ ہو چکے، ہو رہے یا متوقع واقعات کے پس منظر میں فقط اپنے نفع یا پھر نقصان کا اندازہ لگانا ایک مقصد نما عادت بن گئی ہے! یعنی اگر برف باری نہیں ہوئی تو؟ اگر دہشت گردی ختم ہو گئی تو؟؟

اس کے علاوہ انعامی مقابلوں میں شریک ہونا اس کا واحد مشغلہ ہے اس لیے اُس کی نظریں ہمیشہ ایسی خبروں یا اطلاعات کی تلاش کرتی رہتی ہیں جن کا تعلق انعامی مقابلوں سے ہوا!

جس دن نہایت کسمپرسی کی حالت میں یہ جوڑا اُس سے مدد مانگنے آیا تھا، اُس دن اُس نے ایک دس لاکھ ڈالر کے عالمی مقابلے کی پوری جانکاری حاصل کی تھی! یہ سوچ کر کہ جو جوڑا نہایت ڈراؤنے ماحول میں زندہ رہنے کی ہر ضرورت سے محروم ہوتے ہوئے بھی، کسی مددگار کے دلاسوں کے بغیر رنج و غم اور مایوسیوں کی تاریکیوں میں ڈوبکیاں لگاتے ہوئے، چھ دن تک حالات سے مقابلہ کر سکتے ہیں، وہ اپنی جسمانی اور جنسی ضروریات میسر ہونے کی صورت میں، دس دن تک شہر بلکہ آبادی سے بھی دُور ایک برفیلے پہاڑ پر، گنجان جنگل میں، مقابلے کے لیے خاص طور پر بنائے گئے ایک محفوظ گھر میں، تنہا رہ سکتے ہیں! اور اگر وہ مقابلہ جیت جاتے ہیں تو کیوں نہ ایک معاہدے کے تحت اُن کو وہ دیا جائے جو بھی کھو چکے ہیں! اور باقی کی رقم سے اپنے تمام خوابوں کو حقیقتوں میں بدلا جا سکتا ہے!

بس یہی سوچ کر ایک ٹھیکیدار نے، میاں بیوی، دونوں کی، انگلیاں پکڑ لی تھیں! چونکہ انعامی مقابلے میں فقط وہ شریک ہو سکتے تھے جو ملتے جلتے حالات میں رہ چکے ہوں اس لیے اُس نے اپنے خرچے پر اخباروں کے حوالوں سے، ٹی وی پر ان کے نشر ہو چکے پروگراموں کو دکھا کر، ان کو مقابلے میں شامل کروالیا تھا! جس روز مقابلے کے لیے، میاں بیوی کو، ایک ہیلی کاپٹر میں لے کر، ایک برفیلے پہاڑ کی اونچی چوٹی پر چھوڑا گیا تھا، ٹھیکیدار کو بھی، بحیثیت میاں بیوی کے محسن اور قانونی مشیر ساتھ لیا گیا تھا! تا کہ وہ جان پاتا کہ گھر ہر لحاظ سے محفوظ ہے! کیونکہ چھوٹا سا مکان نہ برف کے بوجھ سے دَب سکتا تھا اور نہ کوئی تیز رفتار برف کا تو وہ گھر کو دَبوچ سکتا ہے! گھر میں بیس دن کے کھانے پینے کا سامان تھا! سردی کا مقابلہ کرنے کی خاطر معقول انتظامات رکھے گئے تھے! بلکہ تفریح کے لیے الیکٹرانک سہولیات بھی میسر تھیں! فلم دیکھی جا سکتی تھی! کوئی بھجن، گیت یا قوالی سنی جا سکتی تھی!

بلکہ دل بہلانے کی خاطر اور جنسی رجحانات کو تقویت دینے والی نظموں کے کیسٹ بھی رکھے گئے تھے! یعنی اوب کر سوچنے اور سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی! اس لیے وہ مقابلے میں کود پڑا تھا!

اور یہ سبھی سہولیات اس لیے رکھی گئی تھیں تا کہ یہ تجربہ کیا جا سکے کہ انسان تنہائیوں میں رہ کر نفسیاتی خدشات کو جسمانی خوف سے زیادہ ڈراؤنا سمجھ کر مدد کے لیے صدائیں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ کب تک تنہائیوں میں الگ تھلگ ہو کر رہ سکتے ہیں!

ایک بہت ہی آرام دِہ چھوٹے مگر بے حد خوبصورت گھر میں موجود سہولیات کے بارے میں منتظمین نے مکمل طور پر جانکاری دی تھی! سہولیات کے استعمال کے لیے وہ تب کچھ بتا دیتے جب مالتی، مادھو یا منتظمین کے ساتھ آیا ہوا اور ان کے ہی ساتھ جانے والا میاں بیوی کا قانون مشیر اُن سے گزارش کرتا! منتظمین سمجھ بیٹھے تھے کہ میاں بیوی سہولیات کے استعمال سے آشنا ہیں جبکہ ٹھیکیدار کو ان کی نا آشنائی کا اندازہ تھا مگر اس کو یقین تھا کہ دونوں کے لیے ایسے آرام دِہ ماحول میں جب وہ موٹے شیشوں سے جھانک کر برف باری کے مناظر دیکھتے دیکھتے، کھا پی کر، ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے تب ساری کائنات سمٹ کر دونوں کی مسکراہٹ بن جائے گی!

یہ سوچ کر ہی اُس نے نہ خود میاں بیوی کو ہدایات دی تھیں اور نہ میاں بیوی کو پوچھ تاچھ کرنے کا موقع دیا تھا! ایک مصلحت کے تحت! کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میاں بیوی کو انعام کی رقم کے بارے میں جانکاری ہو! گھر میں ایک فون بھی تھا جو ناظم کے ساتھ جڑا ہوا تھا! یعنی اگر بات ہو جاتی تو ہر سوال اور ہر جواب یعنی مدد طلب کرنے والے اور مددگار کی آوازیں اور کوئی سن نہیں سکتا تھا! اُس کی بھی ایک خاص وجہ تھی! ہر مدد کی صدا یعنی (Tistress Call) اُس خوف یا ڈر کی شناخت کر سکتی تھی جو مقابلے میں حصہ لینے والوں کے تذبذب سے اُن کے ارادے کو عزم کی بلندی سے گرا کر ہٹا بھی سکتی تھی! یعنی ہر بار ایک سوال پر رقم کی جزوی کمی ہو جانے کے لیے، مدد مانگنے والے کو تیار رہنا تھا! اس شرط کو ناظم اور ٹھیکیدار دونوں نے قانونی طور پر قبول کیا تھا! اگر مدد صحت کے بارے میں ہو، تو اس کو رقم کھانے والی مدد کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا! اُس کی ضرورت بھی نہیں پڑ سکتی تھی کیونکہ منتظمین نے گھر میں دوائیاں بھی رکھ لی تھیں! میاں بیوی کی ڈاکٹری جانچ ہو چکی تھی اور حادثوں کے امکانات تھے ہی نہیں! یعنی گھر میں فقط ذی ہوش انسانوں کے لیے نفسیاتی دباؤ کے اُتار چڑھاؤ کے امکانات تھے! جسمانی تکالیف کا کھنچاؤ نہیں تھا!

منتظمین نے کسی جنگلی جانور بلکہ ڈائن، بھوت، وائرس، ~~پیاسے~~ تصوراتی وجودوں کے حملوں کو خارج

کرنے کے دعوے بھی کیے تھے! انسانی حملوں یا دہشت گردی کے تحفظ کا بھی یقین دلایا تھا! بلکہ یہ بھی قبول کیا تھا کہ اگر ان کی طرف سے اُن کا کوئی دعویٰ غلط ثابت ہوا تو وہ مقابلے کو مکمل قرار دے کر، مقابلے میں شریک جوڑے کو پوری رقم دیں گے!

گویا بقول لکشمی نارائن اگر بالتی یا مادھو مانگتے بھی رہتے تب بھی ایک سمندر کے پانی میں کمی نظر بھی نہیں آ سکتی تھی! جبھی تو اُس نے اِس شرط کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا! لیکن اسی شرط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے پانچویں دن کے اختتام تک انعام کی رقم فقط اسّی فیصدی کٹ گئی تھی! اور چھٹے دن صبح جب ٹھیکیدار کو یہ اطلاع مل گئی تھی تب اُس پر گویا برق گر پڑی تھی!

ہُوا یوں تھا کہ نئے گھر کے آرام دِہ ماحول میں نہ تو ان کو ایک دوسرے کو چھوٹی چادر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جاگنا پڑا تھا! اور نہ وہ ایک خیمے کے اندر بوجھل آنکھوں کو آہٹ یا چاپ کی آوازیں سن کر کھلی رکھنے کی ضرورت تھی! اس لیے وہ پہلی بار کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گئے تھے! پھر شام کو اچانک چار سُو پھیلے سنّاٹے میں، تاریکیوں کو چیرتی ہوئی، نظر نہ آنے والے جنگلی جانوروں کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ لرز اُٹھے تھے! پھر مدد کے لیے پہلی صدا دے چکے تھے!

جواباً ان کو بار بار اور ہر بار یہ بتایا گیا تھا کہ گھر کے اِردگرد جو خاردار تار کی دیوار بنائی گئی ہے اُس میں برقی دوڑ رہی ہے اس لیے کوئی بھی جنگلی جانور یا درندہ جان بوجھ کر یا اتفاقاً قریب آنے کی کوشش کرنے والا شکاری بھی برق کے جھٹکوں کی شدت سے ڈر کر بھاگ جائے گا!

گویا جو اطلاع ایک بار مل کر باقی سوالات کو خارج کر سکتی تھی، میاں بیوی کی معصومیت اور فوری طور پر مدد نہ ملنے کی وجہ سے ایک سے پانچ مختلف خدشوں کی شکل میں آ گئی تھی! جیسے تیار کھانے کے ڈبوں کو کھولنے کے لیے، ڈبوں کو گرم کرنے کے طریقوں کے بارے میں، یا ویڈیو دیکھنے کے بارے میں وہ ایک مدد سے جڑے ہوئے کئی سوالات پوچھ پوچھ کر مدد مانگ کر وہ ناظم کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے انعام کی رقم کو کم کرتے رہے!

دراصل ناظم کے نہایت نرم رویّے میں دیے گئے جوابات میں دونوں کو مسیحائی تاثرات محسوس ہوتے رہے! بلکہ وہ خود ہی ناظم کو یہ بتا چکے تھے کہ جب وہ مندر میں پھنس گئے تھے تب وہ بھگوان سے مدد مانگتے رہتے تھے! ناظم ان کی کیفیت بھانپ کر بھی، معاہدے کی شرائط کے تحت روک ٹوک نہیں سکتا تھا!

اُس روز ٹھیکیدار کو اپنی غفلت کا احساس تو ہوا تھا مگر کیا کر پاتا!

وہ ٹوٹے دل سے دعائیں کرتا رہا کہ میاں بیوی ناظم سے مدد نہ مانگ لیں! اور کوئی ایسا کرشمہ ہو جو رقم ایک لاکھ ڈالر سے کم نہ ہو جائے! ورنہ معاہدے کے مطابق اُس نے جو میاں بیوی کو دینا ہے اس کے لیے اس کو اپنے اثاثے بیچنے پڑیں گے! کہیں اُس کو لینے کے دینے نہ پڑیں!

لیکن بھگوان نے اس کی فریاد سن لی اور ناظم نے ساتویں دن مقابلے کو ختم کر کے میاں بیوی کو ٹھیکیدار کے سپرد کر دیا ہے اور ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا یقین دلایا ہے!

آج اُس نے اپنے بینک سے، اپنے بھٹّے کے لیے قرضے کی رقم کو، مکمل طور پر نکال کر چیک لینے کی تقریب کو رنگین بنانے کے لیے، خرچ کیے ہیں! یہ سوچ کر کہ رقم توقعات سے بہت کم ہے مگر لاگت کے حساب سے بہت زیادہ!

ایک طویل انتظار کے بعد ناظم آ چکا ہے! اس کے ساتھ پولیس ہے اور پولیس کی گرفت میں، آنکھوں پر کالی پٹّی باندھے ہوئے ایک نوجوان ہے جو چلاّ چلاّ کر یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایک سڑک چھاپ غنڈہ ہے کوئی دہشت گرد نہیں ہے! اُس نے ایک اجنبی کے کہنے پر دس ہزار روپے لے کر، اُسی کا دیا ہوا ایک بارود کا ایک گولہ، اُسی کی دکھائی گئی جگہ پر، پھینک چکا ہے!

پولیس نوجوان کے دعوے کو اُس صورت میں قبول کرنے کا یقین دلا چکی ہے اگر وہ اجنبی کو پہچان سکے!

ناظم تذبذب میں ہے کیونکہ اگر نوجوان ایک دہشت گرد نہیں ہے تو ٹھیکیدار کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے تحت وہ ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا پابند نہیں ہے! گویا حالات کی کروٹ ایک متاثر کن واقعے کو جنم دے سکتی ہے!

اچانک قریب سے نوجوان کو پہچان کر، اُس کی آنکھوں سے پٹّی ہٹانے سے پہلے، یعنی اپنی شناخت کرانے سے پہلے ٹھیکیدار اپنے ہی بوجھ سے زمین پر گر پڑا!!

OO

شرم

ایسا پہلی بار ہوا تھا! ایرا کے والدین، اس نئے شہر کے نئے گھر میں اُس کی جنم دن کی پارٹی کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور وہ بھی ویسے جیسے دَبے دَبے انداز میں نوحہ خوانی کر رہے ہوں!

ہوا یوں تھا کہ ڈاکیہ نے مبارک باد کے پیغامات کے ساتھ ایک خط بھی دیا تھا جو ایرا کے چھوٹے بھائی نے نہ صرف کھولا تھا بلکہ پڑھ کر اپنے والد کو دیا تھا!

خط ان کے آبائی شہر سے آیا تھا اور ان کے ایک دُور کے رشتے دار نے لکھا تھا! خط میں ہمدردی کی چاشنی کے ساتھ اُس کڑوے سچ کا ذکر تھا جس کی وجہ سے ایرا کا باپ اپنا آبائی شہر چھوڑ کر اس شہر میں رہنے آیا تھا! اس لیے ایرا کے والدین بار بار خط پڑھ کر ہر بار یہی بڑبڑا رہے تھے کہ وہ تو ایک بھیانک حادثہ تھا، کہیں اب وہ ان کے بچوں کے لیے عمر بھر کا سانحہ نہ بن جائے!

ایرا کو پہلے غصہ آیا تھا خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کا چھوٹا بھائی بھی پارٹی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا! پارٹی ختم ہوتے ہی جب ایرا نے اپنے والدین کو دیکھا تب وہ ایک گرم پانی کے چشمے کی طرح اُبلنے لگی مگر جونہی اس نے اپنے والد کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے خط چھین کر پڑھا تو جم کر برف بن گئی! بالکل ویسے ہی جیسے سات سال پہلے وہ ایک اجنبی کا چہرہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی! برف پگھل کر یادوں کی تپش میں سما گئی تو اُس حادثے کے دُھندلے دُھندلے عکس اُبھر کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے! تب ایرا کی عمر تقریباً نو سال تھی! اُس روز اگر اُس کی اسکول کی بس چھوٹ نہ گئی ہوتی تو وہ کب کی اسکول جا چکی ہوتی!

ماں اس کے چھوٹے بھائی کو اپنی نیک پڑوسن کے گھر چھوڑ آئی تھی کیونکہ وہ بیمار تھا اور وہ ایرا کو آٹو میں اسکول چھوڑنے کے لیے تیار کر رہی تھی جب اُس نے دوسری پڑوسن کی چیخ سُنی تھی! وہ بے چاری اپنے شرابی شوہر کے عتاب کا شکار ہو کر ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی اور ایرا کی ماں اس کو اپنے شوہر کی نازیبا گرفت سے چھڑانے کے لیے دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی!

ایرا بھی اس کے پیچھے بھاگ کر پہنچ گئی تھی! تب جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اب وہ سمجھ رہی تھی! وہ بھی یادداشت کی مدھم روشنی میں!

ایرا کی ماں نے اس کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر گھر لوٹ جانے کی سخت تاکید کی تھی اور وہ خوف زدہ ہوکر اپنے گھر کے کھلے دروازے تک پہنچ بھی گئی تھی مگر ایک اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر خوف زدہ اِس لڑکی نے بھی مسکرا کر کہا تھا! ''میرے پاپا سے ملنے آئے ہو تو وہ ملیں گے نہیں! وہ تو دفتر گئے ہیں! ماں بھی گھر میں نہیں ہے، منا بھی نہیں!''

اجنبی یہ سن کر نہ صرف مسکرایا تھا بلکہ ایک گڑیا ایرا کے ہاتھ میں تھما کر بہت ہی پیار سے اس کو گود میں اُٹھا کر یہ کہہ کر کہ وہ اس کی ماں کا انتظار کرلے گا، اُسے گھر کے اندر لے گیا تھا! ایرا کو یہ اچھا لگا تھا اور اُس کے دماغ میں ڈر کی بھیانک شکل، جو اس نے اپنے پڑوس میں دیکھی تھی وہ مٹ گئی تھی! تب ایرا کھلکھلا کر ہنس کر بولی تھی ''آپ میرے پاپا کی طرح مسکراتے ہو!''

لیکن اگلے ہی لمحے ایرا اجنبی کی خوف ناک شکل دیکھ کر چلائی تو تھی مگر اس کی ماں تب لوٹی تھی جب اجنبی ایرا کو بے ہوشی کی حالت میں لہولہان کر کے چلا گیا تھا! ایرا کے سامنے چند مناظر کے عکس آتے رہے اور کیا کچھ ہوا ہوگا وہ سمجھ کر اُس کی روح کانپ رہی تھی! گویا سات سال پہلے کا درد رفتہ رفتہ کرب کی شکل اختیار کر رہا تھا! اُس حادثے کے بعد جب ایرا کو ہوش آیا تھا تب وہ اسپتال میں ایک لوہے کے پلنگ پر ایک لال کمبل اوڑھ کر لیٹی تھی! کئی دنوں تک شناسا و غیر شناسا لوگ اس کو پیار کے علاوہ تحائف دیتے رہے! اور وہ جب اپنی ماں سے پوچھا کرتی تھی کہ ڈاکٹروں کے علاوہ پولیس والے اور انجانے لوگ کیوں اُس سے ملنے کے لیے آتے ہیں تب بے بس ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کو ایک ہی جواب دیا کرتی تھی ''تمھارا نام ایرا ہے نا اس لیے! معلوم ہے ایرا سرسوتی بھگوتی کا ایک نام ہے! سرسوتی کی اُن پر کرپا ہو! اس لیے تو، معلوم ہے وہ سب تمھیں گھر میں بھی یاد کرتے رہتے ہیں! سرسوتی وندنا کا ریاض بھی کرتے ہیں! ماتا سرسوتی! شاردا!'' اور یوں ماں بیٹی کو سلا دیتی تھی!!

ایک روز ایرا نے ماں سے پوچھا تھا کہ یہ Child Abuse کیا ہوتا ہے؟ تو گھبراہٹ پر مشکل سے قابو پا کر اس نے کہا تھا کہ Child کے معنی بچّہ اور Abuse کے معنی گالی! مطلب بچوں کو گالیاں نہیں دینی چاہئیں! ایرا کو جب یہ بات یاد آئی تب اُس کو احساس ہوا کہ اُس کی ماں پر کیا گزر چکی ہوگی سات سال پہلے! ایک معصوم بچی کو جھوٹی تسلیاں دے کر! سوزِ نہاں سے راکھ ہو کر!

پھر ایرا جب دس سال کی تھی تب پولیس اُس راکھشس کو گرفتار کر کے اس کے سامنے شناخت کے لیے لائی تھی، وہ خوف زدہ ہو کر چیخ پڑی تھی اور وہ شاید کہہ دیتی کہ اُس نے کیا کیا تھا مگر ماں نے بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے ہی نہیں دیا تھا!

سولہ سال کی ایرا اُس حادثے سے جڑے ہوئے واقعات کو یاد کر کے سمجھ گئی تھی کہ کیوں اُس کے والدین پولیس والوں، میڈیا والوں اور ہمدردوں کو بھی دس سال کی ایرا سے سوالات کی بوچھاڑ نہ کرنے کے لیے ہاتھ جوڑ رہے تھے! کیوں ایرا کا نام طرح طرح کے لوگوں کے زبان پر آتا رہتا تھا! ایرا کی ماں، ایرا کے پتا جی، ایرا کا محلّہ، ایرا کی بس، ایرا کا کیس! ایسا کیوں کہا جاتا تھا یہ گیارہ سال کی ایرا تو جان نہیں سکتی تھی لیکن آج وہ ہر واقعے کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی! وہ راکھشس کیوں اپنے غنڈوں سے اُس کے گھر فون کر کے دھمکیاں دیتا رہتا تھا، یہ سب وہ خط میں لکھی ہوئی سطور کے درمیان یعنی Between the Lines پڑھنے کی بجائے سمجھ گئی تھی اور بہت ہی ذہین ہونے کی وجہ سے جان گئی تھی کہ ایک حادثہ جب خاندان کے لیے ایک سانحہ بن گیا تھا تب اُس کے باپ نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں اپنے مَن پسند آبائی شہر سے ہجرت کی تھی!!

نئے شہر میں ایرا خوش تھی! نئی سہیلیاں، نئے حالات اور سازگار واقعات نے ان کو خوشیاں ہی خوشیاں دی تھیں! اور آج کی جنم دن کی پارٹی بھی ان خوشیوں کا حصّہ تھی مگر ایک خط نے گویا سورج پر گرہن لگا کر اُجالوں کو دبوچ ڈالا تھا! ایرا کو پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے نام سے عدالت میں ایک کیس چل رہا تھا، اس کا فیصلہ سات سال کے بعد اس لیے ہوا تھا کیونکہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے میں ایک سیاست داں کا اہم کردار ہے! وجہ یہ ہے کہ مجرم اس کے سیاسی حریف و ذاتی دشمن کا اِکلوتا بیٹا ہے!

نچلی عدالت نے مجرم کو سات سال کی قید کا فیصلہ سنایا ہے! ایرا اپنے چودہ سال کے چھوٹے بھائی کو یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ اُس کی بہن مظلوم ہے مگر بھائی کی نفرت بھری نگاہیں بہن کو مجرم سمجھ کر شرم سے جھک گئی تھیں! ایرا بھائی کی شکایت کرنے جب اپنے والدین کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تب وہ چٹھی بار بار پڑھ کر اس بارے میں دونوں بڑبڑا رہے تھے اور ایک دوسرے کو بتا رہے تھے:

''سیاسی آدمی ہے ہائی کورٹ میں بری بھی ہو سکتا ہے!''

''آج نہ سہی سال دو سال بعد سہی!''

''بے گناہ اور معصوم لوگوں کے جسموں کو لہولہان کرنے والے دہشت گردوں کے لیے نیا قانون پوٹا! مگر معصوم بچیوں کو مسل دینے والے Rapists کے لیے وہی پرانے قانون!''

''ایسے خونخوار درندوں کو عمر قید کی سزا ملنی چاہیے!''

''پھانسی کی سزا کیوں نہیں تا کہ عبرت ہو!''

''ہماری بیٹی کو تو عمر قید کی سزا مل گئی ہے!''

''ہمیں بھی! کیا ہم کسی سے نظریں ملا سکیں گے؟''

''ہمیں اپنے بچوں کو جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لے کر اس سانحے کو عمر بھر کا المیہ نہ بنا دینے کا مشورہ دینا چاہیے!''

''شاید اُس کی ضرورت ہی نہ پڑے! اس شہر میں ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہیں ہے! کیا ایرا صرف ہماری بیٹی کا نام ہے؟''

ایرا یہ سن کر اپنے کمرے میں چلی گئی! جب اُس کے والدین اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھانے گئے تب دونوں چیخ پڑے! ایرا پنکھے کے ساتھ لٹک کر جھول رہی تھی! اُس کی بند مٹھی میں ایک چٹھی تھی جس میں ایرا نے فقط اتنا لکھا تھا کہ میں جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لے کر عمر قید تو کاٹ سکتی ہوں لیکن اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے آنکھیں جھکا کر زندہ نہیں رہ سکتی ہوں!

کاش ہم سب اس درندگی کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکتے! شرم ہماری کمزوری بن جانے کی بجائے ظالم کی گردن پر ایک ایسا بھاری بوجھ بن جاتا جس سے اس کی گردن دنیا کے سامنے جھک کر کٹ جاتی! ایسا ہو گا نہیں اس لیے شرم سے میری ہی گردن جھک گئی ہے!

یہ میرا اپنا مقدمہ تھا
میں ہی ملزم تھی
میں ہی وکیل تھی
میں ہی جج تھی
مگر قانون اس جہاں کا ہے!!
اگر بدلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!!

OO

ڈرپوک

آج پھر ممّی اور ڈیڈی میں جھگڑا ہوا! واہ! واہ مزہ آ گیا!! آج میں اپنے کمرے میں اکیلا نہیں سوؤں گا! ممّی بھی میرے ساتھ سوئے گی! تبھی تو مزہ آئے گا! مگر یہ ممّی ڈیڈی سے کیوں لڑتی رہتی ہے؟ اُف میرا تو سر پھٹ گیا — ! یہ ڈیڈی بھی تو اچھے نہیں ہیں! خوب مارتے ہیں ممّی کو! وہ ہیڈ ماسٹر تو نہیں ہیں؟ کیوں مارتے ہیں —؟ ہاں — ! ہاں سمجھا! ممّی نے کام نہیں کیا ہوگا؟ مگر ممّی تو اسکول جاتی ہی نہیں! پھر ناخن نہیں کاٹے ہوں گے؟ اس لیے! مگر نہیں نہیں!! ممّی کے ناخن کتنے پیارے پیارے ہیں! لال لال! ممّی کے گال بھی تو لال ہیں! ہونٹ بھی!! ہائے میری ممّی کتنی اچھی ہے!! بہت اچھی تو ہے! مگر مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں سونے دیتی؟ بُری ہے — ! نہیں؟ — اچھی ہے! آج سلائے گی نا؟ ڈیڈی کے ساتھ جھگڑا جو ہوگیا ہے! واہ واہ تبھی تو مزہ آئے گا! ممّی ڈیڈی روز روز لڑتے رہیں تو بہت اچھا ہے! مگر ٹیچر کہتی ہے جو لڑتے ہیں. جھگڑتے ہیں وہ گندے ہوتے ہیں! میرے ممّی ڈیڈی بھی گندے ہیں؟ اُف — ! میرے دوستوں کو پتہ چلا تو —؟ ہوں! کیسے پتہ چلے گا؟ میں ان کو بتاؤں گا ہی نہیں! جھوٹ بولوں گا؟ نہیں! نہیں! کوّا نہیں کاٹے گا! میں چپ رہوں گا! مگر؟ مگر! یہ پپّو بڑا چغل خور ہے! ہا، ہی ہی! وہ بھی کیسے بتائے گا؟ بیمار ہے! ہاں روتا رہتا ہے! روتا رہے، بلکہ وہ بیمار ہی رہے تو اچھا ہے — ! اگر سونو نے کہا تو؟ کیسے کہے گا؟ وہ انگوٹھا چوستا رہتا ہے! تبھی تو وہ بول نہیں سکتا! چھوٹا ہے نا — ! بہت چھوٹا — ! ممی کہتی ہے کہ میں بڑا ہو گیا ہوں! دیکھو تو کتنا بڑا ہو گیا ہوں — ! ارے ماں! جتنا بڑا — ! مگر مجھے، پھر ڈر کیوں لگتا ہے؟ نہیں نہیں! میں ڈرپوک نہیں ہوں! ممّی کہتی ہے کہ میں بہادر ہوں! دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں نا! مگر وہ کالا کتّا؟ اری ماں! جب وہ بھونکتا ہے تو کمرے میں اندھیرا کیوں چھا جاتا ہے؟! یہ بجلی کیوں بند کر دیتا ہے؟ ہوں! آج جب وہ وف وف کرے گا! اوں اوں کرے گا! تب میں اس پر پتھر ماروں گا! پتھر کہاں سے لاؤں؟ میں نے تو وہ باہر پھینک دیا ہے! تب کیا ہوگا —؟ آج ممی جو میرے ساتھ ہے! کتّا مجھے سمجھتا کیا ہے؟ ڈرپوک! میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا! کیوں ڈروں؟ مگر وہ ڈاین — اوی! اوی!

ما، ماں—؟ وہ ڈاین رات بھر چھت سے جھانک جھانک کر کیوں دیکھتی رہتی ہے مجھے؟ وہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے نا—! مگر کیوں—؟ ہوں! آج جب وہ آئے گی تب میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا!!!—ہاہا—! ہو! ہو! ہو! ہو—اندھی ہو جائے گی ڈائن! وہ بہت بری ہے! رات کو میرا لحاف اُٹھا کر فرش پر گرا دیتی ہے! میں سردی سے ٹھٹھر جاتا ہوں! اور خود بھاگ جاتی ہے! یہ ڈائن وہی ڈائن ہوگی جو بچے پکڑ کر لے جاتی ہے! تھیلے میں ڈال کر؟ اوی ماں—! مگر یہ ڈائن کمرے میں کیسے داخل ہو جاتی ہے! اُدھر سے کھڑکی کا شیشہ بھی اس نے توڑا ہوگا! مگر آج ذرا آنے تو دو اُسے! میں اُسے پکڑ کر رسّی سے باندھ دوں گا—! اور پھر میں—میں ہی کیوں؟ ممّی بھی تو مارے گی اُسے—! نانی یاد آئے گی اُس کو—!! اُف—! مجھے نانی ماں کی کیوں یاد آتی ہے—؟ مر گئی! اس سے یہ ڈائن ڈرتی تھی! تب نہیں آتی تھی! ممی سے بھی تو ڈرتی ہوگی یہ ڈائن؟ مگر وہ دوسرے کمرے میں سو جاتی ہے! مگر آج تو میرے ساتھ سو جائے گی! ڈیڈی کے ساتھ کُٹّی جو ہو گئی ہے! آج ہم ڈائن کو مرغا بنا دیں گے! واہ واہ—! بڑا مزا آئے گا! ہا، ہو، ہو، ہو!!

واہ—! آج تو مزہ آ رہا ہے! ممّی کا لحاف کتنا گرم ہے! ممّی کوئی ربڑ کی بوتل تھوڑی ہی ہے جو ٹھنڈی ہو جائے گی! ارے واہ ممّی کتنی گرم ہے! ہوں! برف گرتی رہے مجھے کیا—! آج سے تو ممّی میرے ساتھ چپٹ کر سو جائے گی! یوں چمٹ کر—! ممّی کیا میری اپنی ممّی نہیں ہے؟ سوتیلی ہے! ہے—! وہ ببلو جھوٹ بولتا ہے! میری ممّی مجھے چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جائے گی! میں ممّی کو کہیں بھی جانے نہ دوں گا! پکڑ کر رکھوں گا! باندھ کر رکھوں گا! کیسے جائے گی پھر—؟ قصور ڈیڈی کا ہے! ڈیڈی بُرا ہے، بہت بُرا—ممّی کو مارتا رہتا ہے—! ممّی روتی کیوں نہیں—؟ ہاں آج ڈیڈی روئے گا! کمرے میں اکیلے ہی سونا پڑا ہے نا! آج وہ ڈائن جب یہاں ممّی کو دیکھ لے گی تو بھاگ جائے گی! تب اور مزہ آئے گا! جب ممّی سے ڈر جائے گی نا—ممّی اُس کے بال نوچ لے گی—! اور پھر—؟ وہ ڈیڈی؟ ڈیڈی بھی تو کمرے میں اکیلے ہیں؟ ہوں—! ڈیڈی کو وہ کیسے ڈرائے گی؟ ڈیڈی سے تو ممّی بھی ڈرتی ہے! وہ ممّی کو دبوچ لیتے ہیں! اور پھر ڈیڈی چھوٹے تو نہیں ہیں—! وہ بڑے ہیں! ہمارے پی ٹی ٹیچر جتنے!! وہ ڈرپوک بھی نہیں ہیں! وہ ڈائن کو مار ڈالیں گے! اور کیا! پھر کیوں ڈراتی ہے روز روز مجھے؟ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا—! مار ڈالوں گا!

آہا—ہا—آج تو مزہ آ گیا! مگر—مگر! یہ ممّی کہاں گئی! ممّی! ممّی کو ڈائن کھا گئی کیا—
م،م، ممّی، ممی! تم کہاں گئی ممّی؟ ممّی! ممّی؟ ممّی! ممّی!!—تم یہاں ہو! پھر آ گئی یہاں—ڈیڈی کے پاس! ڈیڈی کو ڈر لگتا ہے کیا! ہاہا، ہا! ڈرپوک! ڈیڈی ڈرپوک ہے!!

OO

روبوٹ

بابو جی کو شکایت ہے کہ اس کے اِکلوتے بیٹے نے ان کو ایک بد دماغ نوکر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے! جبکہ رگھو کو یہ گلہ ہے کہ مالک نے اپنے وفادار نوکر کو ایک غیر معقول بوڑھے کے عتاب کا شکار بنا دیا ہے! رہی بات مالک کی تو اس کو ان دونوں پر غصہ آتا رہتا ہے کہ دونوں کے طویل خطوط سکون دینے کے بجائے انتشار پیدا کرتے ہیں! تب ہی تو وہ اپنے پوسٹ بکس میں دو جانے پہچانے لفافے دیکھ کر چونک پڑتا ہے اور خدشات کے دلدل میں پھنس جاتا ہے! حالانکہ ان دونوں کو بے حد خوش رکھنے کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کرتا رہتا ہے! ہر ماہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ ڈرافٹ بھیجتا رہتا ہے! یہاں تک کہ بابو جی کے لیے بلڈ پریشر کی جدید دوائیاں اور رگھو کے لیے بواسیر کی دوائیاں بھیجتا رہتا ہے! مگر پھر بھی آگ بجھتی نہیں بلکہ سلگتی رہتی ہے! اندر ہی اندر روئی کی طرح اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کی تحریر کا ہر لفظ اُدھ جلے گوشت کی مانند نظر آتا ہے! باپ کا خط پڑھ کر اس کی آنکھیں غصّے سے لال ہو جاتی ہیں اور رگھو کا خون پی جانے کو جی چاہتا ہے مگر اگلے لمحے جب وہ رگھو کی روداد پڑھ لیتا ہے تب بابو جی کو سختی سے ٹوکنے کو جی چاہتا ہے! مگر گزشتہ دو برسوں سے نہ تو وہ کسی سوال کا جواب دے پایا ہے اور نہ ہی کوئی جواز پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے! یوں وہ چاہنے نہ چاہنے یا کے بھنور میں پھنس کر دن کا چین اور راتوں کا قرار کھو بیٹھا ہے! آج بھی جب اس نے اپنے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھول کر وہی جانے پہچانے لفافے دیکھے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کھڑکی کھولتے ہی کسی تنور سے نکلتے ہوئے شعلوں نے اس کے چہرے کو جھلس دیا ہو! کچھ گھبرا کر اور کچھ خوفزدہ ہو کر اس نے کھڑکی بند کر دی مگر پھر بابو جی کی یاد نے اسے پریشان کر دیا اور اس نے وہ دونوں لفافے پوسٹ بکس سے نکال لیے اور خلاؤں میں گھورنے لگا!

ایک خط بابو جی کا تھا اور دوسرا رگھو کا! ایک انگریزی میں اور دوسرا ٹوٹی پھوٹی ہندی میں! وہ جانتا تھا کہ بابو جی نے کیا لکھا ہوگا! یہی کہ رگھو مجھے بہت تنگ کرتا رہتا ہے! جان بوجھ کر اذیتیں پہنچاتا

رہتا ہے! بات بات پر ذہنی تناؤ پیدا کرتا رہتا ہے! چائے نا مانگ لوں تو دھوکے سے دودھ میں بورن وِٹا ملا کر پلا دیتا ہے! کھانا مانگ لوں تو وہ شوربہ سامنے رکھ کر چلا جاتا ہے! چاول مانگ لوں تو وہ روٹیاں کھلانے کے لیے بضد رہتا ہے! کشمیری نمکین چائے پینے کی تو حسرت ہی رہ جاتی ہے! اور کم بخت اب قہوے میں بھی شکر نہیں ڈالتا! کچھ کہہ دوں تو جوابی حملہ کر دیتا ہے اور چپ رہوں تو میرا انداق اُڑانے کے لیے فوراً ڈاکٹر کو بلا کر لے آتا ہے! صبح سویرے پوجا کرتے وقت اگر اتفاقاً میری آنکھ لگ جاتی ہے تو یہ راکھشش جانے کہاں سے نمودار ہو کر میری نبض ٹٹولنے لگتا ہے! شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ میں زندہ ہوں یا مُردہ! شام کو سیر کے لیے نکلوں تو یہ ظالم کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کرتا ہے! یا پھر دن بھر کچھ کام کرنے کے بجائے تمھاری بھیجی ہوئی ویڈیو فلمیں دیکھتا رہتا ہے! کیا وہ یہ سب کرنے کے بجائے درختوں کی شاخ تراشی نہیں کر سکتا؟ مجھے اس کو دیکھتے ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے! سانس لیتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میرے دل پر خاردار تار چلائے جا رہے ہیں! یہی حالت رہی تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا بیٹے!

رگھو نے کیا لکھا ہوگا؟ وہی پرانی باتیں دُہرائی ہوں گی اُس نے بھی لکھا ہوگا کہ بابو جی کو شکر کی بیماری ہوگئی ہے! اُن کا بلڈ پریشر بھی ٹھیک نہیں ہے! آپ کی بھیجی ہوئی شوربے کی گولیاں گرم پانی میں ڈال دیتا ہوں تو یہ کہہ کر ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں کہ میں دھوکے سے ان کو جلاب کی گولیاں دے رہا ہوں! فرج کا پانی پلا دوں تو مٹکے کا پانی طلب کرتے ہیں! ڈاکٹر پرہیز کی تاکید کر رہا ہے اور بابو جی بے ذائقہ کھانا کھا کر بوکھلا جاتے ہیں! کبھی تھالی تو کبھی کھانا میرے سر پر دے مارتے ہیں! آپ کی بھیجی ہوئی بواسیر کی دوائی سے ٹھیک تو ہو گیا ہوں! مگر اب میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگا ہے! ان حالات میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر پاؤں گا! بے شک آپ میری تنخواہ دوگنی کر دیں! تب بھی نہیں!!

لفافے بند تھے مگر اس کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے دو پُرانے کیسٹ رُک رُک چل رہے ہوں دونوں کو آواز میں درد تھا! تڑپ تھی، فریاد تھی — ایک آہ بھر کر اس نے دونوں لفافے جیب میں یوں رکھ دیئے گویا کسی کینسر کے مریض کی تازہ ترین رپورٹ فائل میں رکھ دی گئی ہو! رات کو اپنے البم کی ورق گردانی کرتے کرتے وہ بے ساختہ رو پڑا تھا! ماضی کی یادیں بابو جی کی قربانیوں کا ذکر کر رہی تھیں! ایک معمولی کلرک کی جدوجہد کی کہانیاں بیان کر رہی تھیں! آج اسی طرح اپنے بابا جی کی بہت یاد آئی تو اس نے لفافے کھول دیئے! اور دونوں کی تحریریں پڑھ لیں! مختصر مختصر تحریریں دیکھ کر

وہ چونک پڑا! پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے دُھند چھٹ گئی ہے! اور تمام مسائل کا حل ایک نئے خوب صورت جزیدے کی طرح نظر آ رہا ہے!

باپ نے لکھا تھا کہ میں تنہائی برداشت کرسکتا ہوں مگر رگھو کی موجودگی نہیں! اگر تم اپنے پرانے لاڈلے کو نہیں نکالنا چاہتے ہو تو اس کو ہدایت دو کہ وہ زبان پر مہرِ خاموش لگا کر میرے ہر حکم کی تعمیل کرے! وہ جب بولتا ہے تو مجھ کو یوں لگتا ہے جیسے اس مکان پر بم گر رہے ہوں!!

رگھو نے لکھا تھا کہ میں آپ کے پتا جی کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا ہوں، مگر کیا کروں وہ چاہتے ہیں کہ وہ بٹن دبائیں اور میں مشین کی طرح چائے لے آؤں! دودھ لاؤں، پھول لاؤں، کپڑے لاؤں، درخت کی شاخ تراشی کروں، نئے پودے اُگاؤں اور اگر ان تمام کاموں میں ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو وہ شہد کی مکھی کی طرح میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور مجھے اپنے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا! مجھے اس قید سے آزاد کیجیے، میرے مالک!

خطوط کو سرہانے رکھ کر وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا! اور بابو جی کے بارے میں سوچتا رہا!

وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتا ہے! مگر مشکل تو یہ ہے کہ بابو جی اپنا گھر چھوڑ کر امریکہ آنا نہیں چاہتے اور وہ خود امریکہ چھوڑ کر اپنے ملک کے کسی دُور دراز علاقے میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا!

درجنوں سگریٹ پھونک کر آخر اس نے اپنے لچک دار فیصلوں اور وسوسوں کو نظر انداز کر کے ایک ٹھوس قدم اُٹھایا! اُس نے رگھو کو آزاد کر دیا اور اپنی بچت کی ساری رقم خرچ کر کے اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کے لیے ایک روبوٹ یعنی مشینی انسان بھجوا دیا!

اس فیصلے سے بابو جی بھی خوش تھے اور رگھو بھی! مشینی انسان بابو جی کے اشاروں پر ناچتا رہا اور بوڑھا روبوٹ کی عجیب نقل و حرکت دیکھ کر یوں مطمئن نظر آتا رہا گویا ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچہ اپنے اِرد گرد چند کھلونے دیکھ کر ہنس پڑا ہو مگر کچھ دیر بعد زار و قطار رونے کی خاطر!!

بیٹا اپنے اس فیصلے سے بے حد خوش تھا! وہ اپنی مشینی زندگی کے دائرے میں دولت بھی سمیٹ رہا تھا اور خوشیاں بھی! اِدھر اس کا بوڑھا باپ ایک بہت بڑے مکان میں روبوٹ کے ساتھ بھی باتیں کرتے ہوئے کبھی ہنستا اور کبھی روتا رہا! وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خطوط بھی لکھتا رہا اور بیٹا بڑے اشتیاق سے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھولتا رہا! بالکل ویسے جیسے ایک پجاری مندر کے دُوار کھول کر بھگوان کے درشن کرنے جا رہا ہو! اب تو بابو جی وہ ساری شکایتیں بھول گئے تھے جن سے وہ

پریشان رہتا تھا! مگر ان کو ایک شکایت اب بھی بدستور تھی کہ رگھو جانے کیوں اَدھ کھلے دروازے سے جھانک جھانک کر بوڑھے کا تماشا دیکھا رہتا ہے!

یوں چند ماہ گزر گئے! اور ایک دن جب بیٹے نے اپنے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھول کر بابو جی کی چٹھی کے بجائے رگھو کی چٹھی دیکھی تو اس کا جسم کانپنے لگا! تھرتھراتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھول کر تحریر پڑھی مگر دوسرے ہی لمحے خط کے سارے حروف دُھندلا گئے!!

رگھو نے لکھا تھا کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا رہا ہوں! اور ہفتے میں تین چار بار بابو جی کو دیکھتا رہا ہوں! وہ خود ہی کھانا بنا کر روبوٹ کو حکم دیتے تھے! کھانا لاؤ، پانی لاؤ، پھول لاؤ، وہ کھڑکی بند کر دو! دروازہ بند کر دو! بجلی بند کر دو! روبوٹ واقعی ایک فرمانبردار مگر خاموش نوکر کی طرح کام کرتا رہتا تھا! مگر پچھلے تین دن سے جب بابو جی نے دروازہ نہیں کھولا اور محلّے میں بدبو پھیلنے لگی تو آج صبح ہم نے پولیس کی مدد سے دروازہ توڑا اور ایک بھیانک منظر ہم لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تھا! اُف! ہم نے دیکھا کہ روبوٹ نے بابو جی کا گلا دَبایا ہوا تھا! اور غالباً وہ بابو جی کے اگلے حکم کا انتظار کر رہا تھا!

یہ خط دس دن پہلے لکھا گیا تھا!!

OO

جواب

نہ تو دادا پارلیمنٹ ہاؤس کا کوئی منفرد شخص ہے اور نہ اس کے دونوں پوتے پارلیمنٹ کے کسی ہاؤس کے ممبر ہیں! پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے سوالات کر کے جوابات کے منتظر رہتے ہیں! دادا پینسٹھ سال کا سبکدوش ہوا، ایک سلجھا ہوا افسر اعلیٰ ہے جبکہ اس کے ذہین پوتوں میں بڑا والا نو سال کا ہے اور چھوٹا سات سال کا ہے! دونوں اسکول سے آ کر اور چھٹی کے دن صبح سے شام تک دادا جی کے کمرے میں، دادا جی کی قربت کی وجہ سے تو نہیں مگر اپنی پسند کے سلسلے وار کارٹون پروگرام دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے دادا کی نوک جھونک روک ٹوک، غصّہ یا پیار سے سمجھانے کے باوجود وہ نہ ٹیلی ویژن کی چینل بدل کر دادا جی کو نیوز چینل دیکھنے کا موقع دیتے ہیں اور نہ روٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر کھلونوں سے کھیلتے ہیں یا پڑھائی کرتے ہیں!!

دادا اور اُس کے دونوں پوتے اپنی ضد پر قائم ہیں! بچوں سے قربانی کی توقع تو نہیں کی جا سکتی ہے حالانکہ کارٹون دیکھ دیکھ کر وہ بھی اپنے دادا کی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں یعنی وہ اپنی میٹھی آواز میں، ''تم اب بچ نہیں سکتے، میں تمھیں نیست و نابود کر دوں گا!'' اور پھر ایسے مکالمے سن کر دادا کو زبردست غصّہ تو آتا ہے مگر مکالمے سن کر نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس کو نیوز چینل دیکھنے نہیں دیتے!!

دادا جانتا ہے کہ آج کل کے بچے روبوٹ کی طرح وہی کرتے ہیں جو اُن کو سکھایا جاتا ہے یا پھر وہ بندروں کی طرح وہی کرتے ہیں جو وہ دیکھ لیتے ہیں! خاص طور پر ٹیلی ویژن پر کارٹون فیچر، سیریل اور فلمیں دیکھ کر! لیکن ان بچوں کے بدلے تیور دیکھ کر بوکھلا نہیں جاتے! سچ تو یہ ہے کہ ان کی روک ٹوک میں ان کی اپنی غرض مندی یا خود غرضی بھی کہا جا سکتا ہے پوشیدہ ہے! پوتوں کو کارٹون دیکھنے کا چسکہ لگ گیا ہے جبکہ دادا کو دنیا میں ہو رہے واقعات سے بدل رہی صورتِ حال جان لینے کا چسکہ ہے! ظاہر ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے پوتوں کو یوں سمجھتا ہے گویا وہ اُس کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں یا اس کے خلاف ایک نیا منشور لے کر الیکشن لڑ رہے ہیں! ایسے بہکے بہکے حالات کے دباؤ میں دادا نے آج ٹیلی ویژن کا ریموٹ اپنے پاس رکھ لیا ہے اور وہ اپنے پوتوں سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہے اور وہ بھی ایک ایسی حکمتِ عملی کے ساتھ جس میں جذبات کی

چاشنی بھی تھی یعنی اگر دادا کے ساتھ پوتوں کا ٹکراؤ ہوتو ان کو سزا دینے کے لیے کارٹون چینل کاٹ دیا جائے اور اگر فرماں برداری کی سفید جھنڈی دکھائی جائے تو پوتوں کو چند سبق آموز پروگرام دیکھنے کی اجازت دی جائے! مثلاً چوہے بلّی کے کھیل، رامائن وغیرہ! مگراس سے پہلے کہ پوتے صبح سویرے دادا کے کمرے میں داخل ہو کر ٹی وی پر نیوز چینل دیکھ کر اعلانِ جنگ کر دیتے اور دادا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے، پوتے بھی دلچسپی سے نیوز دیکھتے رہے!

دادا کے دل کی بات دل میں ہی رہی اور وہ نیوز کے حوالوں سے ان کو کولمبس، واس کوڈے گاما وغیرہ کے بارے میں چوکنا کر دینے والی باتیں بتاتے رہے لیکن دونوں پوتے جُنگل بندی کے طرز میں سوال پوچھتے رہے:

''دادو! کیا یہ سب مر گئے ہیں؟''

''دادو! یہ دنگے فساد کیا ہوتے ہیں؟''

''دادو! ہم ہندو ہیں یا مسلمان ہیں؟''

''دادو! ہم برہمن ہیں یا ہریجن؟''

''دادو! ہم سیکولر ہیں یا فرقہ پرست؟''

''دادو! ہم عراقی ہیں یا امریکن؟''

''دادو! ہم ظالم ہیں یا مظلوم!''

''دادو! کیا یو کی مان یا ہی مین ہماری مدد کر نہیں سکتے؟''

''دادو! اگر کسی نے ہمیں اِغوا کر کے آپ سے کروڑ روپے مانگ لیے تو آپ دے دینا ورنہ وہ ہمیں مار ڈالیں گے!''

''دادو! ہمیں ڈر لگ رہا ہے!''

دادا اپنے معصوم پوتوں کے منہ سے موجودہ صورتِ حال کی ایک حقیقی جھلک پا کر سکتے میں آ گیا! وہ ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پایا اور پھر چھوٹے پوتے نے دادا کی ڈھیلی گرفت سے ٹی وی کا ریموٹ نکال کر کارٹون چینل لگا دیا اور چوہے بلّی کے کارنامے دیکھ کر یوں کھلکھلا کر ہنس پڑا گویا ایک ندی کا پانی ایک چٹان کو ہٹا کر روانی سے بہنے لگا تھا!

اپنے دادا کو ایک خاموش مینار کی مانند دیکھ کر بڑے پوتے نے دادا کی خاموشی توڑنے کی خاطر گلے سے لگا کر پوچھا ''دادو! ناراض ہو گئے کیا؟'' دادا اس سوال کا بھی جواب نہیں دے پایا!!

OO

دستک

اس کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں اور وہ انتظار کر رہی تھی! مگر آدھی رات کو دستک دینے والا نہ تو اس کا شوہر تھا اور نہ اس کا بیٹا! جو تھا وہ ایک اجنبی تھا! جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ درمیانی عمر میں بھی کم عمر اور بے حد خوبصورت نظر آنے والی خاتون گھر میں اکیلی ہے، وہ دہلیز پار کرنے کی بجائے اُدھ کھلے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر خالدہ کو نہایت ادب و احترام سے اپنائیت کا احساس دلاتے ہوئے اس سے اس کے شوہر کی فنی صلاحیتوں کی باتیں کرتا رہا اور پھر آہیں بھر کر یہ اطلاع دے گیا کہ کشمیری موسیقی کے بے تاج بادشاہ خالد مستانہ کو دہشت گردوں نے لہولہان کر کے سڑک پر پھینک دیا تھا! پولیس اُن کو اٹھا کر اسپتال لے گئی ہے! چونکہ شہر میں کرفیو ہے اور دہشت گردوں کی تلاش جاری ہے! اس لیے وہ بصد احترام اطلاع دینے آیا ہے!!

دروازہ بند کرنے سے پہلے اجنبی یہ وعدہ کر گیا کہ صبح ہوتے ہی وہ اُس کو اپنے اسپتال لے جائے گا!

خالدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی اور یوں محسوس کرتی رہی جیسے وہ اپنے ہی بہائے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب میں ایک کاغذ کے ٹکڑے کی طرح بہتی جارہی ہے!

پھر رات کے آخری پہر جب دستک نے اس کے احساسات کا سلسلہ توڑا تو بے تکلف ہو کر کمرے کے اندر آئے ہوئے نقاب پوش کو دیکھ کر اس کو پل دو پل کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا بیٹا مشتاق گھر لوٹ آیا ہو! مگر جب نقاب پوش نے چہرہ دکھایا تو خالدہ نے اپنے شوہر کے سب سے پیارے شاگرد اشتیاق کو فوراً پہچان لیا! مگر اس کے کندھے پر ان کے من پسند ساز سارنگی کی بجائے بندوق دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی! کیونکہ یہی وہ لڑکا تھا جو اپنے بہت ہی امیر باپ کے کاروبار کو فروغ دینے کی بجائے جرمنی سے لوٹ کر خالد مستانہ سے وحدت کے سبق پڑھ کر کشمیری صوفیانہ موسیقی سیکھ رہا تھا!!

اس سے پہلے کہ خالدہ اشتیاق سے کچھ پوچھتی وہ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھما کر بس اتنی سی بات کہہ گیا کہ خط میں دی گئی ہدایات پر عمل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنا! یہ سوچ کر کہ وقت زندگی کی مدد کا طلب گار ہے!! پھر وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا گیا اور خالدہ کمرے کی مدھم روشنی کو دروازے سے نکل کر باہر کی تاریکیوں میں اپنا وجود کھو کر دیکھتے ہی اس قدر ڈر گئی کہ اس نے دروازے کے اندر سے تالا لگا دیا! اور پھر جونہی اس نے خط کا ابتدائی حصہ پڑھا تو اُسے یوں لگا جیسے کاغذ کا ٹکڑا ہوائی گرداب میں پھنس کر چکّر لگاتے گہرے پانی میں تیرنے کی بجائے ڈوبا جا رہا ہے اور کوئی اس کو پانی کی گہرائیوں کی طرف کھینچتا جا رہا ہے—!! سچ تو یہ ہے کہ خط کی تحریر اس کے ہی آنسوؤں سے ڈوبی جا رہی تھی اور الفاظ سے زیادہ، بدبختی کے الہام، آنے والی آفتوں کی پیشین گوئی کر رہے تھے!!

باپ کو اپنی وراثت پر فخر تھا! جبکہ بیٹا خاندانی نقشِ قدم پر چلنے کی بجائے اپنی تاریخ خود لکھنا چاہتا ہے! باپ موسیقی کو عبادت کا ذریعہ سمجھتا ہے جبکہ بیٹا روایات کو بھی کھنڈروں کی طرح فرسودہ سمجھتا ہے اور گزرے ہوئے کل کو آج سے جوڑنے کی بجائے 'آج' کو کل کی بنیاد بنانا چاہتا ہے! وہ اپنی بہن کے قاتلوں کو مصلحتاً معاف کر سکتا ہے لیکن اپنے باپ کے ارمانوں کا خون کرنے والوں کو مقصد کی خاطر مطلب کو قربان کرنے والوں کا رتبہ دیتا ہے! مگر خالدہ سے نہ بیٹے کی جدائی برداشت ہو رہی ہے اور نہ وہ اپنے شوہر کا کرب دیکھ سکتی ہے!!

خالدہ جانتی ہے کہ دس سال پہلے شہر کی جن گلیوں میں اس کے شوہر کے نغموں کی گونج سن کر ٹریفک تھم جایا کرتا تھا، آج ان گلیوں میں اکثر شام ہوتے ہی کرفیو لگ جاتا ہے! شادمانی کی رونق سمجھا جانے والا کئی انعامات اور اعزازات پانے والا استاد خالد مستانہ دس سال کے مختصر عرصے میں اس قدر نظر انداز ہو گیا ہے کہ اب وہ پھیری والوں کی طرح درد بھرے الاپ سنا سنا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے صدائیں دیتا رہتا ہے! کبھی کبھی تو وہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ہلکے پھلکے نغمے سنا کر اور سڑکوں پر رقص کر کے خود ہی اپنی احمقانہ حرکتوں پر ہنستے ہنستے رو پڑتا ہے! پھر گئی رات تک اپنے کمرے میں اپنی تشنگی مٹا دینے کی خاطر سارنگی بجاتا رہتا ہے یا گنگناتا رہتا ہے! طرزیں وہی اپنا کر جو اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے موسیقی کے قدردانوں کی محفلوں میں وہ فرمائش پر گایا کرتا تھا! مگر الفاظ بدلے بدلے! مفہوم کے تاثر کے ساتھ!

کل رات خالدہ نے اس کو روکا بھی تھا اور گھر چلانے کے لیے نوکری کرنے کی رائے بھی

دی تھی! مگر سینے میں اُٹھ رہے شدّت کے درد کے باوجود وہ گنگنا تا رہا تھا، سارنگی کے تار چھیڑ کر ــــ!!

''دیپک راگ گا کر اپنے نغموں کو جلا دوں؟!''

یا پھر دل کو سلگا کر اپنے سروں کو جلا دوں؟!

آنکھیں موند کر، لب سی کر، تاریکیوں میں کھو جاؤں؟!

''یا پھر اپنی آنکھیں بیچ کر اُجالوں کو لوٹا دوں؟ کوئی بتا دے میں کیا کروں!''

خالدہ نے بوکھلا کر جب اپنے مجازی خدا کو پاگل کہا تھا تب وہ خاموش ہو گیا تھا! لیکن خالدہ کو کیا معلوم تھا کہ وہ سحر ہونے سے پہلے ہی اپنی سارنگی دیوار پر لٹکا کر خاموشی سے نکل جائے گا اور لوٹ کر آنے کی بجائے اسپتال پہنچا دیا جائے گا! تب وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جس کو وہ المیہ سمجھ رہی تھی وہ ایک سانحہ تھا! بوقتِ شام اپنے آنسوؤں کو روک کر جب اس نے خط کا ابتدائی حصہ پھر پڑھ لیا تو معلوم ہوا کہ جو اس نے پہلے پڑھ لیا تھا، وہ دراصل پہلے آدمی کی باتوں کا عکس تھا! خط میں یہ لکھا تھا کہ اشتیاق نے اپنے محترم استاد کو اس وقت روکا تھا جب وہ ایک حلف نامہ لے کر اسپتال جا رہا تھا! کیونکہ اس کی ذہنی حالت دیکھ کر اشتیاق اپنی آنکھیں اور گردے بیچ کر خودکشی کرنے کا ارادہ بنا بیٹھا تھا!

خط کے دوسرے حصے میں یہ لکھا تھا کہ چند قدم چل کر محترم استاد منہ کے بل گر گئے تھے! خون کی قے سے سڑک لال ہو گئی تھی! اشتیاق نے جب ان کو اٹھانا چاہا تو وہ اس وقت ابدی نیند سو گئے تھے! چونکہ اُس وقت آس پاس کہیں کراس فائرنگ ہو رہی تھی! اس لیے اشتیاق نے اپنے استاد کے قتل کیے جانے کی خبر زور و شور سے پھیلا دی!

خط میں اشتیاق نے یہ بھی لکھا تھا کہ کسی کو بھی نہ بتایا جائے کہ خالد مستانہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا اور وہ دو تین بار پہلے بھی خودکشی کرنے کی کوشش کر چکے تھے بلکہ یہ بھی نہ بتایا جائے کہ مرحوم کو تپ دق کا عارضہ تھا! ورنہ نہ تو سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپے ملیں گے اور نہ ہی ایک فنکار کو خراجِ عقیدت!

خط کا یہ حصہ پڑھ کر خالدہ پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ چلاتی رہی! اگر مرنے کے بعد وارث کو لاکھ روپے ملتے ہیں تب بھی کاش کسی کراس فائرنگ یا بم دھماکے سے ایک سال پہلے اس کو موت آ گئی ہوتی تو شاید اس کی بیٹی زاہدہ کو سسرال والے جہیز کے لیے نہ مار ڈالتے! وہ سوچتی رہی کہ کیوں نہ وہ اشتیاق ہی سے گولی کھا کر جا سکے کہ ان کے بیٹے مشتاق کو

ایک لاکھ روپے دلوادے! پھر وہ امیر بن کر گھر لوٹ آئے اور اس کے والدین چین سے ابدی نیند سوسکیں! ایک سرد آہ بھر کر اس نے خط کا تیسرا حصہ اس لیے پڑھ لیا تا کہ یہ جان سکے کہ اشتیاق اپنے محترم استاد کی بیوہ سے کب اور کہاں ملنے آئے گا؟

گویا خالدہ وطن پر مر مٹنے والوں کی طرح خود ہی اپنے بیٹے کی خاطر موت کو گلے لگانے کا من بنا چکی تھی یعنی وہ اپنے من ہی من میں اپنے مجازی خدا سے کہہ رہی تھی کہ جانے والے جاؤ میں تمھارے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں!

لیکن خط کے آخری حصے نے خالدہ پر گویا بجلی ہی گرادی!

اشتیاق نے مشتاق کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ وہ اس کا ساتھی ہے اور یہ تاکید کی تھی کہ اس کی گمشدگی کے بارے میں افشا نہ کریں کیونکہ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ وہ بھیا یک بندوق والا ہے تو شاید سرکار ایک لاکھ روپے نہ دے!

صبح ہوئی تو پولیس دروازے پر دستک دیتی رہی اور محلے والے دروازہ کھُلنے کا انتظار کرتے رہے! مجبور ہو کر جب دروازہ توڑا گیا تب خالدہ خود ہی ملک الموت کے دروازے پر دستک دے کر اپنے مظلوم شوہر اور بیٹی کے پاس جا چکی تھی!!

لاش کے پاس ایک مختصر خط تھا!

''آپ کی دستک سننے سے پہلے ہی میں اپنے ضمیر کی دستک سُن چکی ہوں!''

''میرے شوہر کو کسی نے نہیں مارا ہے! مگر ہم دونوں کو موجودہ حالات نے مار ڈالا ہے!''

کاش ذی ہوش امن پسند لوگ مظلوم لوگوں کی دستک سن سکتے ــــ!!

OO

پیاس

سُوکھے کی وجہ سے زمین جل رہی تھی اور زندگی جُھلس رہی تھی! دو بوند پانی کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے گاؤں کے لوگوں کو جب ایک اونٹ والے نے یہ اطلاع دی کہ ان کے گاؤں کے قریب پرانے کھنڈروں میں پانی ہے تو وہ گاؤں لوٹ کر آئے!......!!

اطلاع صحیح تھی! کھنڈر کے تالاب نما نشیبی علاقے میں سُوکھے پتّوں کے نیچے پانی کی ایک تہہ تھی! یہ جان کر گاؤں والے خوشیوں سے جھُومنے لگے! پہلی بار، نہ کسی ہندو نے اس کھنڈر کو پانڈوؤں کے زمانے سے جوڑ کر اور نہ کسی مسلمان نے کھنڈروں کو شیر شاہ سوری کے زمانے سے جوڑ کر پانی پر اپنا حق جمایا بلکہ سب نے ایک ہو کر چند اہم فیصلے لیے! مثلاً یہ کہ پانی کا استعمال کفایت شعاری سے کیا جائے! یکساں طور پر لیا جائے اور سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ اس خبر کو پوشیدہ رکھا جائے تا کہ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی پانی کے حصّے دار نہ بن جائیں! مگر اونٹ والا ہر پیاسے کو اطلاع دے چکا تھا، اس لیے جب گاؤں والے کھنڈر کے اِرد گرد جمع ہو گئے تب وہاں بہت سے پیاسے موجود تھے اور یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ سُوکھے پتّوں کو ہٹایا جائے تا کہ سورج کی کرنیں پانی کی بدبو کو ختم کر دیں! کوئی لڑائی جھگڑے کے حق میں نہیں تھا! اس لیے سب لوگ ایک ہو کر سوکھے پتّے ہٹا کر بہت خوش تھے! وہ اس لیے کہ ایک تو پانی مِل رہا ہے اور اس کے علاوہ چولھے جلانے کے لیے سوکھے پتے بھی!

اچانک سب کی نظریں زرد پتّوں کے نیچے پڑی ایک بچے کی گلی سڑی لاش پر رُک گئیں! گویا بجلی گر گئی اور سب پر ایک جیسی کیفیت طاری ہو گئی! یعنی پُر جوش بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹتے گئے! اور وہ بھی ناک اور منہ پر اپنی بدبودار چادریں رکھ کر! گویا وہ اب سمجھ گئے تھے کہ بدبو کی وجہ بچے کی سڑی لاش تھی! مگر اِرد گرد جمع لوگ ایک بُت کی مانند کھڑی عورت کو دیکھ کر حیران تھے کیونکہ وہ نہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور نہ بدبو سے اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے

دراصل کارآمد سوکھے پتوں اور اس کے بھوکے بچوں کی داستانیں ملتی جلتی جو تھیں! اس لیے وہ سکتے میں آگئی تھی! جیسے زمین کی نچلی تہوں سے بھی پانی کی بوندیں نہ ملنے کی وجہ سے گرمی سے جُھلسا ہوا درخت، ہوا کے جھونکوں سے تھرتھرا رہا تھا ویسے ہی وہ تب تھرتھرا گئی تھی جب اس کا بچہ اس کی خشک چھاتی چوسنے کی کی کوشش کررہا تھا! تب درخت کی شاخیں کانپ رہی تھیں اور پتے گرتے رہتے تھے! بالکل ویسے ہی ایک کمزور ماں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑگئی تھی اور اس کے بچے گود سے پھسل کر گر پڑے تھے! پتّے شاخوں کو دیکھ دیکھ کر اُڑتے رہے اور اُڑتے اُڑتے یہاں اس ویرانے میں پہنچ گئے تھے جبکہ اس کا دودھ پیتا بچہ بلکتا بلکتا، رینگتا رینگتا سُوکھے پتوں کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو رہا تھا! دوسرا بچہ کہاں کھو گیا ہے یہ وہ نہیں جانتی ہے اور اب جان کر کرتی بھی کیا؟؟

لوگ بڑبڑا رہے ہیں— قدرت کے کھیل تو دیکھو! سوکھا پتہ کام تو آئے مگر مردہ بچہ بدبو پھیلائے!! انسان ہو کر بھی، مر کر، انسان کے کام نہ آئے......! اُف اُف!!

یہ سن کر عورت حرکت میں آگئی اور معنی خیز نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتی رہی! کئی دنوں سے تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلتے چلتے اور بچوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے، اس کا حلق سوکھ گیا ہے! اس لیے وہ بول بھی نہیں پا رہی ہے! اگر خون اس کے پاؤں کی جگہ جسم کے کسی اور حصے سے نکل رہا ہوتا جہاں وہ منہ لگا کر چوس سکتی تب وہ اپنے ہی خون سے اپنا حلق تر کر کے اپنے بیٹوں کو آوازیں دیتی! لیکن اب پانی دیکھ کر وہ طے نہیں کر پا رہی ہے کہ پہلے دو گھونٹ پانی پی کر اپنے حلق کو تر کر کے اپنی چھاتی پیٹ کر نوحہ خوانہ کرے یا پہلے اپنے لختِ جگر کے سڑے جسم سے پتے اور کیچڑ ہٹا کر اس کو اپنے سینے سے لگا لے! وہ گویا ایک تماشہ ہے اور لوگ تماشائی ہیں! عورت نے جوں ہی پانی میں اپنے لہولہان پاؤں رکھے! وہ یوں گر گئی ہے جیسے ایک کھوکھلا درخت ہوا کے جھونکے سے گر جاتا ہے! تب کوئی چلانے لگا! ارے دیکھو تو! یہ عورت پیاس بجھانے آئی ہے یا غوطے لگانے!!

OO

دُشمن

عف عف کی آواز جب تکرار اختیار کر گئی تو اس کے قدم رُک گئے! وہ وقت کا طاقتور ترین انسان ہے! ایک ایسا شخص جو دُنیا کے کسی کونے میں فقط ایک انگلی اُٹھا کر یا ہونٹ ہلا کر ساری کائنات کو ہلا سکتا ہے جس کے قدموں کی آہٹ سے زمین کانپ جاتی ہے! پہاڑ تھر تھراتے ہیں اور دریا اپنا بہاؤ بدلنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں!

وہ ایک ایسا شخص ہے جس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹینک نہیں روک سکتے! کیونکہ اس کے پاس طیّارے ہیں! اس کو جنگی طیّارے خوفزدہ نہیں کر سکتے! کیونکہ اس کے پاس طیّارہ شکن میزائلز ہیں!! اس کے پاس طرح طرح کے بم ہیں! آگ برسانے والے، زہریلی گیس پھیلانے والے! ایٹم بم، ہائیڈروجن، بم، کوبالٹ بم! اور اتنی بڑی طاقت کے سامنے ایک کتّے کی کیا حیثیت؟ یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگا! قہقہے لگانے لگا—!

لیکن اچانک کتّے کے بڑھتے ہوئے قدم، نوکیلے دانت، قہر آلود نگاہیں، دیکھ کر اس کے قدم پیچھے ہٹتے گئے! پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے—! بے بس ہو کر وہ ہانپنے لگا! کانپنے لگا اور دوڑتے دوڑتے اپنے بچاؤ کی خاطر جھاڑیوں کے پیچھے، کھوکھلے درختوں کے اندر چھپتا رہا! مگر کتّا ایک آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا! دوڑتے دوڑتے اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کتّے کی رفتار میزائیل سے بھی زیادہ تیز ہے! کتّے کی بھوں بھوں کی آواز بم کے دھماکوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ سے بھی زیادہ بھیانک ہے! موت اس کا پیچھا کرتی رہی اور وہ بھاگتا رہا!!

اچانک کتّا خاموش ہو گیا! ایک نوکیلے پتھر نے ایک ہی وار میں کتّے کا کام تمام کر دیا تھا اور ایک انسان خون سے لت پت کتّے کو دیکھ کر قہقہے مارتا ہُوا سامنے سے گزر کر ایک غار میں گھس گیا!

اپنے تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جب غار میں جھانک کر دیکھا تو صدیوں پرانا انسان اُسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے! غالباً اس لیے کہ اس کے دشمن وحشی درندے تھے! انسان نہیں! اور اُس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے نوکیلے پتھر تھے! بم نہیں!!

○○

زندان

سچ تو یہ ہے کہ مجھے زندگی سے بہت پیار ہے!

حیران ہوں کہ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو زندگی ہی بن گئی ہے ایک عذاب!!

حالات کی ستم ظریفی جینے نہیں دے رہی ہے اور اُمید مرنے نہیں دے رہی ہے!

مجھ سے مت پوچھو کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان؟

پوچھنا ہے تو یہ پوچھو کہ کیا میں ایک انسان ہوں!؟-؟؟

مجھ سے مت پوچھو کہ مجھے یہاں کون لے آیا؟

پوچھنا ہے تو یہ پوچھو کہ مجھے گھسیٹ کر یہاں لانے والا داروغہ زندان تھا؟

یا انسان کا نقاب پہن کر ایک شیطان تھا؟-؟؟

سچ تو یہ بھی ہے کہ مجھے انوکھے زندان میں لاکر پھینک دینے والا ایک نہیں بلکہ بہت سارے لوگ تھے جو اجنبی ہوتے ہوئے بھی جانے پہچانے سے لگتے تھے!-!!

اب مجھے صوفی سنتوں کے حوالوں سے میرے کارِثواب کے عوض مرکر جنت میں جانے کا یقین مت دلادو! کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ جنت ایک تصوّر ہے یا ایک حقیقت، مجھے معلوم نہیں ہے مگر ایک اجنبی حاملہ عورت کو پناہ دے کر مجھے جو سزا مل گئی ہے اس کے حوالے سے یہ بتا سکتا ہوں کہ جہنم کی صداقت کیا ہے!!

ہاں میں اس زندان میں قید ہوں!!

مگر اس انوکھے زندان کی ہر بات نرالی ہے!

یہاں اور بھی قیدی ہیں مگر نہ کسی کا چہرہ نظر آتا ہے اور نہ کسی کی آواز سنائی دے رہی ہے! فقط ان کی موجودگی کا احساس خاموشی کو چیرتی ہوئی سسکیاں ہیں جو گا ہے بگا ہے رُلاتی رہتی ہیں!!

اس زندان میں کھڑکیاں ہیں، دروازے ہیں، دریچے ہیں اور گولیوں سے چھلنی کمزور

دیواروں میں چھید ہیں جن سے سحر کی اُجلی کرنیں یا شام کی ڈوبتی ہوئی شعائیں دن یا رات کی اطلاع دیتی رہتی ہیں! حالانکہ کھڑکیاں اور دروازے ہواؤں کے رُخ اور ان کی بدلتی رفتار سے خود بخود کھل جاتے ہیں یا پھر خود بخود بند ہو جاتے ہیں! کبھی کبھی ایک بھیانک شور سکوت کے عالم کو توڑ کر یلغار کا تأثر پیدا کر دیتا ہے اور کبھی شور اچانک خاموشی میں یوں ڈوب جاتا ہے جیسے ایک جہاز سمندر کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے! مگر باہر دُھند ہو یا دُھواں، دیواریں ان کو اندر آنے سے روک نہیں سکتی ہیں! نتیجتاً کبھی میری نظر دُھندلا جاتی ہے اور کبھی میری آنکھیں یوں باہر آ جاتی ہیں جیسے کسی نے گلے میں پھندہ ڈال کر لٹکا دیا ہو! یعنی کبھی عذاب کا کرب اور کبھی عتاب کی شدت مجھے صدائیں دینے پر مجبور کر دیتی ہیں!

مگر زندان کی بے صدا دیواریں فقط میرے حالِ بد کو یوں دیکھتی رہتی ہیں! گویا ایک کھنڈر کے ٹوٹے مینار اپنے ماضی کے عکس دیکھ رہے ہوں! اس زندان سے قیدی کا فرار ہونا ناممکن تو کیا مشکل بھی نہیں ہے! کیونکہ نہ تو یہاں کوئی نگراں ہے نہ ہی کوئی نگہبان ہے!

یہاں سے نکل جانے کے لیے نہ تو سلاخیں کاٹنے کی ضرورت ہے اور نہ اونچی فصلیں پھاندنے کی ضرورت ہے! نہ جھانسہ دے کر خاردار تار کو ہٹانے کی ضرورت ہے اور نہ سرحد پار کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے!!

نہ مجھے باوقار طریقے سے آزادی دلانے کے لیے تواریخ کے حوالوں کی ضرورت ہے اور نہ کسی منظم جدوجہد کی ضرورت ہے! اس عبرت ناک زندان سے نجات دلانے کے لیے نہ تو مجھے کسی سیاسی اتحاد کے اعتماد کی ضرورت ہے اور نہ مجھے کسی مذہبی جہاد کے اعتقاد کی ضرورت ہے!

مجھے نہ بھڑکیلی تحریروں اور تقریروں کی ضرورت ہے اور نہ فسادات کی تصویریں دُنیا کو دکھانے کی ضرورت ہے! مجھے ضرورت ہے ایسی راحت کی جو میرے اندر دبائے ہوئے چاہت کے جذبے کو ویسے ہی باہر نکال سکے جیسے ایک بیج زمین کی کوکھ سے ایک پودے کی شکل میں باہر آ جاتا ہے اور پھر ایک تناور درخت بن کر آندھیوں کا خود سامنا کرتا ہے!!

مجھے ضرورت ہے ایک ایسے مالی کی جو اُکھڑے اُجڑے گلستان کی بربادی پر آنسو بہانے کی بجائے مرجھائے ہوئے پودوں کی پیار و محبت سے آبیاری کر سکے!

وہ مالی میں خود بھی تو ہو سکتا ہوں اگر کوئی اپنی روحانی یا سائنسی کرشمے سے مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت یا قوت دے!!

اگر ایسا ہوا ہوتا یا پھر ہو جاتا تو میں کب کا اس انوکھے زندان سے نکل گیا ہوتا! لیکن کیا کروں اگر اور مگر کے درمیان بہت دُوریاں ہیں! اب ایک ہی اُمید ہے! وہ یہ کہ میرے بارے میں اپنی فکر کا جلسوس بلکہ ایوانوں میں بھی ذکر کرنے والوں میں کوئی مسیحا بن کر مجھے گود میں اُٹھا کر ہی تو اس زندان سے نکال سکتا ہے! اپنے سینے سے لگا کر! جیسے ایک ماں بچے کو ایک جلتے ہوئے مکان میں کود کر بچالیتی ہے! مگر کیا کوئی میرا بوجھ اٹھا سکے گا؟؟

میں ایک بچہ تو نہیں ہوں نا! نصف صدی پار کر چکا ہوں نا! ہاں میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے دن پیدا ہوا ہوں! بھارت دیش کا ہم عمر ہوں!! مگر فسادیوں نے میری دونوں ٹانگیں کاٹ کر مجھے آدھا آدمی بنا دیا ہے اس لیے میں وہ بوجھ ہوں جس کو چاہتے ہوئے بھی کوئی اٹھا نہیں سکتا! سوچ رہا ہوں کہ شاید کوئی اپاہج پر ترس کھا کر اگر گود میں اٹھا بھی لے تو وہ مجھے کہاں لے جائے گا!؟-؟!

رستم اپنے مردہ بیٹے سہراب کو زندہ کرانے کے لیے اپنے کندھوں پر اٹھا کر مارا مارا پھرتا رہا لیکن آخر ایک دن بوجھ کو اُتار کر اپنی بدبختی پر خون کے آنسو بہاتا رہا!

کالے رنگ کا کپڑا دھونے سے سفید ہوگا کیا؟

یہی تو ایک بوڑھی عورت نے رستم کو کہا تھا اور اس نے اس کی شیطانی باتوں کے اثر میں سہراب کو ۳۹ دن بعد جب زمین پر رکھا تھا تب کہتے ہیں سہراب کی آواز گونج اُٹھی تھی! ابا کاش آپ ایک دن اور انتظار کرتے! تو میں زندہ ہو جاتا! اُف اُف! تب بھی باپ اور بیٹے کو ایک شاطر حکمراں اُفراسیاب نے لڑا کر اپنی غرض پوری کی تھی! آج بھی کسی شیطان نے بھائی کو بھائی کے خلاف اُکسا کر فسادات کروادیئے ہیں! سچ ہے تو اریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے! میرا مسیحا مجھے اس زندان سے نکال بھی دے تو وہ مجھے کہاں لے جائے گا؟ ہاں! ہاں!! میں سمجھ رہا ہوں کہ:

زندان کے اندر بھی حال وہی ہے!
جو زندان کے باہر کا حال!
کون بچائے گا آج کے انسان کو!
جب محافظ ہی بن گیا ہو مہا کال اور گھر ہی بن گئے ہوں زندان!!

عمر قید کی بھی میعاد مقرر رہوتی ہے کیونکہ سزا کے لیے جرم عائد ہوتا ہے مگر کون جانے مجھے اس زندان میں کب تک ایک بے جرم سزا کاٹنی ہوگی!!

OO

گھر

صبح گیارہ بجے:

فلیٹ اچھا ہوتو پسند آ ہی جاتا ہے! میرے بھائی! یہ فلیٹ سوسائٹی والوں نے فقط بڑی فیملی والوں کے لیے بنائے ہیں! یہ فلیٹ فروخت ہوتے ہیں! ہاں یہی کوئی پچاس لاکھ، مگر سنو! کرایہ پر بھی فلیٹ مل جائے گا! دو بیڈرُوم والا چاہیے نا—؟ ہے! ضرور ہے!! بالکل ویسا ہی جیسے آپ نے ابھی دیکھا! کرایہ زیادہ نہیں! دس ہزار روپے تک مل جائے گا! ایک بیڈرُوم کے لیے پانچ ہزار روپے زیادہ ہے؟ پھر فلیٹ کا خیال چھوڑ دو! کمرے کی تلاش کرو! ہوٹل میں یا کسی بستی میں! ارے بھئی! پتہ کسی ٹیکسی والے سے پوچھ لو نا! ہمارے ریٹ سوسائٹی نے مقرر کیے ہیں! ایک کمرہ کہاں سے لاؤں! کیوں ملتجی نظروں سے دیکھ رہے ہو! شہر میں نئے آئے ہو کیا—؟؟

بارہ بج کر پچاس منٹ:

آیئے! آیئے مہربان!! ہم آپ کا تہہِ دل سے سواگت کرتے ہیں! ہاں فیملی کے لیے ہمارے پاس بہت بڑے کمرے ہیں! یہ دیکھئے جنت! چونکیے گا مت حضور اس سیوٹ کا نام جنت ہے! سُنا ہے جنت میں ایک نہر ہے تسنیم! یہاں نہر تو نہیں ہے مگر ٹھنڈک ویسی ہے! دراصل جناب یہ ٹھنڈک کا احساس ہی اپنائیت کا یقین دلاتا رہتا ہے! ورنہ گھر میں اور کیا ہوتا ہے! اپنا پن ہی نا؟ تبھی تو ہمارے ہوٹل کا نام اپنا گھر ہے—! ہوملی کمفرٹ جناب! گھر جیسی سہولیات اور آپ کی تمام خواہشات کا احترام کرنا ہی ہمارا اوّلین مقصد ہے! کرایہ؟ واجب ہوگا! ہا......ہا......ہا...... آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں! کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ؟ مہینے کے نہیں ایک یوم کے دو ہزار روپے! مہینے پر تو کمرہ پُرانی بستی میں بھی ملتا! میں کوئی گائیڈ ہوں جو تمھیں مشورہ دوں! چلو بھاگو یہاں سے! وقت برباد کر دیتے ہیں یہ لوگ!

دن کے ایک بجے:

جی ہاں! مَیں ہی دینوشاہ ہوں ــــ! فرمایئے! اچھا! اچھا لو ٹھنڈا پانی پی لو! اس کڑکتی دُھوپ میں کیوں آئے؟ شام کو آ جاتے؟ میں اور کہیں تو جاتا نہیں! خیر! آپ کو کمرہ چاہیے! کمرے ہی کمرے ہیں! سامان لے کر کیوں نہیں آئے! اور پانی پی لو! ہونٹ سُوکھ گئے ہیں! گھبراؤ نہیں، کرایہ زیادہ نہیں! ۷۰۰ روپے فی کمرہ! ٹھیک ہے نا! سیڑھیوں کے ساتھ ہی تمھارا کمرہ ہے! ہاں ابھی مکمل نہیں ہے پر ہو جائے گا! ساتھ والا کمرہ ایک ماہ میں بن گیا تھا ــــ! چلو دو مہینے سہی! پھر لے آنا اپنی فیملی کو!! اچھا اچھا ماں کو لانا چاہتے ہو؟ دو بھائی اور دو بہنیں! ٹھیک ہے! گزارہ ہو جائے گا! شہروں میں تو وقت کاٹنے والی بات ہے! تب تک! تب تک تم یہاں میرے کمرے میں چارپائی بچھا دینا! ہا...... ہارے بھئی عزیز ہو اپنے! نہیں نہیں! یہ عمارت کارخِ امرا نہیں ہے! تم جیسے لوگوں کا اپنا گھر ہے! بنایا بھی تم لوگوں نے ہے! ایڈوانس؟ ہاں ہاں دیتے جانا! مگر یہ کیا، ۷۰۰ روپے؟ نہیں نہیں عزیز ہزار روپے سے بھی کام نہیں چلے گا! تو کیا تم اپنے کمرے کے لیے پچاس ہزار روپے بھی نہیں خرچ کر سکتے! کمال ہے! دُنیا میں کیسے کیسے لوگ رہتے ہیں! حلق سُوکھ گیا تو میں کیا کروں؟ وہ رہا میونسپلٹی کا نلکہ! شام کو پانی آئے گا! ہوں! بھاگ جاؤ!!

دن کے دو بجے:

دوست! تم تنہا آدمی ہو! ہوٹل میں رہ نہیں سکتے! رقم خرچ نہیں کر سکتے! ترس تو آ رہا ہے مگر کیا کروں! گھر میں بہو بیٹیاں ہیں! ماں، بھائی، بہنیں اس چھوٹے سے کمرے میں نہیں رہ سکتے! مشکل سے تو ایک چارپائی! میاں بیوی کا گزر ہو سکتا ہے! نہیں! نہیں آپ کے سمجھنے میں، اور لوگوں کے کہنے میں بہت فرق ہے! کنوارے کو میں کمرہ نہیں دے سکتا!!

دن کے تین بجے:

اوّل تو فکر نہ کر یار! نئی سرکار اپنی سرکار ہے یار!! ایک عالیشان کوارٹر دلائیں گے یار ــــ! وہ بھی نئی کالونی میں یار ــــ! او بن جائے گی یار ــــ! درخواست لکھ یار ــــ! یہ لے کاغذ یار ــــ! او سگریٹ تو پلا یار ــــ! یار مَیں خالی چائے نہیں پیتا ــــ! کھانا نہیں کھایا تو کچھ اور منگوا لے یار ــــ! آملیٹ منگوا دے یار ــــ! او تو فکر نہ کرنا یار! تو اکیلا تو نہیں ہے ــــ! مَیں تیرے ساتھ ہوں!!

دن کے پانچ بجے:

بابو جی گھر گھر والوں سے ہوتا ہے! ورنہ ایک مکان ہوتا ہے! ہے کہ نہیں؟ مکان شان دار کیوں نہ ہو! عالی شان کیوں نہ ہو! لیکن گھر نہیں ہوسکتا! یہ دیکھو بابو جی! یہ رہا آپ کا گھر! ابھی کنوارے ہونا — ؟ ارے شامو دلاّل کی نظریں ایکسرے اُتار لیتی ہیں! کہو کمرہ ٹھیک ہے نا؟ ارے کمال کرتے ہیں آپ بابو جی! برسات کا پانی اندر آ بھی گیا تو کیا ہوا! کم بخت برسات کیا بگڑے گی تمھارا بابو جی! بجلی نہ سہی باز و میں غسل خانہ نہ سہی! بازار نزدیک نہ سہی! مگر گھر تو ہے اور مالکن بے چاری اکیلی ہے! نرم دل والی ہے! مہربان ہے! بیوہ ہے، جوان نہ سہی! خوبصورت تو ہے! اور کیا چاہیے! غصّے کیوں ہو رہے ہو بابو جی! گھر بھی دے رہا ہوں اور گھر والی بھی! کرایہ پر سہی! او، تو پھر شامو دلال کے پاس کیا لینے آئے تھے! جاؤ کسی سرائے کا دروازہ کھٹکھٹاؤ! مندر کے دوار پر دستک دو! بڑے اَپ ٹو ڈیٹ بنے پھرتے رہتے ہو! دل ہی نہیں ہے تو دماغ خاک ہوگا!

شام کے آٹھ بجے:

ہاں! ہاں! یہ سرائے ہے مگر تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو! کیا کام کرتے ہو؟ ارے بھئی ملازم تو میں بھی ہوں! اچھا کلرک ہو! نئی نئی نوکری ملی ہے! پھر بیڑی تو پلاؤ؟ ہی! ہی کمرہ! سارے کمرے خالی ہیں! اس کے عوض ہنس کر باتیں کر رہا ہوں اور یوں بیڑی کا حساب ختم! چلو کیا یاد کرو گے! اجنبی ہونا تبھی! سنو بغل میں بوتل دبوچ کر اوپر والے کمرے میں چلے جاؤ! کیا ملے گا؟ کمال ہے چابی ورنہ! ورنہ سرائے میں کوئی کمرہ خالی نہیں! شادی کے لیے بُک ہو چکا ہے! ارے شادی نہ سہی! ماتم تو کسی مہینے میں ہوسکتا ہے! کل کیوں ہوسکتا ہے! آج ہی آسکتے ہیں! ہوسکتا ہے کل آ جائیں اور پوچھ لیں کہ ارے بھائی! سرائے اور دھرم شالہ میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا ہے......! گھوڑے اور گدھے میں کیا فرق ہے — ؟ اور پوچھو! دو کلومیٹر دُور ہے! اور پوچھو! ہم ضرور بتلائیں گے! اجنبی ہونا؟ تبھی!

رات کے دس بجے:

نہیں نہیں بھگت! ہمیں غصہ نہیں آتا ہے!! گئی رات اکثر مجبور سیلانی ہمارے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں! تشریف لائیے! آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ نام بتائیے!

یہاں دستخط کر لیجیے! ہاں — ہاں ایک تو کیا آپ دو تین کمرے لے سکتے ہیں! پر بھو کا گھر، آپ کا گھر، ہے نا —؟ ارے ہاں ماں تو بھگوتی ماں کا رُوپ ہوتا ہے! یہاں دو کمرے لکھئے! دو ہزار روپے دیجیے! نہیں! نہیں بھگت کرایہ نہیں! یہ سیکورٹی ہوتی ہے تا کہ کوئی پنکھا لے کر بھاگ نہ جائے! رقم کل واپس لی جاسکتی ہے! ویسے آج تک کسی بھگت نے پوری رقم واپس لی نہیں ہے! یہ کمرے بھگتوں نے ہی بنائے ہیں! دھرم شالہ ہے نا؟ بھگت پھاٹک تو بند کر کے جاتے! لگتا ہے تمھارے گھر میں دروازے نہیں ہیں! ورنہ — ارے بھائی! مندر کے صحن میں سونے کی اجازت نہیں!!

رات کے بارہ بجے:

آ گئے تم —! میں جانتا تھا کہ تم ضرور آ ؤ گے! وہ رہا تمھارا سامان! نہیں! نہیں مَیں تمھاری خاطر یہاں نہیں رُک گیا ہوں! مَیں یہاں رہتا ہوں! میرے دوست دفتر کے اس برآمدے میں —! کیوں جگہ اچھی نہیں؟ بھئی کیا کریں! گھر تو ملا ہی نہیں! تمھیں بھی تو نہیں ملا ہے نا —؟ کیسے مل جاتا! سنو دوست، میں فرش پر سو جاتا ہوں! تم میز پر سو جاؤ! مہمان ہو نا؟ تم نے کچھ کھایا؟ کون کھلاتا ہے؟ ہوں، کھانا تو میرے پاس بھی نہیں ہے! دارو ہے! تھوڑی پی لو! ورنہ! ورنہ نیند کیسے آئے گی —! نیند نہیں آئے گی تو بچّے یاد آئیں گے! بچّوں کی ماں یاد آئے گی! وہ بھوکے ہوں گے! وہ یاد آئے گی! وہ بیمار ہوں گے وہ یاد آئے گا! وہ بلک بلک کر تمھاری یاد میں رو رہے ہوں گے! یاد آئے گی! اچھا تو تم کنوارے ہو؟ بہت اچھا کیا جو شادی نہیں کی! چھوٹے ملازم کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیے! پھر تم رو کیوں رہے ہو؟ کس کی یاد آ گئی؟ بوڑھی ماں کی؟ بھائی بہن کی؟ اُف یہ مچھر بھی تو سونے نہیں دیتے! یار گھر نہیں تو گھر کی بات نہیں! لیکن دوست مچھر تو اپنے گاؤں میں بھی بہت ہے! لیکن وہ لڑتا نہیں —! یہاں کا مچھّر تیر کمان لے کر حملہ کر دیتا ہے! اور کرے گا بھی کیا! گھر والے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے! ہا...... ہا...... ہا...... ہا! میں بہک تو نہیں گیا دوست؟ ایک بات یاد آ گئی! میری چھوٹی بیٹی ہے نا؟ مچھر کو سانپ کہتی ہے! یہاں کے مچھر کو دیکھے گی تو مگر مچھ کہے گی! ہی ہی!

سحر کا وقت:

تم سوئے نہیں! ارے بھئی کہہ دیا نا کہ چوکیدار سے پوچھنے کی ضرورت نہیں! وہ اپنے گھر

میں رہتا ہے، بیوی بچّوں کے ساتھ! اس کی ماں بھی ہے! بھائی بھی! بہن بھی! میرا گھر نہیں ہے نا دوست! میں یہاں رہتا ہوں! نہیں! نہیں! فٹ پاتھ پر اَن پڑھ لوگ سوتے ہیں! میں نے تواریخ میں ایم.اے کیا ہے! اس ملک کی تاریخ لکھ رہا ہوں! تم کیا کرتے ہو؟ — حساب کتاب — ارے؟ تم خود گر گئے یا کسی نے گرادیا؟ ارے بھائی کتّے پر مت گرو! بے چارہ آدم کا بوجھ کیسے اُٹھا سکے گا! لو اکسایا نا! ہو گئے شروع! انقلاب زندہ باد! ہماری مانگیں پوری کرلو! ہم کیا چاہتے ہیں؟ ایک گھر — !! تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟ کہونا؟ ہو پھر کیوں ڈر رہے ہو!؟ ہی ہی! وعف وعف کی جگل بندی سے ڈر گئے؟ مگر بھاگ کر جاؤ گے کہاں — ؟ تمھارا بھی تو گھر نہیں ہے اس بڑے شہر میں!

صبح آٹھ بجے:

دفتر!

رات بارہ بجے:

برآمدہ — نشے میں چور چور — بے حس و بے حرکت جسم — مفلوج خیالات — بے دردی سے کچلے گئے جذبات — اور ماں، بھائی بہن کے چہرے یاد ہی نہیں — گھر کا تصور ہی نہیں!

OO

طوطا

طوطا! —ہاں ہاں طوطا! —طوطا نہیں کہوں گی تو کیا کہوں گی؟ طوطو یا طوطو رام— ہوں! — میرا بس چلتا تو تمھیں پنجرے میں بند کر دیتی اور کہتی —طوطے! — یہی تمھاری تقدیر ہے — لیکن کیا کروں —تم طوطا ہو کر بھی طوطے نہیں ہو— فقط طوطے کی طرح بولتے رہتے ہو— رَٹ لگائے — ت، ت، تہ، پ، پ، پہ بولنا ہی ہے تو بولو! منع کون کرتا ہے — بولتے جاؤ! چلاّتے جاؤ! اس چھت کو کیا، آسمان کو سر پر اُٹھاتے جاؤ! سرم (شرم) تو تمھیں ہے نہیں —! ہوں! طوطا بولو گنگنا رام— ارے بھگوان کا نام لیتے تو اچھا تھا تم بس گالیاں بکتے رہتے ہو— گندی گندی گالیاں— چلو گالی تو گالی ہے! گندی کیا اور صاف کیا —! اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پڑوسی کیا کہیں گے —! چلو وہ تو تمھاری بک بک سننے کے عادی ہو چکے ہیں —! مان لیتی ہوں —! مگر تم مجھے روز روز کیوں مارتے ہو؟ — اُف! اُف! ہائے! — ارے روؤں نہیں تو اور کیا کروں —ہڈّی پسلی توڑ دی ہے! —کم بخت نے! — اُف! سر بھی پھٹ گیا ہے! — کاغذی شیر، خود ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے! مگر مجھے مارتا ہے تو ہاتھی بن جاتا ہے! — پتلی پتلی ٹانگیں نہ جانے فولاد کیسے بن جاتی ہیں؟؟ باہر جا کر خود مار کھا کر آتا ہے اور گھر آتے ہی مجھے مارتا ہے! — کیوں؟ — بڑا آیا مرد کا بچہ طوطا! —طوطے کو لوگ طوطو نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟ — راجہ رام، گنگا رام، پرسُورام ہو کیا؟ میں بھی طوطو کہوں گی! — ہاں ہاں طوطو!! کیوں چڑ جاتے ہو؟ جب بھی دیکھوں تمھارے ہونٹ ہلتے ہی رہتے ہیں! —کوئی کچھ کہے یا نہ کہے تُو تو بولتا ہی رہتا ہے! ایک ہی سانس میں ہا......ہا......!ہا......ہو......ہو! کم بخت! یہ ہنسی بھی تکلیف دِہ ثابت ہو رہی ہے! مگر......مگر!!ہا......ہا......! طوطا تو نیند میں بھی بولتا رہتا ہے! ہاں!!......ہا......ہا! سچ ہاں صاحب! مرغا ہے! — میٹ ہے! — گوبھی ہے! — پالک ہے سر! — چھوٹا لاؤں یا بڑا! پانی لاؤں یا سوڈا! — ہاہا......ہاہا!! گھر میں سوکھی روٹیاں ہیں! — باسی چاول نہیں! — سڑی ہوئی سبزیاں

بھی نہیں! اور طوطا کہتا ہے! کیا کھائیں گے صاحب! ہا...... ہا...... ہ......!! ہائے میری پیٹھ بہت درد کر رہی ہے! اُف میں مر گئی! — ارے او طوطو؟ تمھیں مجھ پر ترس کیوں نہیں آرہا ہے؟ کم بخت لاتیں یوں مارتا رہتا ہے جیسے چھوٹے مالک فٹ بال کھیلتے ہیں! — ارے واہ!! اپنے بچاؤ کے لیے کیوں نہ ایک فٹ بال خریدی جائے؟ — جب وہ لات! — اُف! — جاہل گلا بھی یوں دباتا ہے جیسے گلے میں سانپ ڈال دیا ہو! — میں بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوں! — مر بھی نہیں جاتی اور طوطا بھی مجھ پر ترس نہیں کھاتا! — اُلٹا ساری (شاعری) کرتا ہے! — ہائے دھنّو! تمھارا دھندہ ایک ایسا چھاتہ ہے جس میں شہد کی ایک بوند بھی نہیں! بس کانٹے ہی کانٹے ہیں!! — جو مجھے چبھتے ہیں! کہاں چبھتے ہیں؟ مگر — مگر کیا معلوم چبھتے ہوں! — کیسے پتہ چلے! — میں کوئی جوتشی تھوڑے ہوں! — کسی سے پوچھوں گی! — مگر کس سے وہ جوتشی پیسے کھاتا ہے! — ہر بار کہتا رہتا ہے کہ دھنّو تم رانی ہو! — ہوں! رانی! — چلو آج طوطے سے ہی پوچھ لوں گی! — مگر نہیں نہیں!! ہرگز نہیں! آج میں نے طوطے سے کوئی بات نہیں کرنی ہے! — کیوں کروں!؟ کیسے کروں؟ رشتہ ختم ہو گیا اور ناطہ ٹوٹ گیا! — جو پکڑ لیا تھا وہی توڑ دیا کم بخت نے! — ہائے ماں! کل تو طوطا یم راج بن گیا تھا! — لیکن آج جب آئے گا — مزہ چکھادوں گی! — دروازہ بھی نہیں کھولوں گی! — بولوں گی بھی نہیں! — کھائے گا خود ہی وہ ڈال کر — کٹورا بے شک چلاتا رہے! مجھے کیا! چینختا رہے! — ڈر کس بات کا! — پڑوسی تو جان ہی گئے ہیں کہ طوطا مجھے ہر رات مارتا ہے! — بے چارے تنگ آگئے ہیں! — میں بھی کیا کروں! — چیخوں نہیں! چلاّؤں نہیں! تو کیا کروں؟ — لطیفے سناؤں؟ — پریوں کی کہانی سناؤں؟ — فلمی گانے گاؤں؟ — ٹھیک ہے نہ طوطا مجھے مارے اور میں نہ چلاّؤں ہوں! — تب تو آج خاموشی ہوگی! ہے نا؟ دراصل میں بھی جاہل ہوں! — میری ماں بھی جاہل تھی! — وہ بھی میرے باپ کو گالیاں دیتی تھی! — نہیں! نہیں!! تب میں جاہل تھی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں! — نانی؟ ہی...... ہی چلو نانی نہ سہی ماں تو ہوں؟ نہیں نہیں!! ماں تو بننے والی ہوں نا؟ — میں بڑی سمجھ دار ہوں! — آج مزہ آئے گا! — طوطا آئے گا تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی! — مجھے کیا؟ پڑا رہے گا یوں ہی باہر برآمدے پر — اور کہتا رہے گا گھر چھوڑ کے جاؤں گا! چلا جائے! میرا کیا! میرے ساتھ میرا بیٹا ہوگا! بیٹا؟ چلو بیٹی سہی! طوطا چلاّتا رہے گا اور میں چپ چاپ کمبل اوڑھ کر سو جاؤں گی! — ارے کمبل میں ایک اور چھید ہو گیا ہے! — کہا تھا طوطے کو! — ہوں! — چلو ٹھیک ہے! — میرے لیے تو کافی ہے! —

جوں توں ڈھانپ لوں گی اپنے جسم کو!۔۔طوطے نے آج کچھ کہا تو کاٹ کھاؤں گی اُسے۔۔۔ یہ میرے لمبے لمبے ناخن بھی تو آج کمال دکھائیں گے!۔۔۔ ہاں!!۔۔۔ آج تو میں کہہ دوں گی! تم جلم (ظلم) کرتے ہو!۔۔۔ تم بُرے آدمی ہو!۔۔۔ بُرے نہیں، بہت بُرے آدمی ہو!۔۔۔ میرے تم آدمی ہو ہی نہیں؟۔۔۔ طوطے میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں!۔۔۔ یہ بھی کہوں گی کہ تم باپ بننے والے ہو!۔۔۔ مگر میں اپنے ہونے والے بچے کو ہاتھ تک بھی نہیں لگانے دوں گی!۔۔۔ روئے گا بیچارہ۔۔۔ میرے پاؤں پکڑ لے گا!۔۔۔ لیکن میں اپنا دل پتھر بنالوں گی!۔۔۔ جائے گا کہیں کسی سرائے میں۔۔۔ میں کل سویرے کام پر بھی جاؤں گی!۔۔۔ دیکھتی ہوں کون روک لے گا مجھے۔۔۔ میں آندھی ہوں! طوفان ہوں! سیلاب ہوں!۔۔۔ ہا......ہا......ہا......ہا......ہا......ہا!۔۔۔ اُف! اُف!۔۔۔ مار کھانے سے کیا آدمی اتنا مجور (کمزور) ہو جاتا ہے!۔۔۔ ہائے!۔۔۔ ہائے میرے سے تو اُٹھا بھی نہیں جاتا!۔۔۔ بانس کی طرح سوکھا یہ آدمی میرے لیے پہلوان کیسے بن جاتا ہے؟۔۔۔ لیکن قصہ ختم! کہانی طوطے؟۔۔۔ آج جو تُو نے ہاتھ اٹھایا! دیکھ لینا میں کیا کرتی ہوں!۔۔۔ ہاں مونچھوں پر یوں تاؤ دیتا ہے جیسے کوئی سیٹھ کا بچہ ہے!۔۔۔ ارے طوطے؟ چوہے کی بھی تو مونچھیں ہوتی ہیں؟۔۔۔ اور میں بلّی ہوں!۔۔۔ آج تمھیں کھا جاؤں گی! دبوچ لوں گی! دن بھر الف کی طرح کھڑا رہتا ہے! صاحب آواز دیتا ہے تو ویٹر طوطا دوڑا ہانپتے ہوئے کہتا ہے!۔۔۔ یس سر!! پر سیلوٹ بھی کرتا ہے!۔۔۔ ہا......ہا...... ہا شرابیوں کی اُلٹی بھی صاف کرتا ہے!۔۔۔ اور مجھے کہتا ہے، دھتّو! تم جھوٹی ہو!۔۔۔ تمھارے ہاتھوں سے بدبو آرہی ہے! میں بھی جھوٹی ہوں؟۔۔۔ ارے طوطے تمھیں عقل ہوتی تو خود ہی سوچ لیتے کہ اگر میں لوگوں کے برتن صاف نہیں کروں گی تو کون کرے گا؟۔۔۔ بھلا بڑی مالکن کا وجن (وزن) زیادہ ہو گیا ہے!۔۔۔ بچاری اُٹھ بھی نہیں سکتی!۔۔۔ چھوٹی مالکن بیچاری امید سے ہے!۔۔۔ پاؤں پھسل گیا تو ٹیڑھا میڑھا بچہ ہوگا!۔۔۔ بچہ مر بھی سکتا ہے!۔۔۔ تمھیں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، مجھے سب معلوم ہے!۔۔۔ کیا ہوا جو ابھی میرا بچہ نہیں ہوا!۔۔۔ ہوا ہوتا وگر تو نے ہی تو حمل نہ گرایا ہوتا؟۔۔۔ تم فٹ بال جو کھیلتے ہو۔۔۔ سنو، تم اپنی ٹانگوں کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے؟ لیکن پھر تم چل پھر نہیں سکو گے! طوطے!۔۔۔ دیکھو تم بات سمجھ نہیں سکتے!۔۔۔ کیسے سمجھ سکو گے!۔۔۔ تم جاہل ہو!۔۔۔ طوطے ہو!۔۔۔ طوطو! طوطو!۔۔۔ چھوٹی مالکن کا اگر لڑکا ہوا تو بتاؤ اس ننھے منّے کو کون پالے گا؟ میں! میں!۔۔۔ ارے چھوڑو بلّو کو! مالکن اس کو ہرگز گھر میں گھسنے نہیں دیں گی! کیونکہ وہ چور ہے! اس کے اپنے چاروں کے اِردگرد گھومتے رہتے ہیں! ایسے جیسے برفی کے اِردگرد چیونٹیاں!

بچّے کی پرورش میں ہی کروں گی !— ببلو کو بھی میں نے ہی پالا ہے!— سچ تمھیں نہیں معلوم!— کیسے معلوم ہوگا!— تب میری عمر ۱۰ سال تھی!— تب ۲۰ روپے ملتے تھے!— اب تو میں ۳۰ لوں گی!— چلو ۲۵ روپے ہی سہی!— کیا فرق پڑتا ہے!— ۴ مہینے کام کروں گی تو ہم ایک کمبل خرید لیں گے! تمھارے لیے تھوڑے ہی!— نہیں بابا میرے لیے بھی نہیں!— اپنے منّا کے لیے— لیکن یہ سب کیسے ہوسکتا ہے!— تم تو مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتے؟— کیا حرج ہے کام کرنے میں؟ کام کرنا بُرا ہے کیا؟— پھر؟؟— پھر تم؟— ارے اب تو آنسو بھی سوکھ گئے!— لیکن رونے سے فائدہ بھی کیا؟— ماں زندگی بھر روتی رہی تو کیا ملا اُسے— کھانا تو کیا دوائی بھی نہیں ملی؟ مجھے کام پر جانا چاہیے!— میں کام پر جاؤں گی!— ہوں!! طوطا رام آ بھی گیا تو دو ہاتھ ماردوں گی!— گر جائے گا! دسہرے کے راون کی طرح!— مگر اگر اُسے کچھ ہوگیا تو میں بیوہ ہوجاؤں گی!— نہیں نہیں!!— میں کچھ بھی نہیں کروں گی!— میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی!!

دراصل میں ہی بُری ہوں!— گنوار ہوں نا؟— غصّے سے بات کرتی ہوں؟— ناک چڑھا کر بات کرتی ہوں!— پیار سے اگر بات کرلوں تو پھر طوطے کو سمجھادوں تو شاید مان بھی جائے گا— سچ ہی تو ہے! طوطا کہا! لیکن پیار سے کہا!— غصّے سے نہیں!— سچ! بھگوان کی قسم!— طوطے کی قسم!— ہائے ماں! طوطے کی آنکھیں کتنی اچھی ہیں!— طوطا کتنا سمجھ دار ہے!— ٹھیک ہی تو کہتا رہتا ہے!— میں جوان ہوں!— گوری ہوں!— خوبصورت ہوں!— اور صبح سویرے اکیلی سیٹھ کے گھر جاتی ہوں!— ٹھیک ہی تو کہتا رہتا ہے!— سیٹھ کے دونوں لڑکے مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہتے ہیں! ایک دن تو کمرے میں بھی گھسیٹ کر لے گئے تھے!— چلو بابا ساڑی نہ دو پر گھسیٹتے کیوں ہو؟— اس روز تو فوٹو بھی کھنچا تھا میرا! مگر!! ہوں تب کیا ہوا؟ میرے دل میں تو کوئی میل تھوڑی ہی ہے!— طوطا یوں ہی شک کرتا رہتا ہے!— میں کپڑے دھوتی تھی!— برتن تھوڑے ہی صاف کرتی تھی!— مگر!.....مگر ہائے رام!! میرا آنچل! ہائے رام!— اگر وہ فوٹو دیکھ لے تو؟ میں بڑے بے سرم (شرم) ہوں!— طوطا ٹھیک کہتا ہے!— وہ دونوں مجھے یوں دیکھتے رہتے ہیں جیسے مجھے نہیں بلکہ پلیٹ میں رکھے ہوئے گرم گرم کباب دیکھ رہے ہوں!— کباب!— ارے ہاں!— اس روز سیٹھ نے جو چیز کھلائی تھی!— کباب ہی تو تھا!!— مگر میں جب کباب کھا رہی تھی تب وہ میرے سینے کو کیوں دیکھ رہا تھا؟ ہوں! بوڑھا ہے! بُری نظر سے تھوڑے ہی دیکھتا! لیکن بملا کہتی ہے کہ وہ!— سبھی ہے!— مجھے ڈراتی

رہتی ہے!— بڑی مطلبی عورت ہے!— بڑی فسادی عورت ہے!— چلو بابا مان لیتی ہوں کہ وہ مجھے بُری نظر سے دیکھتے ہیں!— لیکن میں کیا کرسکوں گی!— اتفاقاً تو یہ گھر بملا سے چھوٹ گیا ہے! ورنہ مجھے کون کام دے گا؟— ہوں!— اگر میں طوطے کو بتادوں کہ سیٹھ کے چھوٹے لڑکے نے کل مجھے دبوچ لیا تو وہ بجلی بن کر اس پر برس پڑے گا!— نانی یاد آئے گی کتے کی!— اپنی بہن نہیں ہے کیا؟ کمینہ!! مگر طوطا تو اس گھر کے بچّوں سے بھی ڈرتا ہے!— انھیں جناب کہتا ہے! — یہ جناب کیا ہوتا ہے؟— اگر میں بھی طوطے کو جناب کہوں تو! وہ شاید مجھے روز روز پیٹنا چھوڑ دے!— میں آج طوطے سے کہہ دوں گی کہ بڑا پہلوان بنتا ہے! جا سیٹھ کے بیٹے سے تو لڑ کے آ! مگر نہیں!! وہ لوگ تو طوطے کی گردن مروڑ دیں گے!— اور طوطا خاموش!! نہیں نہیں!— میں طوطے کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی!— مگر میں طوطے کو کچھ بھی نہیں بتاتی رہتی ہوں پھر اسے سب کچھ کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟— ہاں! ٹھیک ہے!!— طوطا جادوگر ہے! اس وقت ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے اسے آنکھیں بند کرتے ہی سب کچھ دکھائی دیتا ہوگا کہ میں یہاں کیا کر رہی ہوں!— پھر اگر میں گھر چھوڑ کے جاؤں بھی تو!— چلو نہیں جاتی!— مگر آج تو میں فیصلہ کرلوں گی!— جالم (ظالم) مرد کہتا ہے کہ کام کرنا چھوڑ دے!— کھائیں گے کیا پھر؟— اپنی بوٹیاں!— ہوں!! کمرے کا کرایہ، آٹا چاول، دال!— کہتا ہے ایک ہی ٹائم کھائیں گے!— ٹھیک ہے طوطا رام جی!— مگر جب منا آئے گا پھر کیسے پالیں گے اُسے!—

منا، منا بڑا ہوگا تو میری طرف داری کرے گا!— ہاں، ہاں! وہ بڑی بڑی مونچھیں رکھ لے گا!— رنگ دار قمیص پہنے گا!— سفید وردی نہیں!!— وہ بیرے پہنتے ہیں!!— اُف پھر یاد آ گیا یہ طوطا رام!— ہوں!!— دیکھو تو یہ طوطا کیسے اکڑتا ہے!— جیسے موٹر میں بیٹھ کر آیا ہے!— ارے آدھی رات تو ہوگئی!— طوطا کیوں نہیں آیا ہے!— جان گیا ہوگا کم بخت کہ آج مقابلہ ہے!— اس سے پہلے کہ وہ مجھے مارے گا آج میں ہی اس کے بال نوچ لوں گی!— لولو آ گیا!— طوطا! طوطو! میں اسے طوطو ہی کہوں گی!!— دروازہ نہیں کھلے گا آج جالم (ظالم) کو باہر ہی پڑا رہنے دو!— اچھا ہے! گالیاں بھی دے گا!— دیتا رہے!— کم از کم مارے گا تو نہیں!— میں پاگل ہوں نا! اس کے جسم کے ساتھ چمٹ جاتی ہوں!— آج سامنے نہیں آنے دوں گی!— مگر باہر سردی ہے!— ٹھٹھر جائے گا کم بخت!— ہونٹ تھرتھرا جائیں گے!— طوطے کی بولی بند ہو جائے گی!— یہ راکشش مر کیوں نہیں جاتا؟— ہائے ہائے! میری

زبان کٹ جائے!— میں ڈائن ہوں!! اپنے مرد کو کوئی ایسی گالی دیتا ہے کیا؟— لیکن شوہر بھی تو بیوی کو مارتا نہیں ہے!— چھوٹی مالکن سگریٹ پیتی ہے! شراب پیتی ہے! لیکن پھر بھی مالک اسے کچھ بھی تو نہیں کہتے!— میرا کیا قصور ہے!— یہی نا کہ کام کرتی ہوں!— چلو نہیں کرتی!— رانی بن کر دن بھر یہاں بیٹھی رہوں گی!— سن رہے ہو! طوطے؟ سن رہے ہو؟ طوطا! طوطے! طوطورام! طوطارام جی! طوطارام شرما پنڈت! طوطارام جی شرما! صاحب! جناب! ارے کیا ہوا؟ اندر آؤ! اندر آؤ!— دروازہ کھلا ہے!— ارے کیا ہوا؟ ہائے میں مرگئی!! پھر کسی نے مارا؟— جھگڑا ہوا؟— کس سے؟ ہا......ہا......ہا......ہا......ارے مسکرانا گناہ ہے کیا!— ہاہاہا چل اندر! آج تم بھیگی بلّی کی طرح مجھے دیکھ رہے ہو!— کچھ بولتے نہیں! آج میں تمھیں گالی نہیں دوں گی!— لیکن طوطے، تمھارے جسم میں اتنا خون کہاں سے آیا جو بہہ کر تمھیں لہولہان کر چکا ہے؟— لال لال خون! اُف کس نے مارا تمھیں؟ غنڈوں نے؟ کسی صاحب؟— شراب پی لی ہوگی نا؟— پھر یہ شراب بھی تو تم ہی پلاتے ہو ان صاحب لوگوں کو!— اُلٹی صاف نہیں کی ہوگی؟ کلیجہ پھٹ رہا ہے نا؟— لے اُٹھا اپنے ہاتھ پاؤں اور مجھے جتنا چاہے مار!— مار مار کر میرا کچومر نکال دے گا کیا؟— مالک نے نوکری سے الگ کیا ہوگا؟— ہائے! اب کیا ہوگا!— ارے او طوطے تو نے یہ کیا کیا؟— نوکری چھوڑ دی! اب گھور گھور کے مجھے کیا دیکھ رہا ہے؟— سو جا!— ہر طوطا ایک نہ ایک دن بولتے بولتے خاموش ہو جاتا ہے اور پنجرے میں دوسرا طوطا آ جاتا ہے!— مالک کو ایک اور طوطا مل چکا ہوگا!— مالکن کو بھی نوکرانی مل چکی ہوگی!— اب سوچنے سے کیا فائدہ؟— سو جا، طوطے سو جا!— جاگتے رہو گے تو اپنا خون پیتے رہو گے!— دیکھ طوطے تو رومت!— طوطے پیار سے طوطا کہا!— غصّے سے نہیں!!— ہاں طوطے جانتے ہو؟ اسی مہینے میں شاید اُپنا منا آ جائے گا!— منا پیارا منا!— میرا منا، تمھارا منا!! اُف اُف!! نہ آئے تو اچھا!— طوطے اُٹھ اور زور سے ایک لات مار!— میں کہہ رہی ہوں لات مار!— روک لے منے کو!— دیکھو آج کی رات اتنی تاریک ہے! کل کی رات اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوگی!!— طوطے؟ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟— مجھے گالی نہیں دے گا؟— مجھے مارے گا نہیں؟!—

طوطے! طوطارام!— ہے رام! ہے رام! اتنا تو بتاتے جا کہ کل کام پر جاؤں یا نہ جاؤں!!

ہے رام!— ہے رام!!

OO

تیسرا مقدمہ

بھگت رام کو یقین تھا کہ عدالت میں جو بھی ہو چکا تھا یا جو بھی ہو رہا تھا سب اس کے گورو مہاراج کے چاہنے اور نہ چاہنے پر ہو رہا ہے! جبکہ چمتکاری بابا کے مخالفین کے شکوک بھی واقعات کو خود سن کر، دیکھ کر بھی پانی پر کھینچی لکیروں کی طرح مٹتے نظر آ رہے ہیں اور تو اور جج رگھوناتھ بھی دل ہی دل میں یہ سوچ رہا ہے کہ آخر کچھ تو ہے جو آج ہر بات انوکھی ہو رہی ہے! یعنی کل یگ میں رام راجیہ جیسے حالات! مدعی، گواہ، ملزم اور وکیل جو بھی بول رہے ہیں وہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ پہلے دو مقدموں میں ملزموں نے خود ہی اپنا فیصلہ بھی سُنا دیا تھا اور تیسرے مقدمے میں بھی کارروائی کے دوران نہ کسی نے کسی کو بولتے بولتے ٹوکا تھا اور نہ کسی نے کسی کو کچھ کہتے کہتے روکا تھا! نہ مدعی کی آہ و زاری سنائی دی تھی اور نہ ملزموں کی چیخ و پکار عدالت میں گونج اٹھی تھی! فقط چند لمحات کے لیے جج، مدعی بھگت رام، ملزمہ ڈاکٹر سیتا اور عدالت کے ایک گوشے میں بیٹھے بابا کی آنکھوں میں اپنی سنگین سزا کے عکس دکھائی دینے چاہیے تھے! وہاں بابا کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر تاریکیوں کو مٹانے والا پرکاش بھی نظر آ رہا ہے جبکہ جج صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہے! حالانکہ وہ دل پر پتھر رکھ کر اپنی ہی بیوی کے خلاف فیصلہ لکھ چکا تھا مگر سیتا کے تھرتھراتے ہونٹ دیکھ کر نہ جانے اس کو کیوں یوں لگ رہا ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ بھی خود ملزمہ ہی سنائے گی!

ڈاکٹر سیتا یہ جانتی ہے کہ تانترک بابا اپنی شکتی سے سچ کو ثابت کرنے کے لیے کسی کا لحاظ نہیں کرتے مگر اگر وہ چاہیں تو انگاروں کی دہک سے پھولوں کی مہک پیدا کر سکتے ہیں! شاید یہی وجہ تھی کہ وہ جھوٹ کا سہارا لینے کی بجائے بھگتی کی خاطر سچ بولی تھی اور اگر وہ جھوٹ بولتی تو بچ جاتی! آخر جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا ایک ہی تو گواہ تھا اور وہ بھی ایک نوزائیدہ بچہ جو رو تو سکتا ہے مگر بول نہیں سکتا ہے!

بھگت رام کو معلوم ہے کہ فیصلہ اس کے حق میں ہے، اس کو یہ بھی یقین تھا کہ بابا کی موجودگی

میں کوئی بھی جھوٹ بول نہیں سکتا! یہی تو وجہ تھی کہ پہلے دو مقدموں کی کارروائی کسی بحث یا تکرار کے بغیر ڈرامائی انداز بلکہ یوں کہیے کہ نرالے انداز میں ختم ہوگئی تھی! ہاں اگر وہ دونوں ملزمان بابا کی شرن میں ہوتے تو انگارے ان سے لپٹنے سے پہلے راکھ ہوکر خاک میں مل جاتے!!

جج رگھوناتھ بھی یہ سوچ کر حیران ہوا تھا کہ دونوں ملزمان کے ساتھ رعایت کی جاسکتی تھی اگر وہ اس فیصلے کا انتظار کر لیتے! پہلا مقدمہ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے ایک مزدور کا تھا جس نے اپنی بیوی کے تار تار کپڑوں میں لاش دیکھ کر اپنے مالک کے جوان بیٹے کے ڈر سے پہلے اپنی بیٹی کو قتل کر دیا اور پھر گرفتار ہوا! اور پھر اُس نے عدالت میں اقبالِ جرم کر کے زہر کھالیا تھا اور یوں خود ہی اپنے لیے سزائے موت کا فیصلہ سنایا تھا؟ دوسرا مقدمہ ایک مِل مزدور کا تھا! اس کے پاؤں مشین میں کٹ گئے تھے! مزدور یونین والے اس کے مالک سے معاوضہ مانگ رہے تھے لیکن وہ ضد کر رہا تھا کہ مالک گھوڑوں کی طرح اس کو نال لگوا دے اور پھر کام پر لگا دے! ایسی ہی اور کئی باتیں کر کے اس نے خود ہی اپنے آپ کو پاگل خانے بھجوانے کا فیصلہ سنا دیا تھا!!

ڈاکٹر سیتا کا مقدمہ پیچیدہ ہے مگر اس نے سچ بول کر آسان بنا دیا ہے! ہوا یوں کہ بابا کے آشیرواد سے ڈاکٹر سیتا کے ذاتی نرسنگ ہوم میں بھگت رام کا بچہ پیدا ہونے والا تھا! بابا نے آپریشن کا ٹائم بتا دیا تھا اور بھگت رام کو یہ یقین دلایا تھا کہ اس کا بیٹا ہوگا اور وہ چکرورتی مہاراجا بنے گا!!

ڈاکٹر سیتا نے بابا کی بات مان تو لی تھی مگر عین اسی وقت نرس نے اس کو یہ منحوس خبر سنا دی تھی کہ چند نامعلوم لوگوں نے جس اسکول کی بس کو اِغوا کر لیا ہے، اس میں اس کا بیٹا بھی ہے! یہ خبر سن کر ڈاکٹر سیتا نے گھبرا کر کوکھ کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے لکھ پتی باپ کے سکون کے اُجالوں کو دیکھنے کے منتظر بچے کو چھو کر یہ محسوس کیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر بعد شاید آپریشن کے بغیر ہی پیدا ہو! اس لیے وہ دوڑ کر اپنے پتی جج رگھوناتھ کو فون کرنے چلی تھی اور یوں بچہ پانچ منٹ بعد پیدا ہوا تھا!!

جب بابا کو اطلاع ملی تھی تب وہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح اُبل پڑا تھا! بھگت رام کو جب یہ بتایا گیا تھا کہ اب اس کا بیٹا شہنشاہ نہیں بن سکتا ہے تب اس نے یہ کہہ کر کہ ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے زچہ بچہ مر بھی سکتے تھے! پانچ لاکھ بطور ہرجانہ ادا کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا ہے!

تب جب ڈاکٹر سیتا نے بابا کو گمراہ کرنے والا مکار کہا تھا، بابا کو غصہ آیا تھا! آنا ہی تھا کیونکہ سیتا، بابا کے آشرم میں کبھی جاتی نہیں تھی! اس لیے بقول بابا وہ اُن کی غیبی قوت سے آشنا نہیں ہے!

یہ بابا کا چمتکار تھا یا ڈاکٹر سیتا کی بد بختی، بھگت رام کی بیوی مر گئی اور بھگت رام نے قتل کے الزام میں سیتا پر مقدمہ دائر کیا ہے! اس سے پہلے کہ ڈاکٹر سیتا یہ قبول کرتی کہ بھگت رام کی بیوی کی موت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے بھی ہو سکتی تھی اس لیے آپریشن کو ٹالنا واجب تھا! اس نے آخری بار آہ بھر کر بابا کو ملتجی نظروں سے دیکھا تھا! بابا خوش ہوئے تھے اور بھگت رام کے کان میں کہا تھا:

"بھگت! اب بچہ چکرورتی راجا تو نہیں اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ممبر بن جائے گا! ہم اس کو منسٹر بنا دیں گے! ہمیں غصہ اس لیے تھا کہ بچہ تم پر بھاری ہوگا! تم بچ گئے، ماں کو لے گیا! بُرا تو ہوا مگر اس سے بُرا یہ ہوگا کہ اگر ڈاکٹر سیتا کو سزا مل گئی تو جج رگھوناتھ ہیرو بن جائے گا! کہیں وہ منسٹر بن گیا تو تیرا کیا ہوگا؟"

بھگت رام کو اشارہ مل گیا اور اس نے فلمی انداز میں عین موقع پر جج رگھوناتھ سے ڈاکٹر سیتا کے خلاف فائیر کیا ہوا مقدمہ واپس لینے کی گذارش کر کے حاضرین کو چونکا دیا!

ڈاکٹر سیتا بابا کے چہرے کو دیکھ کر احسان کے بوجھ سے اتنی دب گئی کہ وہ ٹکٹکی لگا کر بابا کو یوں دیکھتی رہی جیسے اس کو ایک اندھیری سُرنگ کا منہ نظر آیا ہو! جج رگھوناتھ بھی یوں محسوس کرنے لگا! گویا بابا نے رسّی پھینک کر اس کو دلدل سے نکال دیا ہے! اچانک میاں بیوی کو اپنے بیٹے کا خیال آیا تو جج رگھوناتھ کا اشارہ ملتے ہی ڈاکٹر سیتا بابا کے قدموں پر گر کر التجا کرنے لگی:

"بابا میرے بیٹے کو بچالو!"

بابا کی آنکھیں بھر آئیں! ظاہر ہے کہ وہ سیتا کی بھگتی سے متاثر ہو چکے ہیں! آس پاس کھڑے لوگوں نے بابا کی جے جے کار کے نعرے لگائے تو بابا نے سیتا کے سر پر ہاتھ رکھ کر پہلے اپنائیت کا احساس دلایا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہا! بھگت، لوگ سمجھتے رہے کہ بابا کوئی منتر سنا رہے ہیں جبکہ بابا سیتا سے کہہ چکے تھے کہ سیتا تم پر سنکٹ کے بادل منڈلا رہے ہیں! بالکل ویسے ہی جیسے دیش پر گرہوں کا گرہن ہے! گرہن ہٹانے کے جتن کرنے ہوں گے، ایک یگیہ کر رہا ہوں، دس لاکھ دان کرنا ہوگا، پھر تمھیں بیٹا مل جائے گا!

اس سے پہلے کہ سیتا کچھ کہتی، اِرد گرد کھڑے لوگوں نے بابا کے چرن چھُونے کے لیے کہنیاں مار مار کر اسے بہت پیچھے دھکیل دیا!

عدالت کے کمرے میں لوگ مقدمے کے بارے میں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے ایک ہی آواز میں کہہ رہے ہوں کہ بھگوان دھرتی پر اُتر کر اپنے بھکتوں کو بچانے آیا ہے! جبکہ بیشتر لوگ اس

لیے خوش تھے کہ انھوں نے بابا کو قریب سے دیکھا ہے!

جج رگھوناتھ دور کھڑا کبھی بھگت رام کو دیکھتا رہا اور کبھی اپنی بیوی ڈاکٹر سیتا کو دیکھتا رہا!

تب تک سیتا نے اپنا نرسنگ ہوم بیچ کر دس لاکھ روپے کا انتظام کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا! جبکہ ڈاکٹر بھگت رام نے ڈاکٹر سیتا کی تمام جائیداد خریدنے کا من بنالیا ہے! جج رگھوناتھ اپنی کرسی پر بیٹھ کر گئی رات تک سوچتا رہا کہ آخر اس تیسرے مقدمے کا فیصلہ وہ کیا اور کیسے لکھ پائے! یہ ایک انوکھا مقدمہ تھا نا؟

OO

خوشبُو

اپنی تین سال کی شادی شدہ زندگی میں خوشبو ایک کھلے ہوئے گلاب کی طرح بیٹھی تھی اور جو بھی آج ہوا تھا یا سہاگ رات کے وقت سے ہی ہو رہا تھا اس کا کرب بھول کر وہ آج بے حد خوش تھی کہ اُس کے بدن سے اس کی پوشاک اُتارنے والا اس کا اپنا شوہر تھا! اُس کا محبوب تھا جس کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر اُس نے اپنے سماج سے ہی نہیں بلکہ اپنے والدین سے بھی بغاوت کی تھی! اگر بالغ نہ ہوتی تو شاید میاں بیوی کو قانونی لڑائی بھی لڑنی پڑتی اور دونوں کے پیار کی کہانی کسی تھانے کی فائل میں درج ہوئی ہوتی، انھیں تفتیش کے اذیت ناک مرحلوں سے بھی گزرنا پڑتا! یوں تو ایسے معاملات میں جنگ کی بھاگ دوڑ مرد کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹا تھا! یعنی خوشبو ہی ہر مورچے پر مقابلہ کر کے اپنے محبوب کو گاؤں سے یوں اٹھا کر لے گئی تھی جیسے مہاراجہ پرتھوی راج چوہان اپنی محبوبہ سنجوگتا کو اُٹھا کر لے گیا تھا! وہ اس لیے کہ اس کا شعور حالات کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی تھرتھرا کر گر جایا کرتا تھا یا پھر لرز کر کانپ اُٹھتا تھا اور اپنی ٹانگوں کو یوں گھسیٹ کر چلا کرتا تھا گویا ایک تیز رفتار ندی میں چل کر دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہو! خوشبو کو اکثر اپنی ماں کی یاد آیا کرتی تھی مگر اپنے گاؤں میں جانا گویا جنگ بندی لائن کو پار کر کے جیل یاترا کو دعوت دینا تھا! اس لیے وہ اپنے آپ کو گاؤں بدر کی ہوئی سمجھا کرتی تھی!

خوشبو اپنی شادی شدہ زندگی سے شروع شروع میں چونک پڑا کرتی تھی مگر بعد میں وہ ایک بے شکل خوف سے خوف زدہ ہوتی رہتی تھی! یوں تو وہ گہری جھیل کو ایک تالاب سمجھ کر کود پڑی تھی اس لیے وہ اپنا حالِ دل کسی کو سنا بھی تو نہیں سکتی تھی! چونکہ واحد سننے والا یعنی اُس کا شوہر احساسِ کمتری، خودداری یا کئی بہانوں کی آڑ میں کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا اس لیے اقتصادی بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے خوشبو اپنے گھر سے چرائے ہوئے روپے اور زیورات چھپا کر خود ہی آس پاس کے گھروں

میں برتن صاف کرنے، صفائی کرنے اور گندے کپڑوں کو دھوکر اپنے گھر کا چولھا جلایا کرتی تھی! اور صبح سے شام تک کام کرتے کرتے اُس کے بال اُلجھے ہوئے رہتے ہیں! کپڑوں سے باس آتی ہے پھر بھی ضرورت مند لوگ اس کو برداشت کرتے ہیں کیونکہ خود ایک میلی کچیلی عورت گھروں کو شیشوں کی طرح صاف رکھتی ہے! کپڑے بھی صاف وشفاف رکھتی ہے! اس لیے اپر مڈل کلاس (Upper middie class) گھرانوں میں وہ بہت ہی مقبول ہے! ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ لوگ اس کے کام کاج کے دوران اُس کے آس پاس نظر نہیں آتے، مجبوراً آنا پڑے تو اپنی ناک پر رومال رکھ کر! یعنی خوشبو نام کی کام کرنے والی بدبو کا ایک بدنما داغ لے کر چلتی پھرتی نظر آتی ہے! خود بھی اپنے حال پر ہنستی رہتی ہے اور جب کوئی اس کی پُرکشش آواز میں سنائے گئے اس کے لطیفوں پر ہنس پڑتا ہے یا پڑتی ہے تب باس قہقہوں کو دبوچ ڈالتے ہیں!

خوشبو بہت ہی حساس اور جذباتی عورت ہے مگر مجبوریوں نے اُس کے احساسات کو مفلوج کر دیا ہے کیونکہ اس کا شوہر کاہل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے کہ گویا منہ چھپا کر زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا ہے! ایسا بھی نہیں ہے کہ اُس کو باغی بن کر خوشبو سے شادی کرنے کا ملال ہے بلکہ وہ غصّے میں بھی اپنے پیار کا واسطہ دے کر خوشبو کے زخموں پر خود ہی مرہم لگاتا رہتا ہے! اکثر شرمسار بھی ہو جاتا ہے لیکن رات گئی بات گئی! وہ سو جاتا ہے اور بیوی کو یوں بھول جاتا ہے گویا زندگی کے سفر میں جو اُس کی ہم سفر ہے وہ پل دو پل کی ہم نفس اور ہمنوا ہونے کے بجائے چند قدموں کا ساتھ دینے والی ایک شناسا راہی بن جاتی ہے!

خوشبو کی کہانی بھی اُس کی زندگی کی طرح رنگ وبو کے بغیر گزر چکی ہے اُس کی ماں جب بھی اُس کو نہلاتی تھی تب وہ یوں محسوس کرتی تھی جیسے چار سو خوشبو پھیلی ہوئی ہو! وہ اپنی سہیلیوں کو فخر سے یہ کہا کرتی تھی کہ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں، زمین سے پوچھ کر دیکھ لو، وہ بھی یہی کہے گی! یہی غنچے کو کھلنے دو تو وہ اپنی خوشبو سے اپنی شناخت کروا دے گی! جبھی تو ماں نے خوشبو کو یہ نام دیا تھا!

خوشبو ادھ کھلے گلاب کی طرح مہک کر گاؤں والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی! دل پھینک لڑکے تو کیا سنجیدہ لڑکے بھی خوشبو کی طرف کھنچے چلے آتے تھے! مگر خوشبو نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کھلے پُرکشش گلاب کی مہک کو قید نہیں کیا جا سکتا بلکہ پکڑا بھی نہیں جا سکتا! لیکن ایک لڑکا ایسا تھا جو جوان ہو کر بھی خوشبو کو دیکھ کر نہ دل پھینک فقرے سنایا کرتا تھا اور نہ ہی دوستی کی آڑ میں شادی کے

ارادوں کوظاہر کیا کرتا تھا! بس وہ خوشبو کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرایا کرتا تھا! وہ جب خوشبو کے قریب آیا کرتا تھا تو وہ شرما کر بھاگ جایا کرتا تھا! ایک اچھے کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان یقیناً گاؤں کے دوسرے جوانی میں قدم رکھنے والوں سے مختلف تھا، حالانکہ گاؤں کے لوگ بلکہ خوشبو کے گھر والے بھی اس الگ تھلگ رہنے والے نوجوان کو اپنے ماں باپ کا 'بگڑا ہوا اِکلوتا بیٹا' کے طور پر جانتے تھے! وہ اگر اسکول نہیں جایا کرتا تھا تو ماں باپ اسکول والوں کو قصوروار ٹھہراتے تھے! وہ لوگ اُس کی پٹائی تو کرتے تھے مگر اس لیے کہ وہ کلاس روم میں بھی خراٹے مارتے ہوئے سو جایا کرتا تھا! سارے گاؤں میں اُس کے دو ہی مہربان تھے! ایک اسکول کا چوکیدار اور دوسری خوشبو!

خوشبو جب بھی گاؤں کے مندر، دریا کے کنارے، کسی شادی کی خوشنما تقریبات یا گاؤں کے کسی میلے میں نظر آیا کرتی تھی تو خوشبو اپنے اِرد گرد چاہنے والوں کو یوں پایا کرتی تھی گویا ایک پھول کے اِرد گرد تتلیاں یا شہد کی مکھیاں! مگر خوشبو کی نظریں جس بھنورے کو ڈھونڈتی رہتی تھیں وہ نہایت شائستگی سے دُور بیٹھا اُس کو دیکھتا رہتا تھا اور جب خوشبو ہی بات چیت کا سلسلہ شروع کیا کرتی تھی تو وہ اپنے محبوب کی باتوں میں ذرا بھی چھچھورے پن کی جھلک نہیں پایا کرتی تھی۔ بس یہی باتیں، سلیقہ اور پیار کرنے کے ایک انوکھے پن نے اس کو دل دینے کے لیے مجبور کیا تھا!

پھر ایک دن اپنے لگن منڈپ کو ٹھکرا کر وہ اپنے دیوتا کے پاس گئی تھی! گاؤں والے حیران ہوا ُٹھے تھے کہ خوشبو نے ایک نکمّے کے ساتھ شادی کیوں کی تھی جبکہ خوشبو کو معلوم تھا کہ گاؤں والے اُس کو نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں دیں گے!

خوشبو کو یہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں اور اُس کے ہونٹ پولیس کو دیکھ کر تھرتھرا رہے ہیں کیونکہ آج جو بھی اس کے ساتھ ہوا ہے اس کے ایک ایک لمحے کو یاد کرتے ہوئے وہ سمٹ کر ایک نقطے کی طرح خود کو بے معنی سی محسوس کرنے لگی! دراصل شہر میں آ کر وہ ایک دلدل میں پھنس گئی ہے کیونکہ اُس کا شوہر ڈرگس (Drugs) کا استعمال کر رہا ہے اور وہ خوشبو کا سارا سامان بیچ چکا ہے! اور پھر دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کھانے کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے! آج بھی وہ معمول کی طرح علی الصبح گھر سے نکل پڑی تھی مگر اچانک بارش کی وجہ سے اس کے کپڑے بھیگ کر اُس کے بدن سے چمٹ گئے تھے! فائدہ یہ ہوا تھا کہ اُس کا بدن اور بھی بارش سے ایک گندی سڑک کی طرح ڈھل گیا

تھا! بال گیلے ہو کر اُس کے گلابی گالوں سے چمٹ گئے تھے! مشکل سے وہ ایک نیک خاتون کے گھر میں گھس گئی تھی! خوشبو کی حالت دیکھ کر خاتون نے اُس کو اپنی شادی کا جوڑا پہننے کے لیے دے دیا تھا وہ بھی اس لیے کہ اٹیچی میں رکھے اس خوبصورت قیمتی لباس میں کیڑوں نے ایسے بے شمار چھید کر دِیے تھے جن پر رفو بھی نہیں ہو سکتا تھا!

خوشبو اس لباس میں واقعی بارش سے دُھلے ہوئے ایک کھلے گلاب کی طرح شاداب نظر آ رہی تھی! چونکہ اُس نے اپنے بد بودار کپڑے کسی جگہ چھپا دیے تھے اس لیے وہ مہک کر جب اپنے دوسرے مالکوں کے گھر میں کام کرنے کے لیے داخل ہوتی رہی تو جو نظریں اس کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں وہ یا تو حیرانگی سے دیکھتے رہتے یا پھر للچائی نظروں سے دیکھتے رہتے! ایک رئیس زادے نے اُس کو دھوکے سے دبوچنے کی بھی کوشش کی تھی، مگر شام کو تھکی ہاری خوشبو اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور جب اُس نے اپنی آبرو بچانے کی کہانی اپنے شوہر کو سنا کر اُس کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی تو اُس نے گہری نیند سے جاگ کر اپنی بیوی کے جسم پر دونوں ہاتھ پھیر کر خوشبو کے جسم سے اُس کا لباس اُتار کر اور فاتحانہ قہقہے لگا کر قیمتی لباس کو سمیٹنا چاہا تب خوشبو کو یوں لگا جیسے اُس کا مجازی خدا اس کو اپنے سینے سے لپیٹ کر سہاگ رات منائے گا! مگر اپنے شوہر کے بارے میں اس بار بھی اُس کی سوچ غلط ثابت ہوئی اور سمجھ اُس کی نا سمجھی کی وکالت کرتی رہی!

خوشبو کا شوہر گئی رات جب لباس بیچ کر اور خوشبو سے چھینے ہوئے روپے سے اپنے لیے ڈرگس (Drugs) لے کر آیا تو وہ اپنی زندگی کا واسطہ دے کر اپنی کارکردگی کی وضاحت کرتے ہوئے سو گیا!

خوشبو اب ایک برہنہ عورت ہے، اور سوچ رہی ہے کہ وہ کل اپنے کام پر جانے کے لیے کیا پہنے گی؟ رات بھر کروٹیں بدل بدل کر وہ اپنے بارے میں سوچتی رہی! ایک بدخیال نے اُکسایا تو وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی! کاش میں نے اُس رئیس زادے کے ہاتھ کو جھٹک کر الگ نہ کیا ہوتا تو میں بد بو سے خوشبو بن گئی ہوتی! پھر علی الصبح اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر میں ایسا کرتی تو میں ایک پھول کی خوشبو کی بجائے کاغذ کے پھولوں میں لگائی جانے والی بند بوتلوں میں رکھی عطر کے مانند ہوتی! بکنے والی خوشبو!

اور یہ بات خوشبو کی ماں جان لیتی تو؟

خوشبو رات بھر سسکتی رہی اور سحر کی پہلی کرن دیکھ کر اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے نشے میں چوُر شوہر کو کھلے دروازے پر ایک ڈور میٹ (Door mat) کی طرح دیکھ کر سمجھ گئی کہ جس باغ کا مالی سویا پڑا ہو اُس میں خوشبو سونگھنے والے بھی آتے جاتے رہیں گے اور پھولوں کو کچلنے والے بھی گھُستے رہیں گے! پھول بھاگ بھی نہیں سکتا جبکہ خوشبو کو چار سو پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا!!

OO

بس ایک بار

وہ مجھے شروع شروع میں ایک عام نوکرانی کی طرح احترام سے گڈ مارننگ سر کہہ کر صبح سویرے ایک کپ چائے دیا کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ہمارے پیار محبت اور اپنائیت کے احساسات کی وجہ سے مجھے 'بابا' کہا کرتی تھی اور اور علی الصبح وہ میرے پاؤں دبایا کرتی تھی پھر گھر کا کام کاج کرنے کے بعد "او کے بابا" کہہ کر جانے کی اطلاع دیا کرتی تھی مگر اُس روز نہ اس نے جاتے وقت پلٹ کر دیکھا تھا اور نہ ہاتھ ہلاتے ہوئے گھر جانے کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا!

پھر تب سے اب تک یعنی چھ مہینے کے لمبے وقفے کے بعد بھی جب کال بیل کی آواز سنائی دیتی ہے میں چونک پڑتا ہوں! یاسمین آئی ہوگی؟

شروع شروع میں یاسمین کے بارے میں بولتا رہتا تھا اور تنگ آ کر میری بیوی سخت لہجے میں کہا کرتی تھی کہ وہ نہ تو ہماری رشتے دار تھی اور نہ ناطے دار تھی! ایک بہت اچھی نوکرانی تھی کہیں 'مادی' میں رہنے والے کسی اور نے زیادہ تنخواہ دی ہوگی اس لیے دوسرے گھر میں کام کر رہی ہوگی! آخر مادی میں کروڑ پتی لوگ اپنے بنگلوں میں رہتے ہیں یا انھوں نے اپنے بُنگلات بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مختلف ممالک کے سفیروں یا اونچے عہدوں پر فائز انٹرنیشنل کمپنیوں میں کام کرنے والے اعلیٰ افسروں کو کرائے پر دے رکھے ہیں! مگر میرا دل کچھ اور محسوس کرتے ہوئے اکثر اپنے ہی خیالات یا پھر اپنی خواہشات میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے! یہی وجہ ہے کہ مجھے بابا یعنی پیارے بزرگوار کہنے والی تقریباً چالیس سال کی کنواری عورت جو مجھ اپاہج کی مشکل کُشا تھی وہ میری پُر خلوص خدمت کرنے کے لیے لوٹ کر آ جائے بشرطیکہ اس نے شادی کر کے اپنا گھر نہ بسا لیا ہو تو!

ہم لوگ پچھلے دو سال سے مصر کی راجدھانی قاہرہ کے 'مادی' علاقے میں رہتے ہیں اور یہاں ہر گھر میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والی عزّت دار مذہب پرست اوسط درجے کی عورتیں، پردے میں رہ کر گھریلو کام کرنے کی خاطر ہر بنگلے میں پائی جاتی ہیں! اس کی ضرورت اقتصادی

بحران کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہاں شادیاں صحیح عمر میں نہیں ہو پاتی ہیں اور اس کی وجہ ہمارے ملک کی طرح لڑکوں کی طرف سے جہیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ یہاں کے رواج نرالے ہیں! شادی کے بعد بیٹا اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتا ہے اس لیے شادی سے پہلے اپنا گھر بسانے کے لیے اپنا آشیانہ یا مکان خریدنا پڑتا ہے! گھر کی تمام ضروری چیزیں، جن میں ٹی وی، فریج جیسی سہولیات بھی شامل ہوا کرتی ہیں اور عام طور پر مصر میں مقامی بے روزگاری کی وجہ سے شادی کرنے کے لیے یہ لوازمات پورا کرتے کرتے بیس سال کی لڑکی کو چالیس سال کا شوہر ملتا ہے اور یاسمین جیسی ذہین لڑکی کو چالیس سال کی عمر میں من چاہا شوہر نہیں مل پایا! اس طریقۂ کار کو ایک مناسب ضرورت سمجھا جاتا ہے، عیب نہیں! دنیا کے کسی ملک میں ایسا چلن ہو تو وہاں بد چلنی عروج پر ہو سکتی ہے لیکن یہاں اسلامی قوانین اتنے سخت ہیں کہ عورتوں کا پیچھا کرنے والے مردوں یعنی Eve teasers کو چھ سال کی قیدِ با مشقت کی سزا ملتی ہے! اس لیے یہاں کی لڑکیوں یا پھر عورتوں کو بھی برقعہ پہن کر یا اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے علاوہ جسم کو مکمل طور پر ڈھک کر گئی رات تک بھی بے خوف چلنے پھرنے پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی! خاص بات یہ ہے کہ ہر عمر کی لڑکیوں یا عورتوں کے بال بالکل نظر نہیں آنے چاہئیں! جس لڑکی یا عورت کے بال چھپے نہ ہوں اس کو غیر مسلم سمجھ کر تنگ نہیں کیا جاتا ہے!

یاسمین بھی شروع میں ہمارے گھر کے اندر برقعہ پہنا کرتی تھی لیکن خدا جانے رفتہ رفتہ وہ ہم سب سے گھل مل کر، اپنے آپ کو ہمارے گھر کی فرد سمجھ کر صرف اپنے بالوں کو مکمل ڈھک کر اور اپنی گردن اور سینے کو ایک اسکارف سے لپیٹ کر پہلے میرے دو پوتوں کی کیئر ٹیکر (Caretaker) بن گئی تھی پھر ہم سب کی وہی دیکھ بھال کیا کرتی تھی!

میری دیکھ بھال کے لیے میرے بیٹے نے ایک ایسے پیشہ ور آدمی کو رکھا تھا جو مجھ اپاہج (جو بدبختی سے بول بھی نہیں پاتا) کو لیٹنے میں، لیٹ کر بٹھانے میں، بیٹھ کر لکھنے میں، وہیل چیئر پر بٹھانے میں اور پھر غسل خانے میں لے جانے میں میری مدد کیا کرتا تھا، لیکن انگریزی زبان جاننے کا دعویٰ کرنے والا میری انگریزی میں لکھی تحریر پڑھ کر میرے سلجھے ہوئے کام کو اُلجھا دیا کرتا تھا! یعنی میں قلم مانگتا تو وہ میری بے بسی کا فائدہ اُٹھا کر میرے سامنے رکھا خطوط لکھنے کا پیڈ ہٹا کر مجھے لٹا دیا کرتا تھا! جبکہ یاسمین اس کو عربی زبان میں سمجھا تو دیا کرتی تھی لیکن وہ تھا لکیر کا فقیر! ایک روز میں نے اس کا ایک انوکھا روپ دیکھا! جب خدمت گار نے کروٹ بدلنے کے لیے مجھ پر طاقت

کا استعمال کیا تو میری درد بھری چیخ سُن کر یاسمین میرے درد کی شدّت کم کرنے کے لیے مجھ سے لپٹ گئی اور عربی زبان میں بار بار 'بابا' لفظ کہہ کر اُس کو اتنا ڈانٹا تھا کہ وہ میری بیوی سے اپنی اجرت لے کر گیا تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا تھا! اس سے پہلے کہ میرے گھر والے میری خود مدد کرنے کی کوشش کرتے یاسمین اپنے اونچے قد اور طاقتور جسم کی بدولت مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر بالکونی میں لے جا کر چائے بھی پلا چکی تھی اور میرے تفریح کے لیے وی سی ڈی پر میری پسند کی غزلوں کا سی ڈی بھی لگا گئی تھی!

دراصل وہ میری کیفیت بھانپ کر، خدمت کی آڑ میں میری مدد کیا کرتی تھی! اُس کے حیرت انگیز کارناموں سے متاثر ہو کر میری بیوی نے پوچھ تاچھ کی تھی تو یاسمین نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ میرا ہر کام اور مجھ سے جڑا ہر کام کرنا چاہتی ہے!

اور جو ہمارے اپنے وطن میں بھی ممکن نہیں تھا وہ کارِثواب کرتے ہوئے مصر کی ایک لڑکی کرتی رہی! اس لیے وہ ہمارے گھر کی ایک فرد بن گئی تھی! میری بیوی نے اُس پر ایک ہی پابندی عائد کی تھی! وہ یہ کہ وہ کمروں کی صفائی کرنے کے بعد نہا کر ہی کچن میں جایا کرے گی! اُس کو میری خوشیوں کی خاطر ہماری ہر شرط منظور تھی!

مجھے آسائش کا احساس دلانے کی خاطر یاسمین بلاجھجک کروٹ بدلتے وقت میرے سینے سے لپٹ جاتی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا رہتا تھا کہ ایک بیٹی باپ سے لپٹ گئی ہے!

قربتوں نے ہم دونوں کو اشاروں سے ایک دوسرے کی باتیں سمجھنے کا موقع فراہم کیا! یاسمین پاس ہوتی تھی تو مجھے چار سو پھیلی خوشبو کا احساس سکونِ روح ثابت ہوا کرتی تھی!

یاسمین میرے دونوں پوتوں کو اچھی لگتی تھی! بہو اور بیٹے دونوں کے لیے احساسِ راحت ہوا کرتی تھی جبکہ میری بیوی کو یاسمین پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے معذور شوہر کو، جس کو وہ دہلی میں اپنے قریبی رشتے داروں کے سہارے ایک گھنٹے کے لیے بھی چھوڑ کر کہیں نہیں جایا کرتی تھی، ایک مصری لڑکی جس کے بارے میں اس کے گھر کا پتا بھی نہیں تھا، کی دیکھ بھال میں چھوڑ کر اپنی بہو کی کار میں خرید و فروخت کے لیے مارکیٹ جایا کرتی تھی بلکہ ہندوستان اور پاکستان سے مادی میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرنے جایا کرتی تھی!

جب گھر میں صرف میں اور یاسمین ہوا کرتے تھے تو میں سویا رہتا تھا یا لکھتا پڑھتا اور غزلیں سنتا رہتا تھا اور یاسمین پاس ... کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتی تھی اور بچوں کے

کھلونوں سے کھیلا کرتی تھی! مگر اُس روز جو ہوا اُس کو سانحہ ہی کہا جا سکتا ہے!

میری بیوی کی پاکستانی سہیلی نسیم کو آنکھ کے آپریشن کے لیے ڈیٹ مل گئی تھی، میری بیوی کیٹرایت یعنی موتی بند کا آپریشن دہلی میں کرا چکی تھی اس لیے وہ میری بیوی کو ذاتی تجربے کی وجہ سے بحثیت ایک صلاح کار ساتھ لے گئی تھی یا پھر پردیس میں کسی اپنے کو ایک ہمدرد جان کر لے گئی تھی! کار چونکہ میری بہو نے ہی ڈرائیو کرنی تھی اس لیے اس کا ساتھ جانا لازمی تھا اس لیے گھر میں میرے ساتھ صرف یاسمین تھی! مجھے دوائی دینے کے بعد جب میں معمول کی طرح سو گیا تھا تب اُس نے گھر کی صفائی کی تھی اور کچن میں جانے سے پہلے غسل کرنے گئی تھی! میں تب بھی اور اب بھی عادتاً ایک کروٹ لے کر آنکھیں بند کرتا ہوں پھر دوائی کے اثر سے دو تین گھنٹے سو جاتا ہوں بشرطیکہ کوئی مجھے جگا نہ دے یا میرے بازو یا ٹانگ بیماری کی وجہ سے اکڑ جائے اور درد کی شدت جگا نہ دے! ایسی صورتِ حال کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے اور اِس عذابِ شدید کا واحد حل یہ ہے کہ میری ٹانگیں پلنگ سے گھسیٹ کر، پلنگ کے سہارے ٹکا کر مجھے سینے سے لگا کر بہت ہی احتیاط سے کھڑا کرنے کے بعد ہی ٹانگوں کو الگ کیا جا سکتا ہے! میں درد کی شدت کو برداشت کرتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا یاسمین دوسرے مددگار کے بغیر یہ مشکل کام نہیں کر پائے گی اس لیے درد کی شدت میں جو چیخ نکلی وہ یاسمین نے سن لی اور وہ کھلے بٹن والی قمیض پہنی ہوئی میرے قریب آئی اور پلنگ پر پڑی چادر سے اپنی ننگی ٹانگوں کو چھپا کر میرے جسم کا جائزہ لے کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں میری پیٹھ سے لپٹ کر Pain yes Pain yes بڑبڑاتی رہی! میں سر نیچے کر کے لیٹا تھا اور اپنی ٹانگوں کو الگ کرنے کی ناکام کوشش میں میری ناک سرہانے سے یوں چپک گئی تھی گویا ہر سانس روئی سے کھینچ کر آ رہا تھا اور ہر سانس کو آخری سانس سمجھتا رہا! اچانک جھٹکا لگا اور میں سیدھا ہو گیا! یاسمین مجھ سے لپٹی رہی اور خوش ہو کر کہتی رہی Wait-Wait یارب، یارب! کیونکہ ایک بار ایسی ہی صورتِ حال سے میں گزر چکا تھا اور اُس روز میرے مددگار کے علاوہ میرا بیٹا، بیوی اور بہو نے مل کر مجھے اس آزار سے آزاد کیا تھا! لیکن اس بار نہ جانے کیسے یاسمین نے مجھے گلے لگا کر اٹھا لیا تھا اور پھر میرے جسم کو یوں کس لیا تھا کہ میرے جسم میں گویا نئی روح داخل ہو گئی تھی! یاسمین میری آنکھوں میں خوشی تلاش کر رہی تھیں جبکہ میری صحت یاب نگاہیں یاسمین کے سنہرے بالوں سے ٹپک رہے پانی کے قطروں پر جمی رہتی تھی! پھر اُس کی صراحی دار گردن سے سرک کر یاسمین کے پُرکشش سینے کے اُبھار پر جب رُک گئی تھیں! تب جانے مجھ میں وہ قوت کہاں سے آ گئی کہ میں نے یاسمین کو

کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا اور یوں محسوس کرتا رہا کہ مارک انٹونی نے قلو پطرہ کو گلے سے لگایا ہے! ان چند لمحات کے دوران میں نے غیر دانستہ طور پر نہ جانے کون سی ایسی ناز یبا حرکت کی تھی کہ وہ میری گرفت سے نکل جانے کی کوشش کرتی ہوئی رو رہی تھی! وہ روز کی طرح مجھ سے لپٹ کر خوشی کے آنسو بہا رہی تھی یا پھر ہمدردی کی اشک باری تھی اور یا پھر وہ افسردگی کی بارش تھی؟ یہ میں اس وقت سمجھ نہیں پایا تھا! دوائیوں کے اثر سے میں گہری سوچ میں ڈوبنے کی بجائے نہ چاہتے ہوئے بھی پھر سو گیا تھا! یاسمین نے معمول کی طرح مجھے آرام سے سوجانے کے لیے میری ٹانگوں پر کمبل ڈال کر اے سی آن کیا تھا اور وہ اپنا برقعہ پہن کر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی! میری بیوی اور بہو یاسمین کے اچانک گھر میں بھی برقعہ پہن کر کچن میں کام کرنے کی وجہ پوچھنے کی بجائے مجھے جگانے کی کوشش کرتی رہیں تا کہ میں وقت پر دوپہر کا کھانا کھا کر دوائی لے سکوں! میں جاگا اور یاسمین کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے آج جلدی اپنے گھر جانا چاہتی تھی!

میرے دل میں چور تھا اس لیے یاسمین کو آواز دے کر جونہی بلایا وہ سامنے کھڑی تو ہو گئی تھی! مگر اس کے چہرے پر خوشی کی بجائے غمزدگی کے تاثرات تھے! وہ یوں نظر آ رہی تھی جیسے ایک بجھے ہوئے دِیے کی بے نُور باتی!!

میں نے کہا کہ کڑاکے کی گرمی میں یہ برقعہ پہن کر سفر کرنا مشکل ہوگا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور چلی گئی اور پھر لوٹ کر نہیں آئی!—!!

یاسمین کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں ایک عیسائی نوکرانی آئی، چونکہ وہ کسی سفیر کے گھر کام کر چکی تھی اس لیے اپنے آپ کو ہاؤس کیپر سمجھتی تھی! انگریزی روانی سے بولتی تھی حالانکہ وہ بھی یاسمین کی طرح قاہرہ کی رہنے والی تھی!

پھر ایک دن گویا مجھ پر بجلی گر پڑی!

ہماری ہاؤس کیپر جس کا نام ہمیں معلوم نہیں تھا، نے میرے کاغذات میں ایک صفحہ دیکھ لیا جس پر عربی میں کچھ لکھا تھا! میرے انکار کرنے پر کہ نہ یہ صفحہ میری کسی کہانی کا حصّہ ہے اور نہ مجھے عربی زبان آتی ہے، اس نے تحریر پڑھ لی تھی! مجھ سے، میرے بیٹے کے اشارے دے کر اس کے بہت اچھے کردار سے مطمئن ہو کر سنجیدگی سے عبارت پڑھ کر مجھے اُس کا مفہوم سمجھا دیا! تحریر یاسمین کی تھی، یہ اُس نے پہلے بتا دیا تھا!

بابا کے حوالے سے یاسمین نے لکھا تھا کہ مرد سولہ سال کا ہو یا ستر سال کا، عورت کے کھلے بال اور عریاں گردن، چھاتی اور جسم دیکھ کر انسان سے شیطان بن جاتا ہے! لڑکپن میں جنسی خواہشات کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں، جوانی میں جنسی لذت کی خواہش ایک جنگل کی آگ جیسی شدت اختیار کر لیتی ہے جبکہ بوڑھاپے میں جنسی خواہشات ایسی ہوائیں پیدا کرتی ہیں جو راکھ کے نیچے دبے ادھ بجھے انگارے تلاش کرتی ہیں، اس لیے بابا کہتے ہیں کہ برقعہ شیطان کو دُور رکھتا ہے!

تب چند لمحات کے لیے میں اس لیے چونک پڑا تھا کہ یاسمین نے جو باتیں میرے حوالے سے لکھ دی تھیں وہ میں نے اس کو کبھی بتائی نہیں تھیں! مگر جب یہ جانکاری مِلی کہ اُس نے اپنے 'بابا' یعنی والد کے حوالے سے لکھ دی ہیں تو مجھ پر ایک انوکھی کیفیت طاری ہو گئی!

یاسمین مجھے 'بابا' کے لقب سے مخاطب ہوا کرتی تھی نا!۔؟

تب سے میں شرمندگی کے احساس سے گویا زمین میں دھنستا جا رہا ہوں! اور تب سے اب تک زمین کی تہیں کاٹ کاٹ کر پاتال کی آگ کی تپش محسوس کر رہا ہوں! دل چاہتا ہے کہ ایک بار یاسمین میرے پاس آجائے تاکہ میں اس کے سامنے بحیثیت ایک مجرم کھڑا ہو کر خود ہی عادل بن کر بلوامنگل کی طرح اپنی آنکھیں نوچ کر سورداس بن جاؤں!

لوٹ کر آجاؤ یاسمین!

اپنے بابا کے پاس!

بیٹی! بس ایک بار!!

OO

خوشی

توبہ؟ توبہ!! توبہ توبہ!؟ تم توبہ توبہ کیوں... میری بات کاٹ کرتم... ہاں ہاں فون کاٹنے سے پہلے میری پوری بات تو سن لو... وہ کل کہا تھا... تب میں نشے میں تھا... لکشمی کی بات اس لیے کی تھی کیونکہ میرا امریکن دوست اس کو میری بیوی سمجھ بیٹھا تھا... سنو سنو... تم خود بھی اس کو ایک پتی ورتا پتنی کا درجہ دے چکی ہو... لیکن تمھاری آدھی بات میں سچائی ہے... پھر توبہ توبہ... کیوں؟... ویسا نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد... امریکہ میں بچپن گزار کر بھی تم شوہر پر شک کرنے والی ایک عام مشرقی بیوی ہو... اور نہیں تو کیا؟ بات پوری کرلوں تو پوری سچائی بیان کرسکتا ہوں نا...!

سچ تو یہ ہے کہ لکشمی، نارائن سے اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا پیار میں تم سے کرر ہا ہوں... چلو مان لیتا ہوں کہ تم مجھ سے یک طرفہ پیار کرتی ہو جبکہ میں اپنی شراب نوشی کے علاوہ کسی اور سے پیار محبت نہیں کرتا ہوں... بیوی او بیوی! جو ہو چکا ہوتا رہا... بھول جاؤ وہ سب... نہ تم کوئی گلہ کروگی اور نہ میں کوئی شکوہ یا شکایت کروں گا! بس میری باتیں سنتی رہو... نہیں، جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ ایک شرابی کی بے ہوشی میں بڑبڑانے کی بے تکی باتیں نہیں ہیں! اور نہ ایک بگڑے رئیس زادے کے تصورات سے اُبھری ہوئی عیاشی کی ضروریات کی فہرست ہے... وہ اس لیے کہ اس وقت میں نے شراب نہیں پی رکھی ہے... ہاں آواز میں جو لرزش ہے وہ کل رات کی مے نوشی کی تاثیر ہے مگر میری سوچ سمجھ کی آہنی قوت کی وجہ سے میں نے توبہ کرلی ہے... یہ ڈرامہ نہیں ہے... ہاں ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ یہ دنیا بھی ایک اسٹیج ہے اور زندگی بذاتِ خود ایک ڈرامہ ہے... ہاں ہاں ہم سب اپنا اپنا کردار نبھا رہے ہیں... اگر تم اس ڈرامے کی بات کرر ہی ہو تو سمجھ لو کہ زندگی نے کروٹ بدل کر میرا کردار اپنی نظر سے ایک منظر دیکھ کر بدل گیا ہے... گویا انگولی مال جیسا ایک درندہ ایک بودھ

بھکشو بن گیا... یقین کرو میں وہ ڈرامہ نہیں کر رہا ہوں جس میں اندھیرے میں بیٹھے ناظرین پردہ اٹھتے ہی رنگ منچ پر پھیلی رنگ برنگی روشنیوں میں وہ کردار دیکھتے ہیں جو اپنے اپنے گیٹ اپ میں، وہ ہوتے ہیں جو اصلی زندگی میں نہیں ہوتے ہیں... ایک جھوٹ بولنے والے والا ستیہ وادی ہریش چندر بن جاتا ہے... ایک جوان بیوہ ستی ساوتری بن جاتی ہے... غریبوں کا خون چوسنے والا سود خور سخی حاتم بن جاتا ہے! اور نہیں تو کیا؟

اور پھر دوسرے دن وہ جب خالی خالی ہال یا تمبو میں کھڑے ہو کر بے رونق اسٹیج کو دیکھتے ہیں تب زندگی کا اصلی رنگ دیکھ کر یا تو چونک کر شام ہونے کا انتظار کرتے ہیں یا پھر اپنی زندگی کی کہانی کو ایک موڑ دے کر بدل دیتے ہیں... سوکھے سے متاثر لوگ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر نارائن کی طرح شہروں میں سائیکل رکشہ چلاتے ہیں اور ان کی بیویاں گھروں میں کام کرتی ہیں... یا پھر سستی شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں... ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ اپنے خیالات، جذبات، احساسات اور اپنی خواہشات کو سلا کر خود بے ہوش ہو جاتے ہیں، گویا بیابانوں میں کھو جاتے ہیں! لکشمی کی کہانی تو تم نے ہی مجھے سنائی تھی ایک دن اور ایک اپنی بیوی کے کرب کو محسوس کر کے صبح سے گئی رات تک شراب نوشی ترک کرنے کی صلاح دی تھی، لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا... ہاں، ہاں، ہاں... گویا تم نے اہم یا غیر اہم واقعات کو ذہن نشین کر دیا ہے... اگر اس واقعے کا ذکر کل ہوا ہوتا تو میں پھر وہی کہتا جو تب کہا تھا یعنی میرے پڑدادا نے اچھا کیا تھا جو اپنی زمین بیچ کر شہر میں ایک کارخانہ کھولا تھا... دادا امیر تھا اور باپ ایک ملک کا ایک نامور صنعت کار جس نے روپے اُگانے والے اتنے پیڑ لگا دیے ہیں کہ اگلی دس پشتیں بھی کام کیے بغیر گھر بیٹھے عیاشی کر سکتے ہیں... اور میری عیاشی کا ذریعہ شراب نوشی تھا! چونک کیوں پڑی ہو تم؟... اس لیے کہ میں نے شراب نوشی ترک کر دی ہے آج صبح سے... تم ہنس رہی ہو! دیکھو، ہر نیک کام ایک دن شروع ہوتا ہے... نہیں! نہیں! نہ کسی نے اپنے سر کی قسم دی اور نہ کسی مہاتما نے اُپدیش دیا! نہیں! نہیں! وہ بھی نہیں! نہ کسی نے بتلایا، نہ کسی نے جتلایا اور نہ میں پچھتایا... یہ کتابی باتیں ہیں!

ہاں اب بتا دو کیا ہوا! مطلب ایسا کیا ہوا جو میں نے توبہ کر لی؟ یہ ہوئی نا بات! جب تم گھر چھوڑ کر چلی گئی میرا کھانا ہوٹل سے آتا رہا! لکشمی صبح سویرے آ کر برتن صاف کیا کرتی تھی! مجھے نیمو قہوہ پلایا کرتی تھی! گھر کی صفائی کیا کرتی تھی! کپڑے لانڈری سے لایا کرتی تھی! یوں تو وہ ایک

اچھی ہاؤس کیپر (House Keeper) تھی! یہ سوچ کر کہ مجھے صبح سویرے جاگ کر دروازہ کھولنا پڑتا تھا اس لیے میں نے گھر کی چابیاں لکشمی کو دے دی تھیں... کیا کیا؟ ہاں وہ سب کچھ لوٹ کر چلی جاتی تو؟ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا ہے... اچھی صورت والی لکشمی اچھی سیرت والی عورت بھی ہے! پھر وہی مشرقی عورت کی سوچ... تم جانتی ہو کہ میں... پھر ایسی باتیں کر کے کیوں؟ ٹھیک ہے ٹھیک ہے! سناتا ہوں... میں نے اس عورت کے چہرے میں زندگی کو اپنے رنگ میں دیکھا ہے! موسمِ بہار کو گویا نکھرتے ہوئے دیکھا ہے موسمِ خزاں کو مرجھاتے ہوئے دیکھا ہے... جانے کیوں میں مصنوعی زندگی میں اپنے روح کو سکون دینے والی خوشیاں ڈھونڈتا رہا!... ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ آنکھوں میں آنسو ہوں تو نظر دُھندلا جاتی ہے! ہاں غم کے بہتے ہوئے آنسو روکنا ممکن نہیں جبکہ خوشی کے آنسو نکل کر بہہ جاتے ہیں! آستین کو بھگو نہیں دیتے!... ضروری نہیں کہ ہر سنجیدہ بات میں فلسفے کی چاشنی ہو! نہیں نہیں! میری سوچ اور سمجھ کو دیوانگی کا نام مت دو! نہیں نہیں! میں جواب بتا دینا چاہتا ہوں، یعنی وجہِ توبہ کیا ہے، کسی مفکر کے اقوالِ زرّیں سے منسوب مت کر دینا... وہ اس لیے کہ یہ میرا جائزہ ہے، میرا مشاہدہ ہے... تمھارے ہنسنے میں مجھے طنز کی کھنک سنائی دے رہی ہے!... اس لیے فون رکھ دیتا ہوں! لگتا ہے کہ تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے!... ہیلو! اب تم نے فون کیوں کیا؟ اچھا کیا جو فون کیا ورنہ میں شاید... ہاں اپنے بے ساختہ قہقہے کو روک نہیں پایا... نہیں! ایسی بات نہیں کہ غم ہو یا خوشی، صدمات ہوں یا شادیانے ہوں، پینے والوں کو پینے کا بہانہ چاہیے... ہاں میرا عزمِ توبہ بلند ہے، اتنا بلند کہ ڈگمگانے کا ڈر نہیں ہے... ٹھیک ہے، میں تمہید باندھے بغیر بتا دیتا ہوں کہ یہ کرشمہ ہوا کیسے... دراصل ایک طویل عرصے کے بعد تمھاری آواز سن رہا ہوں تو! نہیں غصہ نہیں! پیار آ رہا ہے!... تم پر! سچ مچ!!

لکشمی کو دیکھ کر لگ رہا ہے جیسے تم میرے سامنے ہو! بے فکر ہو کر سو رہی ہے! تمھیں غصہ آ رہا ہے؟ مگر کیوں؟ پوری بات سن کر فوراً چلی آنا... کون بہک گیا ہے کون بھٹک گیا ہے اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے! ہیلو؟... ہیلو؟... ہیلو ہیلو!! تم سن رہی ہو نا؟... ہاں! میں لکشمی کی بات کر رہا ہوں، تمھارا پرانا گاؤن پہن رکھا ہے! بال کھلے ہیں بالکل تمھاری طرح! کل شام میرا ایک امریکن دوست میرے گھر آیا تھا! تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا، تم جانتی ہو کہ بوتل کبھی خالی نہیں کرتا اور پھر کسی شام مختلف بوتلوں، بچی ہوئی مختلف برانڈ کی اسکاچ کی کاک ٹیل بنا کر اپنے خاص دوستوں کو

پلاتا رہتا ہوں! کل بھی میں نے چاہا تھا کہ اپنے دوست کو کاک ٹیل پلا دوں مگر میرے نجی بار میں جتنی بھی بوتلیں تھیں سب بند تھیں، میں نے اپنے دوست کے لیے ایک نئی بوتل کھولتے ہوئے مسکراتے ہوئے یہ کہا کہ میری درجن بھر بوتلوں میں وہسکی کے ریزیڈیولز (Residuals) تھے تو اس نے لکشمی کو میری بیوی سمجھ کر کہہ دیا کہ بھابھی پی گئی ہوگی، میں نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اگر وہ پی لیتی تو وہ مجھ سے بھاگتی کیوں؟... ہاں تم نے صحیح جواب دیا! لکشمی اپنے تھکے ہارے شوہر کو روز اسکاچ وہسکی بھی پلاتی رہی اور ہوٹل سے لائے ہوئے کھانے میں بچا ہوا کھانا کھلا کر اتنا خوش کیا کرتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی مدد کرنے کی خاطر روز شام کو آیا کرتا تھا! میں شوہر کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا! آزمانے کے لیے میں نے جب اپنا بٹوہ میز پر رکھ دیا تو نارائن نے بٹوہ میز سے اٹھا کر میرے سرہانے کے نیچے رکھ دیا تھا! دونوں میاں بیوی جب اپنے گھر جایا کرتے تھے تب وہ زبردست بارش میں بھی میرا اچھا تایارین کوٹ اپنے ساتھ نہیں لیا کرتے تھے! تمھیں میری باتوں پر یقین کرنا ہوگا...اور نہیں تو کیا!...!

ایک شام میں نے خود اپنا امریکن جیکٹ اس کو دیا تھا! اس روز میں نے لکشمی کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک دیکھی تھی! کل رات میں نے وہسکی کی آدھی بوتل اپنے بار میں رکھ دی تھی! آج دس بجے بھی جب لکشمی میرے لیے قہوہ نہیں لائی تو میں خود کچن میں چلا گیا اور وہاں لکشمی اور نارائن فرش پر ایک دوسرے سے لپٹ کر سوئے پڑے تھے!...انھوں نے ہوٹل سے آیا ہوا ٹفن صاف کر کے میز پر رکھ دیا تھا اور اسکاچ کی بوتل خالی کر کے فرش کے کونے میں رکھ دی تھی! سوچو تو ذرا کیا ہوا ہوگا... ہاں! بالکل! میرا بھی یہی اندازہ ہے! انھوں نے میرا جھوٹا کھانا اور جھوٹی وہسکی پی لی تھی! پیتے پیتے دونوں کو یہ پتا نہیں چلا ہوگا کہ ایک اچھی وہسکی رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھاتی ہے اس لیے جیسے کھانا برتنوں کو چاٹ کر ختم کر دیا تھا ویسے ہی انھوں نے وہسکی کی آخری بوند بھی پی لی تھی! اور نہیں تو کیا!

میں دونوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان کی مستی کے پس پردہ اعلیٰ معیار کی وہسکی ہے؟ اعلیٰ معیار کا کھانا ہے؟ پیٹ بھر کر کھانا کھانا ہے؟ یا ایک دوسرے کی چاہتوں کی قدر کرنے کی وجہ ہے... ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں کسی نے اپنا سلیقہ بدل کر ایک جھرنے کو ندی میں ڈال دیا ہو... ہاں! ہنسی آ گئی کیونکہ میری ہر بات سن کر یا تو بات کو کاٹ دیتی ہو، ہنس پڑو تو اس میں غصہ ورنہ طنز کی ملاوٹ ہوتی ہے یا پھر تب تک کہ میری توجہ کو شک کے شکنجے میں ڈال دیتی ہو! ترنم میں سچ کی

سرگم ہے، ڈرامائی بناوٹ ہے... تم اچانک خاموش کیوں ہوگئیں؟ مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا! یا اپنے آپ سے وفا کروں گا ورنہ جفا کرنے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا! فیصلہ تم کو کرنا ہوگا کہ میں توبہ کرلوں یا تم توبہ کرلوگی؟ فون رکھ دیتا ہوں!

ہاں! پھر فون کرر ہا ہوں... کرنا ہی پڑا، کیوں؟ سن سکو تو سن لو! شام ہونے کو ہے اور میں حسبِ عادت نئی بوتل کھولنے گیا تھا... پھر توبہ توبہ؟ تو کیا تم جانتی تھی کہ میں... پہلی بار غلط سوچا... ہاں! میں نے بوتل کھول تو دی مگر ساری کی ساری خالی کردی! پی کر نہیں... فرش پر پھینک کر! جانتی ہو کیوں؟ لکشمی اور نارائن اس وقت بھی ساتھ ساتھ نظر آ رہے ہیں! مجھے نارائن کی تقدیر پر رشک آ رہا ہے اور لکشمی پر پیار آنے لگا ہے! پھر اس کو میں چوم بھی سکتا تھا، ہاں! بے ہوش مریضہ کو کیسے پتہ چلتا کہ اس پر کس نے کب نشتر چلایا!... نہیں نہیں! تم توبہ توبہ نہیں کہوگی... کیونکہ میں اپنی خوشی کے لیے درندہ نہیں بن سکتا! ویسا ہوتا تو تم سے یہ کہنے نہیں آتا کہ بیوی او بیوی! درست ہے میرا عزمِ توبہ! چلی آؤ کہ ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک نئی شناسائی کرلیں اور ایک دوسرے کی پذیرائی شروع کرلیں... جشنِ پارسائی! چلی آؤ! چلی آؤ میرے پاس میری خوشی! چلی آؤ!! میں دہلیز پر کھڑا ہو کر، اپنے بازو پھیلا کر اور آنکھیں بند کر کے تمھارے لمس کا انتظار کرتا رہوں گا!! سحر!

OO

فیصلہ

بوڑھا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا اور بوڑھے کے بیٹے بیٹیاں، پوتیاں پوتے اُس کے اِردگرد بیٹھ کر اُس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے!

بوڑھا ان سب کو آنکھوں دیکھا حال سنا رہا تھا، گویا سنجے مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہا ہو! بوڑھی ان سب سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے بچّے کو گلے سے لگا کر دہلیز پر بیٹھی دُور دُور تک نظریں دوڑا کر سمندر کو دیکھ رہی تھی — غالبًا وہ کسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی! بے صبری سے اپنے پھولتے ہوئے سانسوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے!

لڑائی جاری تھی اور مقابلہ سخت تھا!

دونوں جب ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے تو زمین کانپ جاتی تھی! آسمان تھرتھرانے لگتا تھا اور دونوں کی آوازیوں گونجتی تھی جیسے بادلوں کو گرج یا آتش فشاں پہاڑ پھٹ جانے کی آوازیں!

مقابلہ برابر تھا اور بوڑھا تذبذب میں تھا کہ فیصلہ کس کے حق میں دیا جائے کیونکہ ایک نے للکارا تو دوسرے نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا! اور یوں حملہ اور جوابی حملہ برابر جاری تھا!

''شطرنج کی بازی جیت کر اتنے مغرور ہو گئے! توڑ دوں گا تمھارا اَنا کی اونچی اونچی دیواروں کو!''

''میرے قلعے ریت پر نہیں بنے ہیں! میرے قلعے کی اونچی اونچی فصیلیں دیکھنے کی کوشش مت کرو! سر پر رکھا تاج گر جائے گا راجے!''

''راجے نہیں! مہاراجے کہو گستاخ!!''

''ہا...... ہا...... ہا......''

''دانت دکھانے کی بجائے اپنی طاقت آزماؤ!''

''تمھاری جوانی پر ترس آ رہا ہے!''

''تمھارے بُڑھاپے پر ترس کھانا سانپ کو دُودھ پلانا ہے!''

"خبردار! یہ جنگ کا بگل ہے!"

اور دونوں لڑتے رہے!

جیسے رستم اور سہراب!

اور پھر بھیانک جنگ! گھمسان کی لڑائی!

دنگل، کشتیاں، تلوار بازی، نیزہ بازی!

تیر کمان — زہریلے تیر چلا کر!

گھوڑوں پر سوار ہو کر!

اُونٹوں پر سوار ہو کر!

ہاتھیوں پر سوار ہو کر!

زرہ بکتر پہن کر!

سمندری بیڑے لے کر!

کوروکشیتر کے میدان میں

پانی پت کے میدان میں!

سمندر میں!

صحرا میں!

فضا میں!

مہابھارت، کالنگا، واٹرلو اور جنگِ عظیم!

جرّار لے کر!

توپیں لے کر!

بم لے کر!

اور مقابلہ جاری تھا!

کون غازی، کون سلطان!

کون عظیم — کون مہان!

کون شہید — کون غدّار!

بوڑھا تذبذب میں تھا کہ کسی کے حق میں فیصلہ دیا جائے!

پھر پوشاکیں بدلتی رہیں!

مقابلے کے طورطریقے بدلتے رہے!

جب عیّاری اور مکّاری کا استعمال ہوا تو بوڑھا ہنس پڑا!

غالباً اس لیے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے لبادے تار تار کر دیئے اور دونوں اور دونوں ننگے ہو گئے! الف ننگے!

پھر جھوٹ کی دُھند پھیلائی گئی! افواہیں اُڑائی گئیں مذہب کے نام پر — رنگ ونسل کے نام پر!

مقابلہ ہوتا رہا اور بوڑھا آنکھوں دیکھا حال سناتا رہا!

مقابلہ برابر تھا!

کوئی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں! مگر دونوں جھاڑیوں کے پیچھے چُھپ کر! ایک دوسرے پر کڑی نگاہ رکھنے لگے!

طیّاروں میں گشتی اُڑان کرتے رہے! اور پھر اچانک —

جنگِ میدان سے ہٹ کر بند کمروں میں جاری رہی!

سرگوشیانہ انداز میں!

وضع داری کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے —

عالمانہ انداز میں!

مفکروں کا ساتھ لے کر!

فلسفوں کی چاشنی میں خودغرضی کی ملاوٹ کرتے ہوئے!

ٹکّر برابر رہی!!

گلاس سے گلاس ٹکرا کر دونوں مسکراتے ہوئے کہتے رہے!

"خون خرابہ ٹالنے کی کوشش کیجیے جناب! فقط یہ سمجھ کر کہ آپ بکری ہیں اور مَیں شیر — شیر ببر!

"مالک کون ہے یہ سبھی جانتے ہیں! اور آپ یہ جان لیجیے کہ مَیں شکاری کتا ہوں!"

"تواریخ کا حوالہ دے کر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیئے جا رہے ہیں!"

"یہ تو سوچئے جناب کہ چوہوں کی بھی مونچھیں ہوتی ہیں!"

"چوہے بڑی بڑی پھانکوں کو بھی کُتر کُتر کر کھوکھلا بنا دیتے ہیں!"

"اس سے پہلے ہی مَیں سانپ بن کر تمھیں نگل جاؤں گا!

''اور مَیں نیولا بن کر تمھیں چباڈالوں گا!''

''ڈیڈلاک'' بوڑھا چلانے لگا! مگر جنگ جاری تھی!

ہتھیاروں کا استعمال بند ہوا!

مفاہمت کا بیج بھی بنجر زمین میں دَب گیا!

اور طاقت کا مظاہرہ جادوئی کرشمات کی شکل اختیار کر گیا!

ایک جادوگر نے جادو کی شیشی میں جھانک کر دشمن کو دیکھ لیا تو دوسرے نے اپنے دشمن کے قدموں کی آہٹ ہزاروں میل دُور رہ کر بھی سُنی!

ایک جادوگر نے اپنے طلسم سے آندھی طوفان پیدا کر کے بستیاں اُجاڑ دیں! اور دوسرا سانپ بن کر اُجڑے گھروں میں گھسنے لگا!

ایک طلسم سے ہاتھی بن گیا تو دوسرا مچھر بن کر مقابلے کے لیے آگے بڑھتا گیا! ہاتھی ایک جھٹکے کے ساتھ موتی کا ایک دانہ بن گیا اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا! جیسے میگزین میں رکھا ایٹم بم!

مچھر نے مُرغے کی شکل اختیار کر کے فوراً موتی کے دانے کو ڈھونڈ نکالا! اور اسے کھا گیا!

کہانی ختم! — بوڑھا چلاّنے لگا!

بوڑھی چونک گئی! مگر بوڑھے کی آواز سن کر نہیں — بلکہ — دُور سے قریب آتی ہوئی ایک کشتی دیکھ کر!

بچّے کہانی سے لطف اندوز ہو گئے — گویا تواریخ کے اوراق پڑھ رہے ہوں! مگر جوان مرد عورتیں مُرغے کو دیکھتے رہے جو جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے موتیوں کے ڈھیر کو ٹک ٹک کر کے کھا رہا تھا!

اچانک مُرغے نے اپنا پیٹ پھولتا ہوا محسوس کیا تو وہ فوراً مینڈک بن گیا!

مینڈک کا جسم خوب پھول گیا اور ایک زور کا دھماکہ ہوا! تالاب میں کودنے سے پہلے مینڈک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا جیسے ہیروشیما کی عمارتیں — ناگاساکی کا وجود!

موتی کا دانہ پھر انسان بن گیا! مگر اس سے پہلے کہ وہ خاقان ہٹلر یا زمین آسمان چاند ستاروں کا مالک ہونے کا دعویٰ کرتا زمین ہلنے لگی اور وہ کانپنے لگا!

بوڑھے نے چیخ کر کہا! ''زلزلہ......قہرِ خدا!''

جوان مرد عورتوں نے چلاّنا شروع کیا!

''جنگ، جنگِ عظیم اور تیے نہایت دلچسپ ہے…… کی باتیں سنتے ہے!

''زلزلے سے دو لاکھ لوگ مر گئے!'' ایک آواز زمین کے کسی کونے سے اُڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی!

''اب تک جنگ سے چار لاکھ آدمی مارے گئے!''

ہوائیں اپنے ساتھ ایک اور خبر لائیں!

گاؤں تباہ ہوئے —

شہر تباہ ہوئے!

ساری ریاست ختم ہوگئی!

نہ رہی سلطنت اور نہ سلطان! مرنے والوں کی تعداد، دس لاکھ، دس کروڑ، دس ارب!

بچّوں نے معصوم انداز سے بوڑھے سے پوچھا! ''آخری فتح کس کی ہوئی؟''

''کوروؤں کی یا پانڈوؤں کی'' — ہٹلر کی یا سٹالن کی —

''رُوس کی یا امریکہ کی!''

مگر بوڑھی چلاّنے لگی!

''جلدی کرو — جلدی کرو! وہ آ گیا ہے! وہ آ گیا ہے! ساحل پر پہنچ چکا ہے —''

بوڑھی کی آواز کسی نے نہیں سُنی — شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی تھی!

''ہم کہاں جا رہے ہیں!'' ایک چھوٹے سے بچّے نے توتلی زبان میں بوڑھی سے پوچھا! تو بوڑھی اپنی گود میں دو بچّے ایک لڑکا ایک لڑکی اُٹھا کر ساحل کی طرف بہت ہی تیز رفتار جاتے ہوئے اس کارواں میں شامل ہوئی! جس میں پرندے بھی تھے جانور بھی! شیر بھی اور بکرے بھی!

ابر آلودہ آسمان میں ایک سفید کبوتر اپنی چونچ میں ایک گندم کا خوشہ لیے اُڑتا رہا اور ایک عقاب اُس کا پیچھا کرتا رہا!!

جونہی بڑھیا ساحل کے قریب پہنچ گئی، بوڑھے نے کھڑکی بند کر دی!

بوڑھا خاموش تھا! کمرے میں اندھیرا تھا اور خدا اپنا فیصلہ سُنا چکا تھا! اور ایک سفید پوش فرشتہ اپنا سفینہ لے کر ساحل پر پہنچ چکا تھا! بڑھیا نے سفینہ میں قدم رکھا تو سفید کبوتر بادبان پر جا بیٹھا!

پرندے کی آواز سُن کر بوڑھے نے اَدھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو سفینہ حرکت میں آ چکا تھا!

بوڑھا یہ سوچتا رہا کہ خدا کے فیصلے میں کیا سمندر کے تعاون کرنے کا فیصلہ بھی شامل ہے؟!

OO

زندگی

خط کی آخری سطر لکھ کر اس نے اپنی آخری تحریر پڑھ لی، مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دستخط کرتے ہی طے شدہ پروگرام کے تحت، میز پر رکھا ہوا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیتا، گلاس فرش پر گر گیا! اور ایک زبردست جھٹکے۔ نے ساری عمارت کو ایک کھلونے کی طرح ہلا کر رکھ دیا!

گلاس میں ڈالا ہوا زہر قالین کے ریشوں میں جذب ہو گیا اور وہ موت کے بالکل جا کر بھی موت کے آغوش میں نہ سو سکا!

روشن کی عمر ہی کیا ہے جو اس کی زندگی کا دیا ٹمٹمانے لگتا! ۲۰ سال کا یہ خوبرو ناکام عاشق اپنی زندگی کا دیا خود ہی بجھانا چاہتا ہے! شاید جذبات نے اس کے اِرد گرد ایسی دُھند پھیلا دی ہے کہ اسے کوئی دوسرا راستہ نظر ہی نہیں آیا ہے! جہاں سے وہ گزر رہا ہے وہاں اسے زندگی ایک ریگستان نظر آ رہی ہے! ذرّوں کی طرح بکھری ہوئی! پیاسے پریمی کو محبت ایک شراب کی مانند نظر آ رہی ہے! یہی وجہ تھی کہ گھٹ گھٹ کر پانی کی دو بوندوں کے لیے ترس ترس کر مر جانے سے پہلے اپنا سفر وہاں ہی ختم کرنا چاہا ہے! جہاں اس کی محبوبہ اس کو صحرائے عظیم میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے! کسی تیز رفتار اونٹ سوار کے ساتھ محمل ہٹا کر اس کی دیوانگی کی ہنسی اُڑاتی ہوئی!

دیوانے کو دیوانگی منظور نہیں تھی! خواب جب ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر گئے تو ذرّہ ذرّہ سمیٹنے کے بجائے اس نے اپنے وجود کو ان ذرّوں کے نیچے دفن کرنا ہی بہتر سمجھا! اُدھر معشوق کی ڈولی اُٹھی اور اِدھر ایک دل شکستہ عاشق اپنی تڑپتی رُوح کو قفس سے آزاد کرنے کے منصوبے بناتا رہا!

سوچ کی انتہا حیرت ہے مگر وہ اپنے ارادے سے نہ تو حیران تھا اور نہ ہی پریشان! پھر اس کے یہ ارادے اسے خوفزدہ کر کے راستہ بدلنے کے لیے کیونکر اُکساتے؟ تبھی تو اس کے ارادے مصمم تھے!

ایک کوشش ناکام ہوئی تو خودکشی کی بہت ساری ترکیبیں اس کے ذہن میں اُبھرنے لگیں!

پنکھا اور پھانسی کا پھندہ یا بجلی کی ننگی تار! یا پھر کمرے یعنی ہوٹل کی ساتویں منزل سے کود کر جان دے! کیا کرے اور کیا نہ کرے! وہ کولہو کے بیل کی طرح کمرے کے اندر چکّر لگا تا رہا اور بار بار اپنی تحریر پڑھتا رہا!

''میں اپنے آپ سے گھبرا کر اپنے آپ سے دُور ہونا چاہتا ہوں! زندگی کا دامن چھوڑ کر موت کی چادر اوڑھ کر!''

آخر جب جذبات، خیالات، احساسات ایک ہی شکل اختیار کر کے اس کے مصمم ارادے کے بھاری بوجھ کے نیچے دَب گئے تو اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کھول دی مگر اس جھٹکے کے ساتھ ساری عمارت کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگ گیا! درودیوار یوں ہلنے لگے جیسے کسی مرگی کے مریض کو دَورے پڑ رہے ہوں!

اچانک بجلی بند ہوگئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا! رات کے دو بجے غیر فطری طور پر پرندوں نے زبردست شور مچانا شروع کیا! کتّے یوں بھونکنے لگے گویا ایک بوڑھا باپ جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر نوحہ خوانی کر رہا ہو! اور پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا!!

''بچاؤ، بچاؤ!'' آس پاس زبردست بدحواسی پھیل گئی!

''بھاگو! بھاگو!'' ہر طرف آوازیں یوں گونجنے لگیں گویا سائرن بج رہا ہو!

''جاگو! جاگو! سونے والو جاگو!!''

''زلزلہ! زلزلہ!!''

''مر گئے! مر گئے! ارے کوئی بچاؤ!!''

''یا خدا یہ کیسا قہر!''

''دیواریں گرنے لگی ہیں! باہر نکلو!''

''ماں تم کہاں ہو؟''

''بیٹے!''

''ایک اور جھٹکا لگا ہے!''

''زندگی پیاری ہے تو دَوڑ لگاؤ!''

''اور تیز! کھلا میدان فقط ایک کلومیٹر دُور ہے!''

''اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا ہے!''

''لو اسکول کی بلڈنگ بھی گر گئی شاید!''

''لگتا ہے اَن دیکھی بمباری ہو رہی ہے!''

''بارود نہیں! زمین پھٹ رہی ہے!''

ایسا زلزلہ اس علاقہ میں پہلے کبھی بھی نہیں آیا تھا اپنے بچاؤ کی خاطر بہت ہی تیز رفتار سے دوڑنے والے مرد، عورتیں، بچّے، بوڑھے، یہاں تک کہ مریض گرتے سنبھلتے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے یا تو صدائیں، آہ وزاریاں، چیخ وپکار سنتے رہے یا پھر موت کے قدموں کی آہٹ جو بار بار یوں سنائی دے رہی تھی جیسے گنبد کی گونج نہایت ڈراؤنی!

زلزلے نے علاقے کو یوں تباہ وبرباد کر دیا تھا جیسے بچّوں کے بنائے گھروندوں کو کسی ظالم نے ٹھوکریں مار مار کر مسمار کر دیا ہو! مکان ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے! اور لاشیں ملبے کے نیچے دَب کر اپنا مرثیہ خود پڑھتے ہوئے نظر آ رہی تھیں! مگر کچھ لوگ جو شور وغل کی آواز سنتے ہی فوراً اپنی جان بچانے کی خاطر جوں توں ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے تھے! وہ سب بچ گئے تھے!

بچنے والے ان خوش نصیبوں میں روشن بھی تھا!!

OO

جرس

سمندر کو یہ اطلاع دنیا بنانے والے بھگوان برہما کے بیٹے نارد منی دی تھی، بلکہ آسمان پر اچانک بادلوں کے ٹکڑوں پر سوار ہو کر سورگ لوک سے اترے ہوئے دیوی دیوتاؤں نے بھی نہیں دی تھی! یہ اطلاع بہت دور سے آئی ہوئی ایک ہوا کے جھونکے نے دی تھی وہ بھی اس لیے کہ ڈوب رہا جہاز سے نکل کر پانی کی سطح پر آ چکا تھا! وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کسی مردے کے پھیپھڑوں میں پانی سے دَب گیا ہوتا تو وہ بھی باہر کیسے آ سکتا تھا! اور پھر سمندر کی گہرائیوں نے اس کو اوپر نہ جانے دیا ہوتا تو وہ سورج کی روشنی کہاں دیکھ پاتا!!

گویا سمندر اس کا محسن بن گیا تھا اور وہ احسان کا بدلہ چکانے آیا تھا!

ہوا کے جھونکے نے آپ بیتی سنا دینے کی بجائے ایک اُدھ مرے چوہے اور ایک اُدھ مرے شیر ببر کی وہ گفتگو سنا دی جو اس نے جہاز چھوڑنے سے پہلے سن لی تھی!

شیر ببر نے چوہے سے پوچھا تھا!

چوہے؟ سرکس والے چوہوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ لیتے ہیں پھر تم یہاں کیسے آ گئے؟

چوہے نے جواباً کہا تھا!

جب مجھے ایک سفید کبوتر نے یہ اطلاع دی کہ قیامت آنے والی ہے تب سرکس والے کرتب دکھانے والے انسانوں اور حیوانوں کو سمندری جہاز میں لے جا رہے تھے، میں جہاز کو نوح کا سفینہ سمجھ کر داخل ہوا تھا! لیکن اشرف المخلوق کا ظلم دیکھ کر اس قدر کوشش تو کی تھی مگر نا کامیاب ہوا! ورنہ بچ گیا ہوتا! شاید شیر ببر کو غصہ آیا تھا اس لیے بولا تھا!

گویا تم نے یہ کار بد کیا تھا! تم باہر تو نہیں جا سکے مگر پانی اندر آ ہی گیا، میں ناحق مشینی نظام کو کوس رہا تھا جس کا نام سب میرین ہے تو میں جنگل کا راجہ ہوں! اس لیے تمہیں سزا دوں گا، مار ڈالوں گا تمہیں! چوہا ہنس کر آخری بار بولا تھا، مجھے مار ڈالنے کی بجائے اپنے آپ کو بچا کر سمندر کو

ہرادو اور خاقان بن جاؤ!

ہوا کا جھوکا آگے نکل پڑا تو ایک بوڑھی مچھلی نے سمندر سے کہا! تمھیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے! یاد کرو وہ دن جب دیوتاؤں اور راکشوں نے امرت منتھن کر کے تم سے بہت کچھ چھین لیا تھا! اور بھگوان شنکر نے خوز ہر پی کر مفید چیزیں دیوتاؤں کو دی تھیں!؟-!!

وہ دونوں جہان کے مالک بن کر تمھیں بھی اپنا غلام سمجھ رہے ہیں!

سمندر کو یہ بات سمجھ میں آ گئی! پر ایک اونچی لہر نے جب اپنے اِرد گرد اَن گنت چھوٹی چھوٹی لہریں دیکھ لیں تو ایک گہری سوچ کے بعد بڑبڑانے لگا!

سورج، چاند، ستارے اور اَن گنت سیارے، جب ہیں میرے ساتھ! ہوائیں، بادل، بارش اور برف اور گلیشر وں کے ذخیرے ہوں میرے محتاج! کیوں نہ میں آندھی کو بنا کر اپنا سپہ سالار، جیت لوں دنیا کو! اور بن جاؤں سمراٹ، چکروتی خاقانی!

دُور دُور سے نظر آ رہے کناروں پر صدیوں پرانے گلیشروں کو کاٹ کر برف کے پہاڑ نما تودوں کو اپنی فتوحات کے حصے بنا کر اور طاقت سمجھ کر سمندر اپنے محیط کو پھیلاتا رہا! اور پانی کی سطح بڑھاتا رہا! زمین کو ڈبوچتا رہا!!

اچانک لہریں جب کمزور پڑ گئی اور صحرا کی تپتی ہوئی ریت پانی کو چوس چوس کر لہروں کو جب بے اثر کر گئی تب اونچی لہر نے للکار کر صحرا سے اپنی ہار تسلیم کرنے کو کہا!

صدیاں بیت گئیں، میں بھی کبھی تم جیسا ایک ساگر تھا! میں نے جیت کے بھی سب ہارا، کیونکہ یذیدوں نے پانی پی لیا اور میں پیاسا رہ گیا! تمھارا ابھی یہی حال ہوگا جو ہے میرا حال! ہاں جو جاندار تم میں رہتے ہیں وہ دَب جائیں گے، ریت کے نیچے! اور تب صدیوں بعد نکل جائے گا، ریت کی تہوں کے نیچے تیل، پھر تمھیں پانی نہیں ملے گا!

سمندر رُک گیا، جوار بھاٹا تھم گیا! اس سے پہلے کہ سمندر اپنی اِرد گرد لہروں کو واپس لوٹنے کا حکم سناتا ایک اُدھ جھلسا ہوا ہوا ایک پتہ لہر کی گود میں بہت دُور سے دوڑتا بھاگتا بچہ اپنے ہونٹ دکھا کر اپنی شدت کی تشنگی کا اظہار کر رہا ہو!

سمندر کی اونچی لہر نے پوچھا تو پتہ بول پڑا: شاخ سے بچھڑا ہوا پتہ ہوں! ماں سے بچھڑ کر طوفان میں کھو گیا، بچہ ہوں، اڑتے اڑتے یہاں تک آیا ہوں کیا تم اُڑ کر میری ماں کو پانی پلا سکتے ہو؟ ہمارے باغات کو جنگل کی آگ نے لپیٹ لیا ہے! چھوٹی چھوٹی لہروں نے پتے کو جھول جھول

کر سمجھایا کہ وہ اونچی لہر کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں! صبر کرو ہم زمین کے چپّے چپّے پر پانی کی چادریں بچھادیں گے!

دُور کھڑا ایک اونٹ اپنے مالک سے کہنے لگا: بھول جاؤ کہ تمھیں کہیں گلستان ملے گا یا نہیں، اور اب سراب کی جھلک دیکھنے سے پہلے اپنے گھر لوٹ جاؤ! کیونکہ میں پانی میں چلتے چلتے اگر مر بھی گیا تو گلے میں لٹکی ہوئی جرس اور میرے بدن کی کھال لینے کے لالچ میں کوئی کشتی پر سوار ہو کر مجھے تلاش تو کر لے گا! مگر تمھیں نہ چِتا کے لیے جگہ ملے گی اور نہ قبر کے لیے دو گز خشک زمین ملے گی!

سمندر کی اونچی لہر ایک بار پھر کھڑی ہوگئی مگر اس بار وہ اس پیاسے انسان کو دیکھتی رہی جو اپنے اونٹ پر نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا مگر جرس کی آواز گونج رہی تھی:

اچانک خاموشی چھا گئی یوں تو سمندر کی خاموشی کسی آنے والے طوفان کی اطلاع دیتی رہی! مگر اس بار کوئی طوفان نہیں آیا! بلکہ دور کہیں سے ہَوا کا ایک جھونکا میدانِ جنگ میں اُٹھ رہے زہریلے دھوئیں سے گھبرا کر بھاگتا بھاگتا جب سمندر کی اونچی لہر سے ٹکرا گیا تب سمندر نے نہ حضرت موسیٰ کی طرح اس کو اپنا جسم چیر کر راستہ دکھا دیا اور نہ وہ ایک مگر مچھ بنکر ہنومان کو اڑنے سے روک پایا!

ہوا کے جھونکے نے سمندر کو بتادیا کہ تیل کے کنویں حاصل کرنے کے لیے ایک طاقتور جنگجو ایک ملک کی زمین پر آسمان سے آگ برسا رہا ہے، بھاگ جاؤ ورنہ بارود کی تپش سے تم بھی صحرا بن جاؤ گے اور صدیوں بعد اس میں بھی تیل کی کھوج ہوگی!

ہوا کا جھونکا چل پڑا تو سمندر اس کو آوازیں دیتا رہا جس نے اُس کو چکرورتی مہاراجہ، خاقان یا دنیا پر حکومت کرنے کے لیے اُکسایا تھا! مگر اُس کو صرف اُونٹ کی باتوں کی گونج سنائی دے رہی تھی اور وہ گونج جب ڈوب جاتی تھی تب اس کو جرس کی آواز سنائی دے رہی تھی!!

آسمان پر بیٹھا خدا، دیوی دیوتا، فرشتے یہ منظر دیکھ رہے تھے یا نہیں یہ سمندر کیسے جان پاتا! درمیان میں جنگ کے کالے لال اور پیلے بادل جو تھے!!

ہاں مگر اس بار اس نے نارد منی کو اپنے سامنے پایا ہے مگر وہ بھی جرس کی آواز سن رہا ہے!!

OO

جنون

عشق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ہے مگر چاہت کی انتہا جنون ہے! کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے، کیا صحیح ہے کیا غلط، یہ سب جنون نہ سوچنے دیتا ہے اور نہ سمجھنے دیتا ہے! ایک سہانا سفر کرنے کے بعد جب دو ہم سفروں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کی منزلیں جُدا جُدا ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے خوش آمدید کے لیے سجی سجائی محفل اُٹھ گئی ہے اور ویرانگی چھا گئی ہے! ایسا ہی کچھ تاثر چندن کمار کی خواب گاہ میں چھا گیا ہے! یعنی کل تک جہاں بہاریں رقص کر رہی تھیں آج تجسّس دل و دماغ پر حاوی ہو کر ہر گھڑی تناؤ کے بوجھ کو بڑھا دیتا ہے!

عاشق اور معشوقہ دونوں آمنے سامنے تو ہیں مگر تذبذب کا شکار ہو کر! وجہ یہ کہ عاشق کی نگاہیں معشوقہ کی آنکھوں پر جمی ہوئی تو ہیں مگر ان میں اپنائیت کا احساس دلانے والی چمک نہیں ہے! خواب گاہ معمول کی طرح آج بھی شبِ عروسی کے لیے سجی ہوئی ہے! معمول کی طرح آج بھی عطر کی مصنوعی خوشبو معشوقہ کے بدن کی مہک کے مقابلے میں پھیکی پڑ گئی ہے!

ایسا نہیں کہ معشوقہ نے عاشق کو پیش قدمی سے روکے رکھا ہے بلکہ عاشق نے ہی اپنے قدموں کو تھام کر رکھا ہے! وہ اس لیے کہ آج پہلی بار معشوقہ نے عاشق کی نہ صرف فرمائش ٹھکرا دی تھی بلکہ پہلی بار اپنا سر ہلا کر 'ہاں' کی بجائے 'نہیں' کا تاثر دینے کی بجائے بول کر انکار کیا تھا! حالانکہ اِنکار کے باوجود اُس نے والہانہ انداز میں اپنی لپٹ چمٹ کا سلسلہ جاری رکھا تھا!

یہی تو اس کے ذہنی کھنچاؤ اور قلبی دباؤ کی شدت کی وجہ ہے کیونکہ تین مہینوں سے زیادہ کے سحر انگیز قُرب کے دوران معشوقہ نے اپنے لبوں پر تبسم کی مہر لگا کر کبھی ایسا نہیں کیا تھا جو آج وہ کر چکی ہے! وہ لمحہ بہت عذاب دہ تھا جب دن بھر ایک کشتی میں بیٹھ کر چند مسرت آمیز لمحات، جھیل میں گزار کر عاشق کی ایک آخری خواہش پوری نہ کرنے کا سیدھا جواب دیا تھا! معمول کی طرح آج بھی وہ وہی کردار بن گئی تھی جس کردار میں عاشق اُس کو دیکھنا چاہتا تھا!

پھر گھر سے ہوٹل، ہوٹل سے جھیل، جھیل کا کنارے اور پھر ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے سے دُور بہت دُور ایک خوبصورت جگہ! آس پاس کوئی نہیں پُرسکون خاموشی کو توڑ رہی چپو کی آواز! اور عاشق کے ذہن سے اُبھر رہے ہلکے ہلکے سُر! عاشق نے چپو چھوڑ کر معشوقہ کا ہاتھ تھام لیا تھا کشتی رفتہ رفتہ، بہت دھیمی رفتار سے، ایک ایسی جگہ رُک گئی تھی جہاں چاروں طرف کمل کے پھول تھے!

عاشق نے معشوقہ کو کھلے بال رکھنے کی فرمائش کی تھی اور معشوقہ نے 'ہاں' میں سر ہلایا تھا! پھر عاشق کبھی معشوقہ کے بالوں اور کبھی کمل کے پھولوں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑ کر یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ جل ترنگ کے تاروں کو چھیڑ کر کسی جُگل بندی کو جنم دے رہا تھا!

معشوقہ عاشق کی کیفیت بھانپ کر مسکراتی رہی! ہنستی رہی، کبھی کبھی لپٹ کر قہقہے بھی لگاتی رہی! آخر جب عاشق کے دل کی بات زبان پر آ گئی تب اُس نے سوچا تھا کہ اُس کی ہم سفر فرمائش سن کر قہقہے لگاتے ہوئے 'ہاں' میں سر ہلا دے گی! مگر اِس بار ویسا نہیں ہوا جیسا اُس نے سوچا تھا بلکہ جواب سن کر اُس کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اُس کو دھکا دے کر سر کے بل جھیل میں گرا دیا ہو اور وہ سانسیں لینے کی کوشش کرتے ہوئے پانی کی تہیں کاٹ کاٹ کر کمل کے پھولوں کی جڑوں کی طرف جا رہا ہو!

پھر وہ جب تیزی سے کنارے کی طرف لوٹا تب بھی اُس کی معشوقہ سُر اور لَے میں یوں ہنستی رہی گویا نغمۂ چاہت گا رہی تھی اور عاشق اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر حیران ہوتا رہا! حیران اس لیے کہ وہ چوٹ کھا کر ہنس کیوں رہی تھی؟ کیا وہ اپنے تصورات کے عکس سے پیار کر بیٹھا تھا؟ یا وہ خود ہی بنائے ہوئے اُن دائروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو پانی کی سطح پر ایک پتھر پھینکنے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے کرتے غائب ہو جاتے ہیں!

جیسے یہ سچ ہے کہ کپڑوں کو اُجلا پن دینے والی نیل جس زمین میں پیدا ہوتی ہے اُسی کو چار سال کے لیے بانجھ بنا دیتی ہے ویسے ہی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دماغ کی پیداوار جنون دماغ پر حاوی ہو کر نہ کسی خیال کو جنم لینے دیتا ہے اور نہ سوچ سمجھ کو اُبھرنے دیتا ہے یعنی لکیر کے فقیر! معشوقہ اپنے عاشق کی کیفیت بھانپ چکی تھی! وہ جانتی ہے کہ جب اُس سے کھلے بال رکھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے کی فرمائش ہوتی ہے تب عاشق اپنے آپ کو چھپ چُھپ کر ایک پری چہرہ حسینہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے والا ایک اجنبی محسوس کرتا ہے! اُس کا کروڑپتی عاشق جب کاسٹیوم اور میک اپ پر لاکھوں روپے خرچ کر کے چند گھنٹوں کے لیے اُس کو پری بنا دیتا ہے تب وہ

اپنے آپ کو کامدیو سمجھتا ہے! جب معشوقہ انارکلی ہوتی ہے تب عاشق اپنے آپ کو شہزادہ سلیم سمجھتا ہے!

معشوقہ سب جان کر بھی عاشق کو اپنے بھرپور تعاون سے نوازتی رہی ہے بلکہ اپنی کاوشوں کو خلوص اور ایمانداری سے سینچ کر ـــ! اُس نے جس رنگ میں رنگ ڈالا وہ مسکرا کر قبول کرتی رہی یہ سوچ کر کہ ایک جنونی سے ایسی احمقانہ حرکتوں کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے! دل ہی دل میں وہ ایک بے وقوف سرمایہ دار کی حالت پر ہنس کر کبھی کبھی اُس کو پاگل سمجھتی رہتی تھی مگر آج عاشق کی حالت دیکھ کر وہ تجسّس کا شکار ہوگئی ہے!

چندن کمار کا اصلی چہرہ وہ ہے جو اُس نے آج تک دیکھا تھا یا جو وہ آج دیکھ رہی ہے؟ چندن نہ بے وقوف ہے، نہ احمق ہے اور نہ پاگل ہے! بلکہ وہ ایک کامیاب صنعت کار ہے جو کبھی کبھی نادانیاں کرتا رہتا ہے ہاں مگر وہ عقل کے کاروبار میں دل کو شریکِ کار نہیں سمجھتا ہے! یہ بھی صحیح ہے کہ وہ دل کے معاملات میں عقل کو دُور رکھتا ہے! اپنے دفتر میں، گھر سے باہر بلکہ گھر کے اندر بھی جزوی طور پر وہ ایک سنجیدہ آدمی ہے! جبکہ گھر کے اندر اُس کا ایک اور گھر ہے جہاں کسی کا دخل نہیں! وہاں ایک پرانے نوکر کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوسکتا ہے مگر وہ اپنے ساتھ اکثر چند فیشن ڈیزائنرس اور میک اپ کرنے والوں کو لے آتا ہے! اُس کے ہمراز نوکر کو اُس کی سیمابی کیفیت کے بارے میں پوری معلومات ہیں! وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب واقعات چندن جی کی منشا کے مطابق چلتے رہیں تب وہ خوشی کے آنسو بہا کر یہ احساس دلاتا ہے کہ جیسے بارش پھول پتّیوں کو دھو دیتی ہے ویسے ہی پانی نے اُس کی بوجھل آنکھوں کو تروتازہ کردیا ہے بصورتِ دیگر اُس کی آنکھیں وہ منظر دکھاتی ہیں جیسے سیلاب سے ایک چمن اُجڑ گیا ہو، آج بھی وہ جان گیا ہے کہ حالات نے غیر متوقع کروٹ بدل کر اُس کی آنکھوں میں آباد خوابوں کو ایک زلزلہ زدہ علاقے کی طرح ویران کردیا ہے!

چندن اپنی جنونی کیفیت کے زیرِ اثر ایک مختلف شخص بن جاتا ہے! دراصل وہ عہدِ جوانی میں فلموں کی ایک پُرانی ہیروئن کو بغیر جانے پہچانے اور قریب سے دیکھے دل دے بیٹھتا تھا! کروڑپتی باپ اپنے اِکلوتے وارث کی خاطر چاند ستارے لانے کے بارے میں بھی سوچ سکتا تھا مگر وہ کیا کرسکتا تھا جب ہیروئن بیٹے سے عمر میں بیس سال بڑی تھی اور شادی شدہ تھی!

اُس ہیروئن کی تصویر جنونی عاشق کے تصور میں یوں بیٹھ گئی تھی کہ وہ ہر متوقع دلہن میں وہی شکل وصورت تلاش کرتا رہا! اپنے من موافق لڑکی نہ ملنے کی وجہ سے وہ چالیس سال کی عمر پار کرتے ہوئے بھی کنوارا رہ گیا!

پھر ایک بدیشی سفر کے دوران اُس کو ایک ایئر ہوسٹس میں اُس ہیروئن کی جھلک نظر آئی تو اُس کی شادی دنیا بھر کے میڈیا کی سرخیاں بن گئی تھیں! تب لڑکی نے نوکری چھوڑ دی اور شادی کے بندھن کو نہایت سنجیدگی سے لیتی رہی تھی! مگر جنونی عاشق کو بیوی کی کم اور مختلف کردار نبھانے والی ایک معشوقہ کی زیادہ ضرورت تھی اس لیے جونہی فیشن ڈیزائنرز کا آنا جانا شروع ہوا وہ تنگ آ کر فقط تین مہینوں کے بعد طلاق لے کر ملک میں بھی کہیں نظر نہیں آئی تھی کیونکہ اُس کو اُس کی تصوّراتی معشوقہ کا عکس بن کر رہنا منظور نہیں تھا جبکہ عاشق اپنی دیوانگی کا غلام تھا!

پانچ سال بعد اُس کو یہ معشوقہ مل گئی تو اُس کو یوں لگا جیسے سردیوں میں بہار آئی ہے! پچیس سال کی اس عورت کو اُس نے ایک پارک میں دیکھا تھا! اُس کی شکل و صورت ہو بہو اُس کی پسندیدہ ہیروئن جیسی تھی فرق یہ تھا کہ ایک اپنے رُوپ کے کارن لاکھوں لوگوں کے دلوں میں رہا کرتی تھی اور دوسری اپنے رُوپ کی وجہ سے سڑک چھاپ طوائف تھی! مگر اس چہرے کو ایک جنونی عاشق نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے وہ اُس کے لیے کیچڑ میں کھلا وہ پھول تھا جس کو چُھوتے ہی اُس کی دبی خواہشات لاوے کی طرح پتھروں کا سینہ کاٹ کر باہر آ گئی تھیں!

چندن اُس کو تب اپنے گھر لایا تھا جب وہ میلی کچیلی تھی! بال گندے اور اُلجھے ہوئے تھے! مگر دوسری بازاری عورتوں کی طرح نہ اُس نے شراب پی رکھی تھی اور نہ ہونٹوں سے پان کی پیک ٹپک رہی تھی! وہ باتیں بھی ایسی کرتی تھی جیسے ایک شائستہ سیلز گرلز کسی شوروم کے کاؤنٹر پر گاہک سے باتیں کر رہی ہو! چندن پہلی ملاقات کے بعد اُس کو ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں نہلا دُھلا کر، اچھے کپڑے پہنا کر، سجا دھجا کر اپنے گھر لایا تھا اور تب سے اب تک وہ اُس کے ساتھ ہی رہ رہی ہے!

چندن صبح سویرے اپنا کام کاج دیکھنے جاتا رہا اور دوپہر کو گھر آ کر سارا وقت ساتھ گزارتا رہا! کبھی اس کو مغربی لباس پہناتا رہا، کبھی سودیشی لباس! کبھی علاقائی لباس پہنا کر، کبھی آدی واسیوں کی پوشاکیں پہنا کر نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے اور کبھی جدید ترین کپڑے پہنا کر مختلف کرداروں کا گیٹ اَپ دے کر! عاشق معشوقہ کو کبھی اِندر سبھا کی رقاصوں کا رنگ رُوپ دیتا رہا اور کبھی مِس یونیورس بنا کر اپنے سامنے رکھ کر اُس کو بس دیکھتا رہا! آج وہ انارکلی بنائی گئی تھی کیونکہ عاشق اپنے جنون پر قابو پا کر معشوقہ کو بیوی بنا دینا چاہتا تھا، وہ بھی اس لیے کہ اپنے تصوّرات کی دُنیا کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا! وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیوی جو بھاگ جانے سے پہلے ہچکچاہٹ سے کیا کرتی تھی وہ تعمیلِ حکم معشوقہ ہنسی خوشی کیا کرتی تھی!

دراصل اپنی من پسند ہیروئن کی فلموں میں دیکھے ہوئے بے شمار کرداروں کے عکس دیکھ دیکھ کر عاشق کو اچانک رفتارِ وقت کا احساس ہوا تھا اور آج پہلی بار یہ محسوس کیا تھا کہ جنون ایک بے وزن بوجھ ہے جس کو اُٹھا کر راہی سفر جاری تو رکھ سکتا ہے مگر بے شکل منزل کو پا نہیں سکتا!

معشوقہ کا دوٹوک جواب سن کر وہ چونک کر حیرت زدہ ہو گیا تھا آخر شادی سے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ گھر لوٹ کر سوچتا رہا! پچاس سو روپے لے کر اپنے آپ کو رکشہ چلانے والوں یا ٹیکسی ڈرائیوروں جیسے گاہکوں کو سپرد کرنے والی عورت ایک کروڑ پتی کی بیوی بن جانے سے کیوں گریز کر رہی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک پینتالیس سالہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی ہو؟

شام ہوئی تو معشوقہ نے انارکلی کے کپڑے اُتار کر سوالیہ نگاہوں سے عاشق کو دیکھ کر یہ جاننا چاہا کہ اب وہ کون سے کپڑے پہن کر اس کے ساتھ چمٹ جائے!

عاشق نے ایک شادی کا جوڑا پہن لینے کا کہا اور پھر دلہن کو خود سجا کر اُس سے مخاطب ہوا!

''اگر میں یہ تجویز تمھارے سامنے رکھوں کہ میرے ساتھ پلنگ پر سونے سے پہلے مجھ سے شادی کر لو تو کیا کر لوگی؟''

معشوقہ نے مسکراتے ہوئے 'نہیں' میں سر ہلا دیا!

''اپنی تمام جائیداد تمھارے نام کر دوں تو؟''

معشوقہ نے پھر اپنی ضد پکڑ لی!

''میں تمھارے سارے روپے نا دوں تو؟''

معشوقہ نے اس بار غصّہ سے کہا!

''تو میں سمجھ لوں گی کہ تم سے اچھے وہ سڑک چھاپ گاہک ہیں جو طے شدہ رقم ہاتھ میں دے کر میرے جسم کو ہاتھ لگاتے ہیں!... مجھے گردے کے آپریشن کے لیے رقم جوڑنی ہے! تم بے ایمانی کر سکتے ہو! کاش یہ میں تین مہینے پہلے جان پاتی! خیر مجھے آزاد کر دو! صیّاد؟ میرا ہم سفر، ہم نفس، ہم نوا میرا انتظار کر رہا ہے''

معشوقہ یوں چلاّنے لگی گویا کوئی اُس کے جسم کو خاردار تار سے باندھنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ اُسے روکنے کی کوشش کر رہی ہو!

''اگر میں آپریشن کروا دوں تو ـــ؟'' عاشق بول پڑا مگر اُس کی معشوقہ اپنی ضد پر قائم رہی!

کُرید کُرید کر چند دن تمام یہ جان گیا کہ اُس کی معشوقہ اپنے پتی کے ساتھ چھ مہینے پہلے کئی

برسوں سے سوکھے سے متاثر ایک دُور دراز گاؤں سے شہر آئی تھی روزگار کی تلاش میں، مگر شوہر کی بیماری نے ان کی کشمکش زندگی کی نہج بدل دی تھی! ایک جنونی عاشق ایک رحم دل کروڑ پتی پر حاوی ہوکر ایک فیصلہ کن، گرج دار آواز میں بول پڑا: ''میں سمجھا وہ تمھارا باپ ہے، چھوڑ دو اُس کو! وہ تمھارے جوان کندھوں پر ایک بوجھ ہے!''

عاشق اپنی معشوقہ کو تب دیکھتا ہی رہ گیا جب وہ شادی کا لباس اُتار کر اپنے کپڑے پہن کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے کی جگمگاتی روشنی اور چندن کی مہک کو ٹھکرا کر باہر پھیلے اندھیروں میں داخل ہوگئی!

''ارے ناسمجھ! تم کیا جانو کہ شادی کا بندھن کیا ہوتا ہے! جس کی خاطر میں آگ کے دریا میں کود پڑی ہوں، اس کو چھوڑ دوں؟ ہرگز نہیں! ہاں اتنا بتا کر جا رہی ہوں کہ سونا تپ کر کندن بن جاتا ہے! اور چندن جل کر راکھ بن جاتا ہے! راکھ میں خوشبو نہیں ہوتی!!''

OO

ضدّی

اپنے ہی منتخب کیے ہوئے راستے میں، ایک دوراہا دیکھ کر، بھیروی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ سفر جاری رکھا جائے یا پھر روکا جائے؟ بلکہ جاری رکھنے کی صورت میں کون سا راستہ اپنایا جائے؟ کیونکہ ایک راستے پر حال کا سکھ دُکھ نظر آ رہا ہے جبکہ دوسرے پر مستقبل کے دھندلے عکس نظر آ رہے ہیں!

ایسے بھی حالات ہو سکتے ہیں یہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا!

کل جو گزر چکا ہے وہ عذاب دِہ تھا! پورا دن بلکہ گئی رات تک ہر لمحہ تجسس کے دباؤ سے اور رات تذبذب کے کھنچاؤ سے وجہِ اضطراب وتناؤ بن گیا تھا! کیونکہ دن کو وہ اپنے شوہر رشی راج اور سُسُر شیوراج کو دیکھتی رہی اور سسر کو ضدی سمجھتی رہی! جبکہ رات کو یہ جان کر حیران ہو گئی تھی کہ اُس کا شوہر بھی اپنے باپ کی طرح ضدی ہے!

تو کیا جو نظر آ رہا تھا وہ ایک فریب تھا؟ کیا رِشی نے اس کو دھوکہ دیا ہے؟ یا وہ خود ہی اپنی ناسمجھی اور غلط سوچ کی دھند میں دھوکہ کھا گئی ہے؟ تو کیا رِشی کا یہ دعویٰ کہ وہ اپنے باپ کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر ہی اُن کے دیوانہ پن میں شامل ہو جاتا ہے، کھوکھلا ہے؟

سچ اُس کے سامنے آ چکا ہے کہ بیٹا باپ دونوں ایک ہی سانچے سے نکل چکے دو ایک جیسے مجسمے ہوتے ہیں! ہاں یہ بات اور ہے کہ مجسمہ نم مٹی یا ریت یا پھر اُبل رہے سونے یا موم کا ہو سکتا ہے یعنی عمر کم یا زیادہ ہو سکتی ہے! مگر وقتی سہی، کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے!!

رِشی کو اپنا لینے سے پہلے یہ خیال اُس کی سوچ کا حصّہ کیوں نہیں بن سکا؟ بھیروی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ لیتی ہے تو بے شمار جڑے ہوئے سوالات جوابات مانگ رہے ہیں!

بھیروی ایک گلوکارہ ہے اور وہ سمجھ رہی ہے کہ جیسے وہ کسی بھی راگ کی سرگم یا ترانہ سن کر راگ کو پہچان سکتی ہے، ویسے ہی وہ کسی شخص کے قرب میں رہ کر اپنی نفسیاتی کرید سے یہ جان سکتی

ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ! مگر کیا رِشی کے بارے میں اُس کی سمجھ اس کی نا سمجھی کا ثبوت بن گئی ہے؟ تو کیا وہ خود ہی ایک پرندے کو ہم سفر بنا کر، ایک خوبصورت گھونسلے میں، تنہائیوں میں خوش وخرم رہنے کی بجائے، تنہا رہ رہی ہے؟ ایک چڑیا گھر میں نمائش کی شے بن کر؟

اپنے گھر کے عالیشان کھانے کمرے میں تنہا بیٹھی بھیروی دو گھنٹوں سے اپنے آپ سے سوالات پوچھ رہی ہے؟

آس پاس کی خاموشی اُس کو ایک بیابان کے سناٹے کا احساس دلا رہی ہے! کھانے کی میز سجا کر وہ کئی بار ناشتہ گرم کر چکی ہے! اور رِشی کا انتظار کر رہی ہے! معمول کی طرح! اور معمول یہ ہے کہ گھر کے نوکر اور نوکرانی، جو میاں بیوی ہیں، علی الصبح گھر کے تمام کام مکمل کر کے اپنے کمرے میں جا چکے ہیں! بھیروی بھی اپنا کام پورا کر چکی ہے! اور اب وہ اُس لمحے کا انتظار کر رہی ہے جب رِشی مسکراتے ہوئے کھانے کے کمرے میں داخل ہو کر، میز پر رکھی کانسے کی تھالی کو ڈفلی کی طرح بجاتا رہے گا! پھر آواز سن کر شیوراج کمرے میں داخل ہو کر اُس کو ڈرامائی انداز میں یہ پوچھ لے گا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ پھر ڈرامائی انداز میں رِشی کو دیکھ کر یہ احساس دلا کر کہ تم نے پکارا اور ہم چلے آئے! جُھوم جُھوم کر رِشی سے یوں بغلگیر ہوگا گویا دونوں اتفاقاً مل گئے ہوں! اپنی عمل اور ردِ عمل کو بار بار کرتے ہوئے، اشاروں ہی اشاروں میں دونوں ایک دوسرے کی اداکاری کی تعریفیں کرتے رہیں گے! پھر مطمئن ہو کر ڈرامائی انداز میں، ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے رہیں گے! جبکہ بھیروی دور سے، دونوں کو یوں دیکھتی رہے گی گویا وہ ایک فلم دیکھ رہی ہو!

ایسا ہونا چاہیے تھا! مگر رِشی کمرے میں آیا نہیں! گھبرا کر، وہ نوکر یا نوکرانی کو بلانا چاہتی تھی مگر گھر کے قوانین کے مطابق ان کو گھنٹی بجا کر، تب بلایا جا سکتا ہے جب شیوراج چاہے! ورنہ نہیں!! ہاں دن کو، جب شیوراج گھر میں نہ ہو تب، بھیروی اُن کو بلا سکتی ہے! لیکن آج چاہتے ہوئے بھی اُن کو آواز نہیں دے سکتی ہے! نہ ساتھ دینے کی خاطر اور نہ مدد کرنے کی خاطر! چونکہ باپ کے بنائے ہوئے قوانین بیٹے نے قبول کیے ہیں اس لیے بھیروی بھی اُن پر پابند ہے! اس لیے وہ نہ آج کچھ کر سکتی ہے اور نہ کل کچھ کر پائی تھی!

کل کے واقعات آج سے مختلف تھے! رِشی نے معمول کی طرح تھالی بجا کر اپنے باپ کو بلایا تو تھا اور وہ آیا بھی تھا مگر رِشی سے ایک سوال پوچھ بیٹھا تھا! وہ بھی تُرش لہجے میں!

"یہ بتا دو کہ آدھی رات کو تم کیا کر رہے تھے؟"

رِشی کی ہچکچاہٹ دیکھ کر شیوراج نے یہی سوال کئی بار پوچھا تھا اور ہر بار لہجہ بدل بدل کر! یعنی اپنی کُرید میں ڈرامائیت کے بہترین نمونے اپنا کر! یعنی کبھی تجسّس کا تاثر ڈال کر، کبھی مزاح کی چاشنی ڈال کر! کبھی غصّے سے اور کبھی التجا کرتے ہوئے! مگر ہر بار رِشی کچھ بولنے کی بجائے اشارے دکھا کر، بقول شیوراج، سوال کو بلاوجہ ایک معمّہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا!

بھیروی کی نگاہیں باپ بیٹے پر جمی رہی تھیں مگر دُور رکھے ایک کیمرے کی طرح جو دیکھنے کے علاوہ سن سکتا ہے مگر بول نہیں سکتا! مطلب ایک لاچار تماشائی بن کر!

بیٹے کے جواب نہ دینے کی وجہ سے باپ کبھی روٹھ کر، اور کبھی غصّے سے بوکھلا کر، ایک کمرے سے نکل کر، دوسرے کمرے میں جاتا رہا! پھر ہر بار بیٹا فوراً پیچھے پیچھے چل کر، منانے کی کوشش کرتا رہا! پھر دونوں جذبات کی رَو میں بہہ کر ایک دوسرے کے گلے لگتے رہے! لیکن جب باپ پھر وہی بات! یعنی اپنی ضد پر قائم ہونے کا اشارہ دے کر باپ جواب طلب کرنا چاہتا تھا! جو بیٹا دے نہیں رہا تھا تب ہر بار دونوں بغلگیر ہونے کے باوجود بچھڑ جایا کرتے تھے! ویسے ہی جیسے پارے کے دو قطعے ملتے ہی ایک قطرہ بن جاتا ہے! مگر ذرا سی جنبش سے وہ پھر دو قطرے بن کر ایک دوسرے سے دُور ہو جاتے ہیں!

اور یوں سولہ گھنٹوں کا یہ تسلسل جاری رہا تھا!

پہلی بار سوال سن کر بھیروی غصّے سے اُبل پڑی تھی اور چاہتی تھی کہ رِشی، شیوراج سے پوچھ تو لے کہ وہ آدھی رات کو بہو اور بیٹے کے بند کمرے کے باہر کیا کر رہا تھا؟ لیکن اپنے سسر کی عادات کے بارے میں سوچ کر، اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ اپنے ہی دانت سے اگر اپنی زبان کٹ جائے تو دانت کو نکالا تو نہیں جاتا؟ حالانکہ بارہا وہ چونکا دینے والے واقعات یاد آتے رہے جو معیوب ہوتے ہوئے بھی میاں بیوی نے قبول کیے تھے! جیسے شیوراج کا گئی رات میاں بیوی کی شب گاہ میں جانے کے لیے بے ہودہ حالات پیدا کرنا اور پھر میاں بیوی کے درمیان پلنگ پر لیٹ کر ٹیلی ویژن دیکھنا! خاص طور پر وہ واقعہ جس کو یاد کرتے ہوئے بھیروی یہ فیصلہ نہیں کر پائی ہے کہ شیوراج کی اُس حرکت پر رو دیا جائے یا سوچا جائے! اُن کی عزّت کی جائے یا نفرت کی جائے!؟

تب ہوا یوں تھا کہ شادی کے پندرہ دن بعد ڈاکٹر شیوراج کو تین راتیں ایک میڈیکل کیمپ

میں گزارنی پڑتی تھیں! ان راتوں کو دونوں اپنے اپنے آئی پیڈ پر ایک دوسرے کے مخاطب ہو کر، مزے لے کر، نجی باتیں کیا کرتے تھے! مذاقاً جسم کے پوشیدہ حصوں کو علامتی نام دے کر! جیسے نندو، شینا مینا وغیرہ! چونکہ شیوراج بند کمرے کے باہر اُن کی باتیں سنا کرتا تھا اس لیے جب رِشی گھر لوٹ کر آیا تھا تب باپ نے ایک جاسوسی انداز میں بیٹے سے پوچھا تھا کہ یہ نندو کون ہے؟ شینا مینا کون ہیں؟ بیٹے نے بے باک ہو کر کچھ بول کر اور کچھ جسمانی حرکتوں سے باپ کے سوالات کے جوابات دے کر، گرم لوہے کو پانی میں ڈال دیا تھا! پھر باپ کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر بار بار عمل اور ردِ عمل کے مناظر کو اچھے سے بہتر اور بہتر کو بہترین بنا دیا تھا! اسی لیے تو کل صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے بارے بجے تک چل رہے ایک عذاب دِہ تسلسل کے دوران بھیروی سمجھ نہیں پائی تھی کہ جب رِشی بے باک ہو کر ویسے قابلِ اعتراض سوالات کے جوابات دیتا رہتا ہے تو پھر اب ایک آسان سوال کو پیچیدہ کیوں بنا رہا ہے؟

بار بار دل چاہتا تھا کہ رِشی کو مشورہ یا رائے دے کہ وہ جواب دے کر اپنے باپ کی ضد توڑنے کی بجائے، خود ہی جھک کر اپنی ہار قبول کر لے، تا کہ دوسرے کام جن میں ناشتہ کرنا، دوپہر اور رات کا کھانا، کھا لینا بھی شامل تھا! کیے جائیں! مگر لاچار تماشائی کو اپنی موجودگی ظاہر کرنے کی اجازت ہوتی تب نا؟

بھیروی جانتی ہے کہ جب باپ اور بیٹا آمنے سامنے ہوتے ہیں تب گویا دو نقطوں کے درمیان ایک چھوٹی یا بڑی لکیر ہوتی ہے! چونکہ تیسرا نقطہ آس پاس ہوتا نہیں ہے اس لیے ایک تکون بن ہی نہیں سکتا ہے! ہاں لکیر کو گھما کر جو دائرہ بنایا جاتا ہے اُس میں بھیروی کو داخل ہونے تو دیا گیا ہے مگر محیط پر رہنے کی حد تک! ظاہر ہے کہ وہ دونوں کے قریب جا نہیں سکتی ہے! بلکہ اپنے شوہر کو مشورہ یا رائے بھی نہیں دے سکتی تھی! ہاں اگر ایک سرد جنگ رُک جاتی تب وہ رشی کو جنگ بندی کے دوران جنگ ختم کرنے کے لیے مجبور کر سکتی تھی! مگر جنگ بندی ہوتی تب نا! جنگ بندی اُس صورت میں ممکن ہو سکتی تھی اگر کوئی اتفاقاً باپ بیٹے کے درمیان آ جاتا! تب شاید نفسیاتی دباؤ میں آ کر وہ ایک دوسرے کے جنونی اثر سے آزاد ہو جاتے! اور پھر بھیروی ایک سنہری موقع کا فائدہ لے کر رِشی کو جواب دینے کے لیے رضامند کر دیتی!

بھیروی جانتی تھی کہ دونوں کے درمیان کوئی بھی نہیں آ سکتا ہے!

گھونسلہ نام کے ایک عالیشان بنگلے میں آج بھیروی کے علاوہ صرف دو پرندے رہتے ہیں! بیس برس پہلے شیوراج کے والدین بھی اُن کے ساتھ رہتے تھے لیکن ایک کار کے حادثے میں ان کی موت کے بعد بنگلے میں باپ بیٹے کے علاوہ کوئی نہیں رہتا ہے! دونوں سے ملنے کوئی بھی یگانہ یا بیگانہ نہیں آتا ہے یعنی دونوں پرندوں سے نہ کسی رقیب، حریف، حلیف کا ملنا جلنا ممکن ہے نہ کوئی چوہا بلّی یا سانپ اندر گھس کر ان کو ڈرانے آتا ہے! یعنی نہ محلے والوں کا نہ رشتے داروں کا اور نہ ناطے داروں کا آنا جانا ہے! گھر کے نوکر، نوکرانی بنگلے کے ساتھ جُڑے ایک کمرے میں رہتے ہیں! علی الصبح گھر کا سارا کام ختم کر کے وہ چلے جاتے ہیں! وہ تب باپ اور بیٹے کے سامنے آ جاتے ہیں جب اُن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ایک ڈرامائی انداز میں گھنٹی بجا کر! ورنہ وہ پاس نظر آ جانے کی جرأت نہیں کرتے ہیں! ہاں بھیروی کی شادی کے بعد، یعنی پچھلے سو دِنوں کے دوران، بھیروی کے اصرار پر نوکر، نوکرانی دن کو بھی گھر میں نظر آتے رہتے ہیں مگر تب جب شیوراج اور رِشی راج دونوں باہر ہوں! ورنہ نہیں!!

بھیروی یہ جان چکی ہے کہ رِشی کو ملنا جلنا اچھا لگتا ہے! ہاں یہ بات اور ہے کہ باپ کے سامنے ہوتے ہوئے اس کی سوچ سمجھ بلکہ عمل اور ردِّ عمل باپ کی کارکردگی کا عکس ہوا کرتی ہے! لیکن بیٹے کو باپ آئینہ نظر آتا ہے یا پیکر یہ بھیروی نہیں جانتی ہے! وہ رِشی راج کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے آشنا ہے اور یہ جانتی ہے کہ اُس کے لیے ساری خدائی ایک طرف اور اُس کا باپ ایک طرف! باپ کے جنونی پیار اور لگاؤ کے ساتھ ساتھ اکثر بیٹے کی فرماں برداری پر اُس کو پیار آ جاتا! غصہ نہیں!! وہ اس لیے کہ رِشی نے اپنے باپ کے بارے میں کبھی کچھ بھی نہیں چھپایا ہے! شیوراج کے بارے میں بھاسکر نے بھی اس کو خاصی اطلاعات اس لیے دے دی ہیں تا کہ وہ اپنے سسر کی معیوب حرکتوں کو نظر انداز کرتی رہے اور رِشی کی دنیا کو ضیا بخش سکے! وہ دونوں سے بہت پیار کرتا ہے نا!

شیوراج شہر کا ایک مشہور اور معروف ایڈوکیٹ ہے جبکہ رِشی راج ایک بہت ہی کامیاب سرجن! بھاسکر شیوراج کا ہم عمر رشتے کا بھائی ہے! وہ واحد رشتے دار ہے جو بھیروی سے کبھی کبھار فون پر باتیں کرتا رہتا ہے!

رِشی راج سے اُس کی پہلی ملاقات چار برس پہلے، پرانی دہلی کی ایک گلی میں واقع ایک فرسودہ

عمارت میں ہوئی تھی! بھیروی وہاں موسیقی کی تعلیم لے رہی تھی جبکہ رِشی استاد کے پاس کبھی کبھار آیا کرتا تھا! دہلی کے ایک میڈیکل کالج کا ایک طالب علم، استاد کی گائیکی کو روح کی خوراک سمجھتا ہے اور اپنے ہر تناؤ کو کم کرنے کا نسخہ سمجھتا ہے اس لیے وہ استاد کی صحبت میں اپنا کچھ وقت گزارنے آیا کرتا تھا! سکون بخش خوبی بھیروی کی گائیکی میں بھی ہے مگر یہ خوبی پہلی ملاقات میں فلمی انداز میں نظریں ملتے ہی ان کے پیار یا محبت کی وجہ نہیں تھی! بلکہ شادی چار سال تک ساتھ کاٹے ہوئے سفر کی ایک حسین منزل ہے! دونوں ایک منطقی سوچ اور سمجھ کی ہم آہنگی کے سبب ہی ہم نفس اور ہم نوا بن گئے ہیں! اس لیے دونوں ایک دوسرے کو بخوبی جاننے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں! شیوراج کے بارے میں، رِشی اور بھاسکر کی دی گئی اطلاعات کے علاوہ اُس کی اپنی قائم کی گئی رائے، اگر قدم قدم پر صحیح ثابت ہو چکی ہے! پھر رِشی کے بارے میں غلط کیوں ثابت ہو رہی ہے! کیا آج اُس کا دعویٰ اپنے شوہر کی غیر متوقع ضد کی ٹکر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا؟

شیوراج کو اپنے بیٹے سے جنونی لگاؤ ہے! یہ بھیروی اُس دن بھانپ گئی تھی جب وہ جان گئی تھی کہ وہ ہر چھٹی یا چھٹیاں بیٹے کے ساتھ دہلی میں گزارنے کے لیے، ہر سال کالج کا کلینڈر دیکھ کر، رات کی ریل گاڑیوں میں آنے جانے کی ٹکٹیں خرید کر رکھا کرتا تھا! رات کو سفر، دن بیٹے کے ساتھ گزار کر پھر اپنے گھونسلے میں واپسی! ابابیل کی طرح! یہ ایک جنونی پیار کی علامت ہی تو تھی!!

شیوراج پر فلموں کا اثر ہے، یہ وہ اپنی پہلی ملاقات میں جان گئی تھی!

ہوا یوں تھا کہ ایک اجنبی لڑکی کو، متاثر کرنے کی خاطر شیوراج اپنا ہر ایک مکالمہ، طرح طرح کے ڈرامائی انداز میں ادا کرتے ہوئے، یہ جان لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاٹ ٹھیک ہے نہیں! بناوٹ اور سجاوٹ کے طور پر! کیونکہ بھیروی کیمرے کے پیچھے آگے رہ کر، جس مصنوعی اظہار سے اوب کر اپنے باپ کی فلم ٹھکرا کر، اپنے نانا نانی کے پاس دہلی آئی تھی وہی سب کیمرے کی آنکھ کے بغیر، اصل زندگی میں دیکھنا قبول تو نہیں تھا! خاص طور پر جب رِشی بھی باپ کی عمل اور ردِ عمل میں جگل بندی کے تاثرات دیتا رہتا تھا! مگر پھر یہ جان کر کہ رِشی نے اپنے باپ کا فلمی اسٹائل فقط اپنے باپ کی سنگت کے لیے چُن لیتا ہے جبکہ اپنی ذاتی طور پر وہ بھی ایسے عمل سے نفرت کرتا ہے اس لیے بھیروی نے سسر کو احترام کے ساتھ قبول کیا تھا!

بقول بھاسکر شیوراج کو بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا چسکہ لگ گیا تھا! شروع میں فلم

کے ہیروز کے گانے، ان کی چال ڈھال میں گایا کرتا تھا! پھر مکالمے ادا کرنے کی عادت پڑ گئی تھی! کالج میں پڑھائی کے دوران ایک بہت ہی امیر والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے فائدے لے کر، وہ ویسی ہی پوشاکیں پہنتا رہتا تھا جیسی فلموں کے ہیرو پہنا کرتے تھے؟ پھر ان کی نقلیں بھی اُتارا کرتا رہتا تھا! رفتہ رفتہ اپنے آپ کو فلموں کے کرداروں میں ڈالنا اُس کی ایک عیب نما عادت بن گئی ہے!

تب وہ یونیورسٹی میں قانون کی پڑھائی کر رہا تھا جب اُس نے پہلی بار ایک فلم کی شوٹنگ دیکھ لی تھی! اور وہ جان چکا تھا کہ کیمرے کے پیچھے بیٹھا ہدایت کار، کیمرے کے آگے اداکار سے بہتر یا من چاہا شاٹ لینے کی خاطر، ایک ہی مکالمے کو بار بار، ادائیگی بدل بدل کر، تب تک صحیح نہیں مانا جاتا ہے جب تک ہدایت کار صحیح کا اشارہ نہیں دیتا! وہاں سے اُس کی فلمی طرز سے گزاری زندگی کا آغاز ہوا تھا! گویا اپنا ہر کام کرتے ہوئے وہ یوں محسوس کرتا رہتا ہے کہ وہ کیمرے کے آگے ہے اور اس کو کیمرے کے پیچھے بیٹھا ہدایت کار ہے! ایک بار نائی کو بار بار بال کاٹنے کے اصرار کی وجہ سے وہ جوکر بن گیا تھا! نائی ہنس پڑا تھا تو وہ اپنا غصہ پی کر ڈرامائی انداز میں قہقہے لگا بیٹھا تھا جبکہ بھاسکر اپنے اِردگرد ہر چہرے پر ایک جیسے تاثر دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا!

فلموں میں کوئی تواریخی کردار دیکھ کر اساطیری کردار دیکھ کر، کسی کینسر کے مریض کو دیکھ کر یا پھر کسی مزاحیہ کردار کو دیکھ کر، وہی گیٹ اپ، وہی مکالمے، وہی اندازِ بیان اپنا کر، زندگی کا سفر کرنے والے باپ نے اپنے بیٹے کو بھی اپنی سوچ سمجھ، خیال، قول اور عمل کا ایک اٹوٹ جُز بنا ڈالا ہے! اپنے لیے اُس کو اور بیٹے کے لیے خود کو ہدایت کار بنا ڈالا ہے! صحیح ادائیگی کا اشارہ دینے کی خاطر!

بقول بھاسکر، شیوراج عمر کے فاصلے کو کم کرنے کی خاطر ہمیشہ اپنی عمر میں جتنے برس کم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اتنا ہی برس رِشی کی عمر میں جوڑ دیتا رہتا ہے! اور یوں اپنی خُو نہیں بدلتا ہے!

جب باپ بیٹے کو کالا کوٹ پہنا کر پہلی بار اپنے ساتھ کورٹ میں لے گیا تھا تب رِشی دس برس کا تھا! اُس بار تازہ ترین دیکھی ہوئی فلم میں، جرح کی کامیاب نقل اُتار کر وہ کیس جیت گیا تھا! تب سے اب تک جب بھی وہ جرح کرتا رہتا ہے اس کے مخالفین بھی اُس کی اداؤں پر نثار ہو جاتے ہیں اور وہ ہر مقدمہ جیت جاتا ہے!

شیوراج اسکول میں، کالج میں، یونیورسٹی میں اور تب سے اب تک جو بھی کر چکا ہے یا جو بھی

کرر ہا ہے ویسے ہی کر رہا ہے جیسے وہ فلموں میں دیکھتا رہتا ہے! روکنے ٹوکنے والوں سے وہ دُور رہتا ہے! گھر میں وہ رِشی سے ہی نظریں ملا کر، باتیں کرتا رہتا ہے! ورنہ وی سی ڈی (V.C.D) پر پُرانی فلمیں دیکھتا رہتا ہے!

گھر کے باہر وہ اپنے چار عدد ایجنٹوں کی مدد سے ہی لوگوں سے رابطہ قائم کرتا رہتا ہے! چاروں ایجنٹ مالی فوائد کی خاطر، اُس کی ہر فلمی طرز کی عمل کا فلمی طرز میں ہی ردِ عمل کرنے میں ماہر ہیں اور چاروں اُس کے اسکول کے ساتھی ہیں! لیکن لڑکپن میں اپنی مطلوب اداکاری کے عوض فلمیں دیکھنے والے، اب اپنے ہنر سے شیوناتھ کی لاکھوں کی آمدنی کے معقول حصّے دار بن گئے ہیں! لیکن وہ بھی گھر نہیں آسکتے ہیں! اُن کی مدد سے اس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جو بدصورت ہونے کے علاوہ عمر میں شیوراج سے چار سال بڑی تھی! ایک غریب گھر کی لڑکی تب ایک پرائیویٹ اسکول میں موسیقی پڑھائی کرتی تھی اور ریڈیو پر گانے بھی گایا کرتی تھی! جب ایک فلمی طرز میں شیوراج اپنی نوبیاہتا بیوی کو گھر لایا تھا تب پڑوسیوں نے طنزاً کہا تھا کہ خُوبرُو شہنشاہ کے کندھوں پر باز کی بجائے چیل بیٹھ گئی ہے!

ہوا یوں تھا کہ ایک تہوار کی رسومات کے دوران وہ پھولوں کی مالا جو شیوراج کو شیولنگ پر چڑھاتی تھی، بے قابو بھیڑ کی وجہ سے وہ ایک اجنبی لڑکی کے گلے میں ڈال گیا تھا! بالکل ویسے ہی جیسے ایک فلم میں، ہیرو نے ایک بدشکل بجارن کے گلے میں مالا ڈال دی تھی! والدین کی مخالفت کے باوجود اُس نے اپنے چار ساتھیوں کی مدد سے بالکل فلمی طرز پر ایک مندر میں شادی کی تھی! تب شیوراج کی عمر بیس برس تھی!

شیوراج شادی کے ایک برس بعد ہی باپ بن گیا ہوتا مگر بقول بھاسکر، جو اُن دِنوں شیوراج کے گھر میں رہتا تھا، بیوی نے صحیح وقت پر اپنے شوہر کو اپنی زچگی کے درد کے بارے میں اطلاع دی تھی! مگر شیوراج نے اپنی ماں، نوکرانی یا گھر میں موجود افراد کی مدد لینے کی بجائے بیوی کو گود میں اُٹھا کر اسپتال لے جانا چاہا تھا! بوجھ بھاری تھا اس لیے سنبھالنا ناممکن تھا! بیوی فرش پر گر پڑی تھی اور حمل گر گیا تھا!

اس کے بعد وہ زنانہ امراض کی ایک نمائش بن گئی تھی! شادی کے چار سال بعد رِشی کو جنم دے کر وہ ایک طویل بیمار کے بعد مرگئی تھی!

رِشی تب آٹھ سال کا تھا اور شیوراج کی عمر صرف بتیس سال تھی!

طویل بیماری کے دوران اپنی بیوی کی ڈرامائی طرز میں خدمت کرنے والا شوہر شیوراج اپنے بیٹے رِشی کو ماں کا پیار بھی دیتا رہا! حالانکہ گھر میں اس کے والدین کے علاوہ بھاسکر اور اُس کی بیوی بھی موجود ہوا کرتے تھے! ایک خوددار فلمی ہیرو کی طرح وہ نہ تو کسی کی مدد نہ طلب کیا کرتا تھا اور نہ قبول کیا کرتا تھا! وہ امداد جو عورتیں ہی عورتوں کو دے سکتی ہیں، وہ بھی نہیں!

جب اُس کی بیوی کی چِتا اَگنی دان (آگ) مانگ رہی تھی تب شیوراج ایک فلمی ہیرو کی طرح چند جملے بار بار بولتا جا رہا تھا! ہر بار اپنی ادائیگی کو متاثر کن بنانے کی خاطر ایک رنجیدہ ماحول پر گرہن ڈال رہا تھا! وہ چِتا سے مخاطب ہوکر بولتا جارہا تھا کہ بھگوان نے رِشی کی ماں کو اُٹھالیا تو وہ کچھ نہ کرسکا! مگر وہ ایک سوتیلی ماں کو اس کا باپ چھیننے نہیں دے گا!

اُس بار بھی جان پہچان کے لوگوں کو شیوراج کی مضحکہ خیز حرکت پر غصہ اُبل رہا تھا جبکہ شمشان گھاٹ پر موجود اجنبیوں کے لیے اس کی کیفیت جذبات کے اُبال اور احساسات کی اُچھال کا مظاہرہ تھا! اس لیے سب شیوراج کی ڈرامائی ادائیگی برداشت کررہے تھے! اور اگر بھاسکر شیوراج کو اشارہ دِکھا کر مسئلے کو ختم نہ کردیتا تو حاضرین کو چند عذاب دہ گھنٹے گزارنے پڑتے!

شیوراج نے واقعی دوسری شادی نہیں کی ہے! ورنہ اُس نے کسی اور کو اپنی دنیا میں آنے دیا ہے! یعنی رِشی ہی اس کی دنیا ہے! اس لیے ہم شکل، ہم خیال ہونے کے ساتھ باپ بیٹے کی سوچ سمجھ اور عمل میں ہم آہنگی ہے! وہ بھی اس حد تک کہ جہاں باپ رُک جائے تو بیٹا وہاں سے شروع ہوجاتا ہے! عمل میں بھی اور ردِّ عمل میں بھی! یعنی باپ بیٹا دو جسم ایک جان ہیں! ایسا دونوں کے جان پہچان والے سمجھ رہے ہیں! دونوں کے بارے میں بیشتر شرارت آمیز باتیں مشہور ہوچکی ہیں! مثلاً کیا دونوں کھانا کھاتے ہیں یا ایک کھالے تو دوسرے کا پیٹ بھر جاتا ہے! کیا دونوں میں ایک ہی سہرا باندھ لے گا اور سہاگ رات دونوں کی ہوگی! کہیں باپ عدالت کو اسپتال اور بیٹا آپریشن ٹیبل پر مریض سے جرح کر بیٹھا تو؟ لیکن بھاسکر اور بھیروی کو معلوم ہے کہ رِشی کا اپنا تشخص ہے! اپنی سوچ ہے اور سمجھ ہے! سب سے اہم یہ کہ وہ ضدی نہیں ہے اسی لیے تو اس کی عمل میں لچک ہے! مگر آج اس کی سوچ سمجھ اور عمل میں لچک نہیں ہے! ہوتی تو بھیروی کے سوال کا جواب دے چکا ہوتا یا اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شیوراج کے دروازے کے باہر آوازِ

بلند بتا چکا ہوتا کہ میاں بیوی ایک ایسی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے جس میں جنسی تعلقات کو جسمانی عمل سے اُجاگر کرنے والے بہت سارے معلوماتی مناظر تھے!

لیکن ایسا نہیں ہوسکا ہے! حالانکہ بھیروی کو عارضی طور پر ایک عذاب دِہ تسلسل کو توڑنے میں کامیابی مل گئی تھی اور یوں اپنے شوہر سے بات کرنے کا ایک نادر موقع بھی ملا تھا! تب جب گئی رات بھیروی نے اپنے کمرے میں اپنے آئی پیڈ پر، اپنے ہی ایک رشتے کے بھائی کو گفتگو کے لیے مدعو کیا تھا! اونچی آواز سن کر شیوراج چونک پڑا تھا اور یہ جان کر کہ کال (Call) امریکہ سے ہے تو اس نے جنگ بندی کا اعلان کردینے کے بعد رِشی کو اپنے کمرے میں جانے کا حکم دیا تھا!

حالانکہ دروازہ بند کرتے ہوئے رِشی یوں ظاہر کر چکا تھا جیسے بھیروی نے اس کی ڈوب رہی سانسوں کو تھام لیا تھا! مگر جب وہ مقصد سے دُور بھاگ کر گہری نیند کا سہارا لیتا رہا تب رِشی کے بارے میں اس کی رائے کروٹیں بدل رہی تھیں! اور یوں ساری رات کروٹیں بدل بدل کر کٹ گئی تھی! بار بار وہ رِشی سے پوچھتی رہی! رِشی تم باپو جی کے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو جبکہ رِشی جواب دیئے بغیر سوتا رہا! ساری رات!!

دن کے دو بج چکے ہیں اور بھیروی کو یقین ہوگیا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں جاگ رہے ہیں! مگر اپنی اپنی ضد کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرنا چاہتے ہیں! بھیروی کو یقین ہوگیا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں کی فطرت اور خصلت ایک جیسی ہے! جیسے تالاب کے کنارے بیٹھی مینڈک اور ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھی مینڈک، برسات کے موسم میں ٹرٹرٹرٹر کی آوازوں سے اپنی شناخت کرا دیتی ہیں! ویسے ہی ضدی باپ اور بیٹے نے اپنی شناخت کرا دی ہے! یہ ایک عذاب دہ احساس تھا! اور بھیروی کو ذہنی طور پر تڑپا رہا ہے! مگر اس سے پہلے کہ بھیروی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کر پاتی وہ اپنے کمرے میں داخل ہو چکی ہے! دروازہ بھی بند کر چکی ہے! اور یہ جان کر اور بھی خوف زدہ ہو رہی ہے کہ رِشی کے ہوتے ہوئے بھی اس کمرے کے اندر بھی اتنا ہی سناٹا چھایا ہے جتنا بنگلہ کے دوسرے کمروں میں! اپنی آواز میں لرزش پر قابو پا کر وہ رِشی سے پوچھ بیٹھی ہے، ''رِشی میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہے ہو؟ تم اپنے باپ کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے ہو! میں مجبور نہیں کروں گی! مگر میرے سوال کا جواب تمھیں دینا پڑے گا؟ آخر تم ایک یا دو جملے بول کر اپنے باپ کی بھوک ہڑتال توڑنے کی کوشش

کیوں نہیں کرتے؟ آخر تم جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ کیا میں اپنے خدشات کو صداقت کا پیرہن پہنا کر تمھیں بھی اپنے باپ کی طرح ضدی سمجھ بیٹھوں؟"

"ضدی"، سُن کر رِشی ایک گیند کی طرح اُچھل کر بول پڑا ہے!

وہ اس لیے کہ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتا ہے! یہ بتا دینے میں کہ وہ بالغوں کے لیے ایک اطلاعاتی فلم دیکھ رہے تھے کوئی دِقت یا ہچکچاہٹ نہیں! ڈر تو اُس خوف کا ہے کہ جو قہر انگیز ہو سکتا ہے کہ اگر شیوراج نے یہ فلم اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ دیکھنے کے لیے کہا تو وہ ایسا کر نہیں پائے گا! وہ کوئی دوسری فلم بھی نہیں دِکھا سکتا ہے کیونکہ وہ باپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا ہے!

رِشی کی آواز میں لرزش ہے مگر سچائی بھی ہے!

اس لیے بھیروی سکتے میں آ گئی ہے! میاں بیوی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ منظر کسی فلم کا چربہ نہیں ہے حقیقت ہے! تصوراتی نہیں ہے!!

اچانک ایک آواز نے دونوں کی خاموشی توڑ دی ہے اور وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں! غیر متوقع واقعہ دیکھ کر وہ مسرت بخش سراسیمگی کا شکار ہو چکے ہیں!

شیوراج کانسی کی تھالی ایک ڈفلی کی طرح بجا رہا ہے، ایک مشہور اداکار کی نقل اُتار کر وہ ناچ بھی رہا ہے!

رِشی بھی جھوم جھوم کر ناچتے ہوئے اپنے باپ کی عمل ردِ عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے! باپ ایک فلمی انداز میں روٹھے بیٹے کو کھانا کھلا رہا ہے جبکہ بیٹا اپنی خوشی کا مظاہرہ کر رہا ہے! بھیروی دور کھڑی یہ منظر دیکھ رہی ہے!

شیوراج اپنے کمرے میں جا چکا ہے اور اُس کی گہری نیند کی تصدیق خراٹے کر رہے ہیں!

میاں بیوی بھی کھا پی کر اپنے کمرے میں آ کر سو جانے کی تیاری کر رہے ہیں!!

بھیروی آخر پوچھ ہی بیٹھی ہے کہ شیوراج کی ضِد کو کس نے توڑا ہے؟

رِشی نے اپنے بے ساختہ قہقہے کو دبوچ کر کہا "نوشیرواں عادل نے!"

بھیروی کو بھاسکر کی باتیں یاد آ گئیں! بقول اس کے شیوراج نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک انصاف پسند بادشاہ اپنی رعایا کا حال جاننے کی خاطر، ہر رات بھیس بدل کر، لوگوں کے گھروں کے باہر، اندر ہو رہی باتیں سنا کرتا تھا! بس نوشیرواں عادل کے کارناموں سے متاثر

ہو کر، شیوراج نے دوسرے کے خطوط پڑھنے یا بند کمروں کے باہر، اندر ہو رہی باتیں سن لینے کی عادت کو اپنے سینے سے لگایا ہے!

بھیروی مسکراتی رہی، مگر اچانک چونک پڑی ہے!!

تو کیا اس کا سسر رات بھر جاگ کر ان کی باتیں سنتا رہتا ہے!

اور آج بھی وہ سن رہا تھا! بند کمرے کے باہر!!

شام ہوئی ہے! شیوراج اور رِشی راج دونوں گہری نیند سو رہے ہیں! ویسے ہی جیسے دو ہم سفر ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد سو رہے ہوں! بھیروی جاگ رہی ہے، راگ بھیروی کی طرح سکھ میں، دکھ میں، دن میں، رات میں، کسی بھی پہر میں اور کسی بھی موسم یا ماحول میں باپ بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکی ہے! مگر یہ سوچ سوچ کر سمجھ نہیں پائی ہے اور سمجھ سمجھ کر سوچ نہیں پائی ہے کہ شیوراج نے شوق کی خاطر عادتوں کی ایک کھیتی پال رکھی ہے یا شوق ہی عادتوں کو پال رہا ہے! کیا وہ اپنی ضد سے دونوں کے انوکھے پیار کا تحفظ کر رہا ہے!

رِشی اپنے باپ سے بے حد پیار کرتا ہے مگر شیوراج کی طرح وہ جنونی نہیں ہے! اور وہ ضدی بھی نہیں ہے! یہ وہ جان گئی ہے!

OO

جانور

اتنا تو اس کو بھی معلوم تھا کہ بھگوان شنکر ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر رہتے ہیں اور جو بھی سچے دل سے بھگتی کرتا ہے اس کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں! اسی لیے تو اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بھوکا پیاسا رہ کر تب تک کٹھن تپسیا کرے گا جب تک بھگوان اس کو اس رِشی کے شراپ سے آزاد نہیں کرے گا جس کی وجہ سے وہ ست یگ سے لے کر کل یگ تک اپنے ہر جنم میں انسان کا دل لے کر ریچھ بن کر پیدا ہوتا ہے!

یہ اس کی زندگی کا المیہ ہے اور روز جب وہ پانی میں اپنا عکس دیکھ لیتا ہے تب اس کو صدیوں پرانا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب وہ ایک خوب رو تیر انداز تھا اور اپنے کرتب دکھاتا، تماشائیوں کے دل جیت لیا کرتا تھا! لیکن اس کی اس خوش بختی کو بدبختی نے دبوچ لیا تھا جب ریاست کے راجا نے اس کے آواز پر تیر چلانے کا کرتب دیکھا تھا، اسی دن اس کو مجبوراً راجا کا غلام بن جانا پڑا تھا، مجبوری یہ تھی کہ اس کا باپ بھی راجا کا غلام تھا، اسی دن اس کو مجبوراً راجا کا غلام بن جانا پڑا تھا، مجبوری یہ تھی کہ اس کا باپ بھی راجا کا غلام تھا، اس پر طرہ یہ کہ اس نے ایک سنگین جرم بھی کیا تھا! اس نے راجا کو اپنے راج گورو سے تیر اندازی کے کرتب سیکھتے ہوئے چھپ چھپ دیکھ کر کے ایک کراماتی ہنر سیکھا تھا، اس کی جان تو بخش دی تھی مگر ترکش اور تیر کمان دے کر اس کو اشارے دے کر تیر چلواتا رہا! اس کا تیر کسی اُڑتے پرندے کے پر کاٹ دیتا، کسی چرندے کی ٹانگ کاٹ لیتا یا انسان کے جسم کے آر پار ہو جاتا! یہ اس کو تب معلوم ہوتا تھا جب وہ اپنے آقا کے اشارے پر دوڑتے دوڑتے، ہانپتے ہانپتے اپنے شکار کو ڈھونڈ کر راجا کے قدموں میں ڈال دیتا تھا، لیکن تب بھی اس پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی، وہ خون دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا جیسے قیامت کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہو، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ سے بھی دُور دُور رہا کرتا تھا! اس کا باپ تلوار بازی میں اتنا ماہر تھا کہ ہوا میں اُچھالے سیب کو برق رفتاری سے چار ٹکڑے کیا کرتا تھا، یوں تو وہ ایک جلاد تھا مگر راجا اپنے مخالفین کو دربار میں بلا کر جب اُن سے اپنے ایک ہی وار میں اُن کا سر

دھڑ سے الگ کراتا تھا تب درباری خون کا فوارہ دیکھ کر واہ واہ کیا کرتے تھے جبکہ وہ اپنے باپ سے ڈر کر اپنے ہونٹ سی کر رات بھر آنسو بہایا کرتا تھا! تب پھر یوں تڑپا کرتا تھا جیسے ماہی بے آب! بچپن سے جوانی تک خون دیکھتے ہی اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی! پھر وہ منحوس دن آیا جب وہ اپنے آقا کے سامنے بے ساختہ رو پڑا تھا!

اس دن اس کا تیر ایک ایسے رِشی کے سینے میں لگا تھا جو سفید کبوتروں کو گندم کے دانے کھلا رہا تھا! رِشی گویا خون کے بھیانک دریا میں ڈوب رہا تھا! شکاری کی کیفیت دیکھ کر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں اس کو شراپ دیا! جا تو اپنے ہر جنم میں ریچھ بن جائے اور کچھ کھانے سے پہلے خون دیکھ کر یوں ہی لرزتا رہے، تاکہ اپنے آپ سے نفرت کرتا رہے!

ریچھ جانتا تھا کہ اگر وہ کوئی دیوتا، راکھشس یا بڑا آدمی، بُرا یا بھلا ہوتا تب کسی نہ کسی دھارمک کتاب میں اس کا ذکر ہوتا! کم از کم اس کی کہیں نہ کہیں نارد منی یا وِشنو کے اوتار سے ملاقات ضرور ہوئی ہوتی! مگر وہ ایک عام غریب آدمی تھا! اُن کا ذکر کون کرتا ہے! بلکہ ان کی فکر بھی کون کرتا ہے!! جو حال ست یگ میں تھا وہی حال کل یگ میں ہے! بلکہ یہی ہوتا بھی رہے گا جبھی تو وہ جان گیا تھا کہ بھگوان ہی اس کو اذیتوں سے آزاد کر کے اس کو اپنے اگلے جنم میں ایک ڈراؤنے جانور کی بجائے انسان کے دل کے ساتھ انسان کا جسم بھی دے دے، وہ بھی اس لیے کہ وہ اپنی آپ بیتی سنا کر خون خرابوں کو روکنے کے جتن کر لے!

یہ سوچ کر اس نے اپنی بھوک کی شدت پر قابو پا کر جب پھر بھگوان شنکر کا جاپ کیا تب اس نے ویران جنگل میں چند لوگوں کی آوازیں سن لیں! آنکھیں کھولیں تو دیکھا چند انسان اپنے اِغوا کیے چاروں لوگوں کو بے رحمی سے مار رہے تھے! خون سے برف کا رنگ لال ہو گیا تو وہ فاتحانہ قہقہے لگا کر چلے گئے! ریچھ نے سوچا کہ کیا یہ عبرت ناک منظر بھگوان نے، کسی دیوتا نے یا کسی شراپ دینے والے رِشی نے دیکھا ہوگا! وہ گئی رات تک لاشوں کے پاس بیٹھا رہا اور چاند کو دیکھتا رہا! پھر اچانک یوں لگا جیسے چندرما جل رہا ہے اور چاندنی سلگ رہی ہے!

اچانک اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور اپنی تپسیا بھنگ کر کے بڑبڑانے لگا! میں جانور ہوں اور میرے سینے میں انسان کا دل ہے! کیا خون بہانے والے انسانوں کے سینوں میں درندوں کے دل ہیں؟ یہ سوچ کر وہ اپنی بھوک مٹانے کی خاطر اُن جانوروں کے خیمے پر ٹوٹ پڑا جو اپنی فتح کا جشن منا کر گہری نیند سو رہے تھے!

فریاد

چوہا بلّی سے ڈرتا رہا اور بلّی کتّے سے خوف زدہ تھی! مگر کتا اس لیے حیران تھا کہ اس کا مالک رات کے سناٹے میں اپنے بال بچے کو ساتھ لے کر کہاں گیا ہوگا!
یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ مالک گولی سے بچنے کی خاطر اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا! سچی بات تو یہ ہے کہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا! اس کے دو بھائی قتل ہو چکے تھے اور اب شاید اس کی باری تھی اس لیے وہ تاریکیوں میں کود کر نظر سے اوجھل ہو چکا تھا!! اور وہ منظر کتا دیکھ چکا تھا!
یہ سب اس روز ہوا تھا جب مالک اپنے وفادار کتّے کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف جا رہا تھا! صرف اس لیے کہ وہ اُس آدم خور چیتے کو ختم کر سکے، جس کو خونِ آدم پینے کا چسکہ پڑ گیا تھا! ہاں وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ اس کا مالک بے چاری گائے کے بارے میں بے حد پریشان تھا! گھر چھوڑ نے سے پہلے مالک نے اس کو گئوشالہ میں بند کر دیا تھا! وہ بھی اس لیے کہ کہیں کوئی ڈاکو اس کو اپنے ساتھ نہ لے جائے! وہ ماں بننے والی تھی نا! اس لیے اپنی دانش مند منصوبہ بندی کے تحت گائے کے سامنے پانی اور بہت ساری گھاس رکھ کر اُس نے گائے کو ایک لوہے کی مضبوط زنجیر سے بھی باندھ ہی دیا تھا! تب مالک کو کیا معلوم تھا کہ یہ حفاظتی زنجیر ہی بے چاری گائے کی بیڑیاں بن جائے گی!!
بے چارہ کتا چوہے اور بلّی کی دوستی کروا کر خود اُن کا محافظ بن گیا تھا! مگر سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اس رات خود گھبرا گیا تھا جب جنگل کی آگ سے بچ کر، چیتا گاؤں میں چلا آیا تھا! گاؤں کے ہر گھر میں ویرانی دیکھ کر وہ بوکھلا گیا تھا! اگر اس کو کوئی بندوق والا بھی مل جاتا تو شاید اس کو بھی کھا جاتا مگر کوئی آس پاس ہوتا تب نا! مالک کا گھر ہی نہیں بلکہ سارا علاقہ ڈراؤنے سناٹے کا منظر تھا!
بے چاری گائے نے اسی رات ایک خوبصورت بچھڑی کو جنم دیا تھا! مگر اس ننھی سی جان کو دو گھونٹ دودھ پلانے سے پہلے ہی اُس نے بچھڑی کو کہاں چھپا لیا تھا،

یہ وہی جانتی تھی مگر تب جب تک کتے نے گائے کی آوازیں سُن لی تھیں تب تک چیتا گئوشالہ میں داخل ہو چکا تھا اور چند ہی لمحوں میں اس کو کھا بھی چکا تھا! کئی دنوں کے بعد بچھڑی بھی چوہے بلّی اور کتّے کی دوست بن چکی تھی مگر پھر بھی وہ بار بار گئوشالہ میں اکیلی جا کر اپنی ماں کو تلاش کرتی رہتی تھی! اور تینوں دوست اس کا ساتھ دیا کرتے تھے!!

گئوشالہ میں ماں تو تھی نہیں، ہاں دو سینگ تھے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا، زنجیر سے بندھا ہوا! چاروں بار بار ایک بھیانک منظر دیکھ کر ہر بار ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے ہم آہنگ ہو جایا کرتے تھے!

کتا صبح و شام دُعا کرتا رہتا تھا اور یہی فریاد کرتا تھا کہ اس کا مالک گھر لوٹ آئے اور اشرف المخلوق کی طرح چوہے بلّی کتّے اور بچھڑی کی دیکھ بھال کر سکے! اوپر والے نے شاید اس کی فریاد سن لی تھی اور مالک صبح سویرے لوٹ آیا تھا! گویا ایک کالی رات کے بعد چمکیلی سحر سامنے تھی! کتّے نے دُم ہلائی اور شاید وہ مالک سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا! مگر مالک جنگ بندی کے فوراً بعد گھر لوٹ کر اپنے نقصانات کی فہرست بناتا رہا! مصروف تھا اس لیے کتّے کو نظرانداز کرتا رہا!!

کھڑکیاں، دروازے، میز، کرسیاں، پھل پھول، اناج کے بعد جب وہ گئوشالہ میں نقصانات کی فہرست تیار کرنے لگے تو اپنی گائے کے سینگ دیکھ کر مالک کے شانہ بشانہ چلنے والی مالکن چند لمحات کے لیے بے ہوش ہوگئی! پھر ہوش میں آ کر وہ چلاتی رہی! ہائے میری جرسی گائے! بیس کلو دودھ دیتی تھی، ہائے میری گائے، ہائے میری گائے!

یہ سب دیکھ کر چوہے بلّی اور کتّے نے بچھڑی کی ہمّت بندھائی اور اس کو مالک کے قریب جانے کے لیے رضامند کیا! مگر جونہی وہ قریب پہنچی، مالک گائے کے سینگ الٹ پلٹ کر بیوی سے کہہ رہا تھا کہ ان کو سنبھال کر رکھو ورنہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہمارے پاس گائے بھی تھی!

معاوضے کے لیے ایک فہرست تیار کرنے والے انسان کے یہ الفاظ سن کر بے چاری معصوم بچھڑی اس منظر کو یاد کر رہی ہے! جب چیتا اپنے لمبے لمبے دانتوں اور ناخنوں سے اس کی ماں کے جسم کی چیر پھاڑ کر رہا تھا!

سنگین رات کے بعد اُجلے دن میں بچھڑی چیتے کی دہشت سے زیادہ اپنے مالک کے ارادوں سے خوف زدہ ہے اور اپنے آپ کو کوس رہی ہے کہ وہ دنیا کے مالک سے، گھر کے مالک کی

سلامتی کی دعائیں کیوں مانگتی رہی!اور اُس کے گھر لوٹنے کے لیے کیوں فریاد کرتی رہی! بے چارہ کتّا خاموش ہے اور چوہا خوش ہے کہ اس کو بلّی سے کوئی ڈر نہیں ہے اور بلّی خوش ہے کہ کتّا اس کو جان سے مارڈالنے کا کوئی بھی ارادہ نہیں رکھتا ہے! جبکہ مالک کو یقین ہے کہ جنگ بندی کے بعد نہ آگ برسے گی اور نہ خون کی ندیاں بہنے لگیں گی اس لیے وہ بار بار اپنی فہرست دیکھ کر یہ تسلی کر رہا ہے کہ فرضی نقصانات کے علاوہ کوئی معقول شے تو نہیں رہ گئی ہے جس کے معاوضے سے وہ محروم رہیں!!

OO

فصل

کئی دِنوں سے میاں بیوی، دونوں، کرب کی شدت محسوس کرر ہے ہیں! دونوں نے ایمانداری سے معاہدے پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ چاہتے ہیں کہ سوداگر کا بچہ جنم لے اس لیے وہ بے صبری سے دو جانچ رپورٹوں کا شدت سے انتظار کرر ہے ہیں!

ایک سال پہلے جب اُن کی شادی ہوئی تھی تب دونوں نے، اپنے بزرگوں کی طرح، کسمپرسی میں بھی، ایک پُرسکون زندگی بسر کرنے کا عہد اُٹھالیا تھا! تب زمین تو تھی مگر اچھی فصل پیدا کرنے کے لیے سرمایہ نہیں تھا! دُور دُور تک پھیلے کھیتوں میں وہ گھاس اُگا کر ہی اپنا چولھا جلانے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے! مگر شاید بیوی کی وجہ سے ہی کاتبِ تقدیر نے اُن کی تقدیر بدل دی تھی! کیونکہ جس دن وہ ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں داخل ہوئی تھی اُسی دن ایک سوداگر ان کی زندگی میں آیا تھا! اور آتے ہی اندھیروں کو اُجالوں میں بدل گیا تھا! تب ایک سودا طے ہوا تھا! جس کے تحت زمین کو خریدنے یا اپنانے کی بجائے، کرائے پر لے کر، ٹریکٹر چلانے، زمین کو اچھی کاشت کے قابل بنانے، اچھی بیج بونے کے بعد، مکمل کاشتکاری کے اخراجات سوداگر کی ذمہ داری تھی! میاں بیوی ایک سال تک سوداگر کے خصوصی مہمان بن کر رہیں گے، یہ بھی معاہدے میں درج تھا! اُس کے علاوہ ہر ماہ دونوں کو، ایک موٹی رقم بطور کرائے کی قسط ملنی طے تھی!

جیسا طے ہوا تھا ویسا ہی ہو چکا تھا! یعنی سوداگر ہر ماہ چار پانچ دن اُن کے ساتھ گزارتا رہا! اور اپنی مسکراہٹوں کی بہتات اور لفظوں میں کنجوسی برتنے کے علاوہ، تحائف دے کر، اچھی فصل کاٹ کر چلے جانے کے بارے میں کہتا رہا! بلکہ کبھی کبھی میاں بیوی کے ایک مقصد کی خاطر، پاس ہو کر بھی دُوریاں رکھنے کے بلند عزم سے متاثر ہو کر ہر ماہ طے شدہ رقوم سے دوگنی رقم بھی دیتا رہا!

سال بھر جو بھی ہوتا رہا قانون کے دائروں میں ہو چکا تھا! لیکن میاں بیوی نے زمین کی فصل سوداگر کے سپرد کی تھی مگر معاہدے کے مطابق دوسری فصل دے نہیں پائے ہیں! سوداگر چاہتا تو

بقیہ رقم دینے کی بجائے معاہدے کی اہم شرط توڑنے والوں سے دے چکی رقوم بھی سود سمیت لوٹانے کی ضد پکڑ لیتا! یا پھر زمین پر اپنا حق جما لیتا! اور کچھ نہیں تو اپنے غصّے سے اپنی نفرت کا احساس دلاتا! مگر اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا! بلکہ وہ ایک مہینے کا وقت دے کر دوسری فصل کے بارے میں اطلاع دینے کی ہدایات، بہت ہی نرم لہجے میں، دے گیا تھا اور یہ وعدہ کر گیا تھا کہ اپنی اولاد پا لینے کے بعد وہ میاں بیوی کی سبھی اپنی ہونے والی اولادوں کی، بہت اچھی پرورش کا خرچہ بھی وہی برداشت کرلے گا! شرط یہ کہ وہ اُس کو اولاد دیں! تب! ورنہ نہیں!!

ظاہر ہے کہ میاں بیوی سوداگر کو ایک محسن ہی نہیں بلکہ ایک مسیحا کا رُتبہ دے چکے ہیں! دونوں کو یہ احساس ہوا ہے کہ سوداگر ایک پھل دار شاخ کی مانند جھکا رہتا ہے! بلکہ اپنی لچک کی وجہ سے وہ آندھیوں میں بھی جھولتا رہتا ہے جبکہ بے ثمر خشک ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے بھی یا شور کرتی رہتی ہیں یا پھر ٹوٹ جاتی ہیں! ان جیسے بد بخت لوگوں کی طرح!

اپنی پہلی ہی ملاقات میں میاں بیوی یہ جان گئے تھے کہ کروڑ پتی سوداگر کو، کاتبِ تقدیر نے، صحراؤں میں پوشیدہ خزانوں اور بیابانوں میں بہاروں کی شوخیوں کو حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے مگر اولاد کی خوشی سے محروم رکھا ہے! جس قانون دان دلال نے زمین کو کرائے پر لے کر فصل حاصل کرانے کا سودا طے کیا تھا، اُس نے اُسی دن پچاس برس کے بے اولاد سوداگر کے لیے بیس برس کی دُلہن کی کوکھ کرائے پر لینے کی بات کی تھی! جو میاں بیوی نے ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کی تھی! یعنی بیوی ایک سال تک اپنے شوہر سے دور اور سوداگر کے قریب جانے کے لیے رضامند ہو گئی تھی! فقط ایک خوشحال زندگی بسر کرنے کی خاطر، اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر!

سوداگر ہر مہینے دو یا تین چکر لگا کر اپنے دوسرے علاقہ جات میں جایا کرتا تھا! مگر اس بار وہ دس مسلسل راتیں گزار کر چلا گیا ہے! لوٹ کر نہ آنے کی اطلاع دے کر! لیکن اچھی فصل، جو کھیتوں سے مل گئی تھی، وہ پا لینے کی خوشی میں وہ میاں بیوی کو ایک موٹی رقم دے گیا ہے جس کو لیتے وقت میاں بیوی، دونوں کو سوداگر کے وعدے میں ایمانداری نظر آئی تھی اس لیے کرائے کی ماں نے اپنی طبّی جانچ کروالی تا کہ اس بار حمل ٹھہرنے کی اطلاع دے سکے! زمین کے مالک یعنی شوہر نے بھی مٹّی کی جانچ کروادی ہے تا کہ وہ چھوٹے پیمانے پر ایک اچھی فصل پیدا کرنے کی سعی کر سکے!

ایک رپورٹ ایک کاشتکار کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا اعتماد دے سکتی ہے اور دوسری رپورٹ ایک مددگار اور مصلح کار کے ایک احسان کا بدلہ چکانے کا ایک سنہرا موقع دے سکتی ہے!

بالکل ایک ایسے اعتقاد پسند پجاری کی طرح جو اعتماد سے، اپنے دیوتا کو خوش کرنے کی خاطر، اپنا سر قربان کر دیتا ہے!

کئی دنوں بعد دونوں رپورٹیں آ چکی ہیں! لیکن ماہرین نے میاں بیوی کا تجسّس اور تذبذب ختم کرتے ہوئے دونوں پر بجلیاں گرا دی ہیں!

بیج زمین کی کوکھ میں اپنا وجود مٹا کر جب جڑیں، پکڑ لیتا ہے تب ایک پودا جنم لیتا ہے! دونوں اس حقیقت سے آشنا ہیں! دونوں ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر، اپنے بے آواز تھرتھرا رہے ہونٹوں اور سکتے میں آ چکی آنکھوں سے بہہ رہے آنسوؤں سے پوچھ رہے ہیں کہ سوداگر ایک چارہ گر ہے یا ایک ستمگر!

مٹی کی جانچ یہ عیاں کر چکی ہے کہ جس کھیت میں، سفید کپڑوں کو اُجلا پن دینے والی نیل کی کاشت ہو چکی ہو، وہ زمین ایک فصل کے بعد چار برس کے لیے بنجر بن جاتی ہے! اور اس کے بعد کھیت میں نیل کی ہی کاشت ہو سکتی ہے! یعنی اچھی لاگت کے بعد ایک بہت ہی منافع بخش فصل!

کوکھ کی جانچ یہ بیان کر رہی ہے کہ حمل روکنے والی گولیوں کے بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے ایک عورت کبھی ماں نہیں بن سکتی ہے! گویا وہ جو گولیاں ایک معصوم عورت طاقت کی خاطر کھا چکی تھی وہ جنسی قوت بخشنے والی گولیاں تھیں؟

یہ اَن پڑھ لوگ کیسے جان پاتے! مگر نیل کی کاشت پوشیدہ تو نہیں تھی؟ -!!

تو کیا سوداگر ایک جادوگر بن کر اپنی من چاہی فصلیں کاٹنے کا عادی ہو چکا ہے؟ میاں بیوی ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے ہیں گویا ایک وارڈ کے دو کینسر کے مریض!!

OO

کیوں؟

اُس کے کاروبار کسی نہ کسی وجہ سے ڈوبتے رہتے ہیں اس لیے ایک اور ناکامیابی سے وہ مایوس نہیں ہے بلکہ اس بار وہ اپنے دس برسوں سے چل رہے کاروبار کے اچانک بند ہوجانے سے خوفزدہ ہے! کیونکہ اچانک دوپہر کے آفتاب کو گویا مکمل گرہن نے دبوچ کر اُجالوں کو دبوچ ڈالا ہو! یا پھر راتوں میں تاریکیوں کو چیرنے والی روشنیوں کو ایک گرڈ (Grid) پاور ہاؤس میں موجود ایک سوئچ (Switch) دبا کر چھین لیا گیا ہو! جو بھی ہوا ہو! کیوں؟

اس کے کاروبار آج تک یوں بند نہیں ہوئے ہیں! کوئی کاروبار ایک دَمے کے مریض کی طرح گھٹ گھٹ کر دم توڑ گیا تھا! کوئی کاروبار ایک مچھلی کی طرح پانی میں رہ کر بھی، شکاری کے کانٹے میں پھنس کر، اُچھل اُچھل کر دم توڑ گیا تھا! وہ ہر بار یہ تو جان پایا تھا کہ بربادی کے وجوہات کیا تھے! کبھی درآمد اور برآمد کے گردابوں کے اثرات! کبھی عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں کے اثرات! کبھی سرکاری پالیسیوں، بجلی کی قلتوں، کبھی سیاسی یا تنظیمی سمجھوتوں، کبھی ہڑتالوں کے دباؤ یا بھاری بوجھ کے تاثرات!

بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے سے گریز کرتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ بہت ہی چھوٹے پیمانوں پر کاروبار کرنے کا عادی ہو چکا ہے! دراصل وہ اپنے کروڑوں کی آمدنی کا ایک حصہ ایک مقصد کے لیے داؤ پر لگانے کی عادت اپنا چکا ہے! جن لوگوں کو وہ اپنے کاروبار کی بدولت روزگار مہیا کردیتا ہے وہ عالمی سطح پر معروف وِجے کمار کو بصد احترام کرانتی کمار کے نام سے جانتے ہیں جبکہ عالمی کاروباری دائروں میں موجود اُس کے ہم عصر اُس کو طنزاً یا حوصلہ شکن ارادوں سے 'نام نہاد کرانتی' کے نام سے جانتے ہیں! بقول اُن کے وِجے کمار پچھلے پچاس برسوں سے سستی شہرت پانے کی خاطر نت نئے کاروبار شروع کرتا رہتا ہے تو انکم ٹیکس کی بچت کے علاوہ خبروں میں چھائے رہنے کی خاطر! اس لیے اُس کے مشہور قول اور عمل کو بطور 'مکاری کے نمونے' ایک دوسرے کو سنا کر، اُس کا مذاق

اُڑاتے رہتے ہیں! جبکہ اس کے ہر کاروبار میں شامل لوگ اس کی باتوں کو معنی خیز سمجھتے ہیں! گویا وہ اُس کی خوبیوں میں خامیوں کے کیڑے تلاش کرنے کے عادی نہیں ہیں! بلکہ وہ اُس کے قول اور عمل کی خوشبو سے متاثر ہونے کے عادی ہیں! وِجے کمار اپنے آپ کو اپنے نام سے ہی پیش کرنے کا عادی ہے! اور چاہتا ہے کہ گھر میں بار بار گھسنے والے سانپ کو پکڑنے کے لیے ہر بار ایک جان پہچان کے سپیرے کو بلانے سے اچھا ہے کہ ایک بار خود سانپ کو پکڑا جائے، بھگایا جائے یا پھر کچلا جائے! تا کہ یہ جانا جا سکے کہ اپنے پالتو سانپ کو گھروں میں ڈالنے والا وہ سپیرا ہی تو ہے جو چھُپ کر گھستا ہے اور گھُس کر قابض ہو کر اپنی منصوبہ بندی کی ایک اہم کڑی بنا لیتا ہے!

بقول وجے کمار چائے میں دودھ ڈالنے سے چائے کا رنگ اور شکر یا نمک ڈالنے سے اُس کا ذائقہ بدل جاتا ہے! گویا ملاوٹ سے چائے کی اپنی خوبیاں اور خامیاں چھُپ جاتی ہیں! اس لیے کیوں نے نا ملاوٹ سے اور دِکھاوٹ سے اپنے ارادوں کو پاک رکھا جائے!

چسکہ لگ جائے تو نشے کی لت بن جاتا ہے! بند بوتلوں میں مغرب سے درآمد کیا گیا مشروب پینے سے اچھا ہے کہ اپنے کھیتوں میں اُگائے گئے گنے کا رس پیا جائے! یا پھر نیموں کا رَس چوُسا جائے! ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر خود غرض دوستوں سے اُدھار لیا جائے یا پھر کسی ساہوکار سے بلکہ چھوٹے بڑے بینکوں یا عالمی بینکوں سے قرضے لیے جائیں تو سُود یا سُود در سُود کے ساتھ لوٹانے ہی پڑتے ہیں! لینے والے کی خودکشی کرنے کے بعد بھی! پھر کیوں نا ٹانگیں اُتنی پھیلائی جائیں جتنی کہ چادر لمبی ہو! بلکہ چادر میلی ہو تو دکھاوٹ کے لیے بناوٹ اچھی منصوبہ بندی ہو ہی نہیں سکتی!

وِجے کمار ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اولاد ہے! کالج کے زمانے سے وہ اپنے باپ کی صحبت میں رہ کر کاروباری نبض دیکھنے میں مہارت حاصل کر چکا ہے! وہ پچاس برس پہلے لندن سے ایم بی اے بھی کر چکا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اگر دوسرے میدانوں میں تعلیمی تربیت اثر انداز ہو سکتی ہے تو کاروبار میں کیوں نہیں؟ ظاہر ہے کہ ہر ذہین انسان تجربے کر سکتا ہے! اس لیے وہ تجربے کرتا رہتا ہے! ایک تخلیق کار بن کر وہ اپنے ہر کاروبار کو شروع کرتا ہے! کامیابی کی توقعات کی اُمید کے ساتھ مگر، ناکامیابی کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنے کی خاطر!

اپنے ایک دوست کی زکوۃ سے غریب پڑوسی بھی عید کی خوشیاں سمیٹتے رہتے ہیں مگر وہ کبھی یہ جان نہیں پاتے ہیں کہ نام نہاد دوست کی خیرات میں دی گئی لاکھوں کی رقم اُن کے اِرد گرد

پھیلی اقتصادی تاریکیوں کو دکھاوے کی دیوالی دبوچ لیتی ہیں یا نہیں؟

وہ سوچ سمجھ کر ہر سال خود غریبوں کو کپڑے، اناج دیتا رہا! پھر رفتہ رفتہ وہ بے روزگاروں کو اپنے کاروباروں میں شامل کرتا رہا! ایک بند ہو جایا کرتا تھا تو دوسرا کاروبار شروع کر دیا کرتا تھا! مگر ویسے کاروبار جس میں انسانی وسائل ہی اثر انداز ہوں! جیسے کھیتی باڑی کے پانی یا بجلی قلّت کی وجہ سے بند ہوتے ہی وہ بھینسوں کی پرورش کر کے دودھ، گوشت، چمڑے کے جیسے کاروبار شروع کرتا رہا! مقصد یہ کہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں ان کی اپنی کاوشوں سے پوری ہوں!

وِجے نے امریکہ میں ایک انعام یافتہ دستاویزی فلم دیکھ لی تھی! فلم میں بھوکے انسانوں کو، ایک پانچ ستارہ ہوٹل سے پھینکے گئے جھوٹے کھانے کو، پرندوں کی طرح کُرید کُرید کر یا جانوروں کی طرح پنجے مار مار کر، کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا! یہ سوچ کر کہ بھوکے انسانوں کی بے بسی اور لاچاری کو جب ایک فلم کار نے اپنے کاروبار میں شامل کیا ہے تو پھر وہ بھی تو ان کو اپنے ایک نئے کاروبار میں شامل کر سکتا ہے! وطن لوٹ کر، جب اُس کا عام لوگوں سے کرایا گیا مُرغیاں پالنے کا کاروبار ناکامیابی کے دلدل میں دھنس چکا تھا اُس نے پہلی بار ایک انوکھے کاروبار کی شروعات کی تھی! فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کرنے والے، خاص طور پر پانچ ستارہ ہوٹل کے بغل میں، دادا لوگوں کو رقوم دے کر، ہوٹل کے باہر پھینکے گئے کھانے کا شرف حاصل کرنے والوں کو وِجے کمار نے لفافے دیئے تھے! اُس میں بھرے چنے کھا لینے کے بعد ان سے ہی لفافوں میں جھوٹا کھانا ڈال کر، دادا لوگ ایک طے شدہ رقم لے کر وِجے کمار کے نمائندوں کو دیتے رہے تھے!

شروع شروع میں اُن لفافوں کو پولٹری فارم والوں کو مفت دیا گیا تھا لیکن ایک سال بعد جب کاروبار جڑیں پکڑ گیا تھا پھر مخصوص چارہ بنا کر قیمتاً دیا جانے لگا تھا! گویا لفافوں کے بدلے لفافے عام لوگوں کی پیٹ بھرنے کی ضروریات پوری کرنے لگا تھا! ایک معقول سلسلہ تھا جس میں ہوٹل میں کام کرنے والے، فٹ پاتھوں پر رہنے والے اور داداگیری کرنے والے، سبھی کا اپنا اپنا کام ایمانداری سے کر رہے تھے! دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دس برس کے سفر کے دوران بڑے بڑے شہروں، چھوٹے شہروں، ملک بھر کے تمام قصبوں کے چھوٹے بڑے ہوٹلوں، ڈھابوں سے جھوٹا کھانا، مرغیوں کے لیے چارہ بنانے والوں کو ملتا رہتا تھا! بلکہ شادی بیاہوں کا جھوٹا کھانا بھی چارہ بنانے والوں کو ملتا رہتا تھا! لیکن اپنے عروج پر پہنچا یہ کامیاب کاروبار اچانک بند ہو چکا تھا!

تحقیق کرنے کے بعد آج وِجے کمار عرف کرانتی کی، یا نام نہاد کرانتی کمار کاروبار کے بند

ہونے کی وجہ جان چکا ہے!

کسی مغربی کمپنی نے ملک بھر کے جھوٹے کھانے کو خریدنے کے حقوق خرید لیے ہیں! مگر کس نے کس کو حقوق دیئے؟ اور کیوں؟ کئی سوالات اس کو ڈرا رہے ہیں!

کیا کمپنی مرغیوں کا چارہ بنا کر برآمد کرنے جا رہی ہے یا ڈھاکے کی ململ کی طرح ملک بھر کے صارفین کے لیے درآمد کرنے کا منصوبہ بنا چکی ہے؟ اپنے خوبصورت اور بے حد قیمتی ڈبوں میں ڈال کر؟

اور سب سے اہم یہ کہ کمپنی کیا پالتو مرغیوں، پرندوں، جانوروں کے لیے چارہ بنا رہی ہے یا انسانوں کے لیے کوئی لذیذ ضیافت یا خوشبودار قیمتی مشروب؟

یہ سچ اُس کے ہم عصر یقیناً جانتے ہوں گے!

مگر وہ یہ جان نہیں پایا ہے! — کیوں؟ — کیوں؟؟

OO

خوف

بابو بابا ہندو ہے یا مسلمان، سکھ ہے یا عیسائی ہے، یہ کوئی بھی نہیں جانتا ہے! شاید کوئی جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہے کیونکہ بابا اللہ اور ایشور دونوں کی باتیں کرتا ہے! ایک جھونپڑی میں رہتا ہے! بکری کا دودھ پی لیتا ہے اور ہر وقت اپنے باغ میں لگائے ہوئے طرح طرح کے پودوں کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے! اس کا باغ اتنا خوبصورت ہے کہ دیکھنے والے کو اپنے دکھ درد بھول کر چند پُرسکون لمحات ملتے ہیں! لیکن پچھلے کئی دنوں سے بابا کے باغ کو کوئی دیکھنے نہیں آیا ہے! شاید اس لیے کہ شہر میں اتنے دنگے فساد ات ہوتے رہے ہیں کہ سڑکوں پر خون کی لکیریں ہیں اور یہی لکیریں دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہیں!

بابا پریشان بھی ہے اور حیران بھی! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ اپنے باغ میں ٹہلتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا جب ایک خوف زدہ نوجوان اس کے سامنے یوں گر گیا جیسے کبھی گوتم بدھ کے سامنے ایک زخمی پرندہ اپنے لہولہان پر پھڑ پھڑاتا ہوا گر پڑا تھا! یہ دیکھ کر بابا کے جسم پر بجلی گر گئی ہے اور وہ نوجوان کو دیکھتا رہا!

نوجوان ہانپ رہا ہے، کانپ رہا ہے اور اس کی زبان لرز رہی ہے!

''بچاؤ، بچاؤ'' وہ مشکلاً کہہ پایا ہے! بابا نے نوجوان کو گلے لگایا تو وہ بلک بلک کر رو پڑا اور بابا کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر کہنے لگا! ''بابا، وہ میرا پیچھا کر رہا ہے! وہ مجھے مار ڈالے گا!''

بابا نوجوان کی کیفیت بھانپ گیا اور اس کو اپنی جھونپڑی میں چُھپا کر جب باہر نکلا تو وہ ایک اور نوجوان کو احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی چونک پڑا! اس نوجوان کی حرکتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہے! وہ بھی ہانپ رہا ہے اور واقعی دوڑتا ہوا احاطے کے اندر گھس آیا ہے! اس سے پہلے کہ وہ بابا کو دیکھ پاتا، پہلے نوجوان نے دَبی دَبی آواز میں کہا: ''بابا یہی ہے وہ خونخوار انسان جو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے! بابا میں بے قصور ہوں! میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے! کالج میں پڑھتا ہوں اور فرقہ پرستی کا شکار ہو رہا ہوں! بابا اگر میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

بابا نے دوسرے نوجوان کو غور سے دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی گھبرایا ہوا ہے بلکہ خوف زدہ بھی ہے! بابا نے قریب جا کر جب اس کا کندھا پکڑ لیا تب اس نے بابا کو دیکھتے ہی اس کے پاؤں پکڑ لیے! یوں لگا جیسے نوجوان نے مسیحا کو دیکھ لیا ہے! اس کی آواز میں بھی لرزش ہے اور وہ اپنے پھولتے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر دَبی دَبی آواز میں بڑبڑا تا رہا ہے!

''بابا مجھے بچالو! وہ میرا پیچھا کر رہا ہے! وہ مجھے مار ڈالے گا! بابا اگر میں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تو اس میں میرا کیا قصور ہے!''

اس نوجوان کی باتیں سن کر بابا چونک پڑا اور ٹوک کر پوچھنے لگا! ''تم جب کسی کو مار ڈالنے کی خاطر اس کا پیچھا کرتے رہے تب یہ نہیں سوچا کہ وہ بھی بے قصور ہے، معصوم ہے، وہ بھی تمھاری ہی طرح ایک انسان ہے!''

بابا کی باتیں سن کر دوسرا نوجوان رو پڑا! ''بابا میں کسی کے پیچھے نہیں پڑا ہوں بلکہ وہ دیکھو، وہ دیکھو میرے پیچھے کوئی پڑا ہے! وہ اسی طرف آ رہا ہے! وہ مجھے مار ڈالے گا! وہ مجھے مار ڈالے گا! مجھے بچالو بابا! میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں! مجھے بچالو! وہ قریب آ رہا ہے! آپ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن رہے ہیں بابا!'' اور وہ بلک بلک رو پڑا!

نوجوان کی حالت دیکھ کر بابا نے اس کو بھی اپنی جھونپڑی میں چھپا لیا اور دروازہ بند کر کے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا ہو کر اُس کا انتظار کرنے لگا! جس کے قدموں کی آہٹ دوسرے نوجوان کو یوں سنائی دے رہی ہے گویا پھانسی سے پہلے کال کوٹھری میں بیٹھے قیدی کو جیلر کے قدموں کی چاپ!

''ایک خونخوار کتا ایک نوجوان کا پیچھا کرتا رہا جو جان بچانے کی خاطر دوڑتا بھاگتا رہا اور دوسرا نوجوان اس کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر دوڑتا بھاگتا رہا! دونوں خوف زدہ تھے اور خوف ان کا پیچھا کر رہا تھا!'' بابا نے دونوں کو یہ بتا دیا تو دونوں نوجوان ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس پڑے! پھر قہقہے لگاتے رہے!

''میں سمجھتا رہا کہ تو میرا پیچھا کر رہا ہے!'' پہلے نوجوان نے اطمینان کا سانس لے کر کہا!

''میں خوف زدہ تھا! تمھارا پیچھا کیوں کرتا؟'' دوسرے نوجوان نے پہلے نوجوان کو گلے سے لگا کر کہا! بابا یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر دروازہ کھول کر دونوں سے کہنے لگا!

''وہ خونخوار کتا پھاٹک کے باہر کھڑا تمھارا انتظار کر رہا ہے! کیا تم دونوں اس کو بھگا نہیں سکتے؟'' دونوں نوجوانوں کے چہروں پر معنی خیز تاثرات تھے مگر اب وہ خوف زدہ نہیں تھے!

OO

گناہ

وِشوا اگر اپنی خواہش کا اظہار معمول کی طرح مصلحتوں کے دائرے میں رہ کر کر دیتا تو وسوندھرا بھی معمول کی طرح اس کی فرمائش کو قبول کر لیتی یا انکار کر دیتی، یعنی شرما کر یا مسکرا کر! مگر اس بار اس نے اپنے دل کی بات بے باکی سے کہہ دی اور ایک ضدی بگڑے نواب کی طرح جواب بھی اپنی مرضی کے مطابق سننے کے لیے خود ہی وضاحت، وکالت بلکہ مفاہمت کے لیے یوں بولتا رہا جیسے ایک آبشار اپنے بہاؤ کی روانی میں اور شور پیدا کرنے میں اپنی رفتار کو قائم رکھنے میں کامیابی کے نعرے لگا رہا ہو! وسوندھرا کو وِشوا کا ایک نیا رُوپ رنگ دیکھ کر جہاں حیرانی ہو رہی تھی وہیں اس کی باتیں بھی اس کو چونکا رہی تھیں! گویا اس کی کیفیت یوں تھی کہ کچھ کہا بھی نہ جائے اور چپ رہا بھی نہ جائے!

وسوندھرا پر ایسی کیفیت اس لیے طاری نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس بار وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر نہیں آیا تھا بلکہ ایک باوقار سوٹ اور ٹائی میں سجا ہوا تھا! اس لیے بھی نہیں کہ وہ اپنے ساتھ اسکاچ وہسکی لایا تھا اور معمول کی طرح ایک ہی سانس میں دیسی شراب کا گلاس حلق سے اُتارنے کی بجائے وہ شاہانہ انداز میں چسکیاں لیتے ہوئے اُن دنوں کا ذکر کیا کرتا تھا جن دنوں وہ جھیل ڈل میں مہینوں ہاؤس بوٹ میں رہ کر اپنی بیوی، جو اُس کی معشوقہ بھی تھی، کے ساتھ اپنی شامیں گزارا کرتا تھا! بیوی رومانی غزلیں گایا کرتی تھی اور وہ شیواز ریگل (ایک اعلیٰ قسم کی شراب) کی چسکیاں لے کر زندگی کے مزے لیا کرتا تھا! اس لیے بھی نہیں کہ وہ شوخ نگاہوں سے وسوندھرا کو جوانی کی اُن حسین یادوں کو بیان کرنے کو تروتازہ کر رہا تھا بلکہ وہ وسوندھرا سے بے شرم ہو کر وہ باتیں بھی کریدنا چاہتا تھا جو میاں بیوی نہ کسی کو بتاتے ہیں اور نہ کوئی اُن سے پوچھتا ہے!

وِشوا اور وسوندھرا کی داستانیں ملتی جلتی ہیں! دونوں کی عمریں چالیس کے آس پاس ہیں! حالانکہ دونوں کی اقتصادی حالت میں عرش اور فرش کے درمیان کا فاصلہ مگر دونوں میں اس لیے

جذباتی وابستگی ہے کہ کبھی دونوں اپنے آپ کو فقیر سمجھتے ہیں تو کبھی ایک خوشحال جوڑا سمجھ کر پچھلے چھ سات برسوں سے دو جسم ایک جان سمجھے ہوئے ہیں! وِشوا جنگلات کا ٹھیکیدار ہے جو جنگل کے ہر سر بفلک درختوں سے نکالے گئے ریزن کا مالک ہے! ہر درخت میں ایک چیر لگا کر اس کے نوکر درختوں سے خون کی بوندوں کی طرح نکلے رس یا گوند کو ڈبوں میں جمع کر کے بند کنستروں میں شہر بھیجتے ہیں! اس لیے گرمیوں میں وِشوا فقط سیر سپاٹے کے لیے جاتا رہتا ہے ورنہ اس کے باپ دادا نے اس کو ایسا خزانہ دیا ہے جس کو ہمیشہ بھرا ہوا رکھنے کے لیے سرسبز درخت سُوکھ جاتے ہیں!

وسوندھرا کا شوہر اس کا لانگری ہوا کرتا تھا مگر جب وہ ایک ریچھ کی مضبوط گرفت میں دم توڑ گیا تھا تب وِشوا اپنے مکان میں رہتا تھا لیکن کھانا وسوندھرا کے گھر سے آیا کرتا تھا! پھر جب وِشوا کی بیوی کو کینسر ہو گیا تو وہ علاج کے لیے امریکہ بھی گیا مگر اس کی ڈوب رہی نبض کو بچاتے بچاتے وِشوا خود بھی رنج و غم کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا! تب وِشوا کی بیٹی کی عمر سولہ سال تھی! اس نے اپنی بیٹی کی دیکھ بھال بلکہ اس کی ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی خاطر دوسری شادی نہیں کی بلکہ اس نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا اور یار دوستوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا! یعنی اُس نے اپنی زندگی کو ایک لکیر بنا دیا جو دو نقطوں کو جوڑ کر کھینچی گئی تھی! وہ کبھی گیروا کپڑے پہن کر سادھوؤں، سنتوں کی طرح باتیں کرتا! وہ جنگلوں میں اپنے کام کاج کا معائنہ کرنے کے بجائے سکون کے لمحات تلاش کرنے جایا کرتا تھا!

وِشوا اور وسوندھرا کا ملن ایک اتفاق تھا! اُس کی جیپ خراب ہو گئی تھی اور تقریباً چھ کلو میٹر پیدل چل کر جب وہ اپنے مکان کے قریب پہنچا تھا تب وسوندھرا نے اس کو اطلاع دی تھی کہ اس کے مکان کا چوکیدار، اپنی ماں کی موت کی خبر سنتے ہی دو دن پہلے اپنے گاؤں چلا گیا ہے!

ایک تو لمبا پہاڑی سفر پیدل طے کر کے وِشوا بہت تھک گیا تھا اور پھر شام کروٹ لے رہی تھی! اس لیے رات کو اکیلے جانا خطرناک ہو سکتا تھا، کیونکہ اندھیرے میں ریچھ کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا نہیں جا سکتا اور یوں موت کو دعوت دینے والی بات سمجھ کر وہ وسوندھرا کے کچے مکان میں رات گزارنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا! حالانکہ وہ بیوی کی موت کے بعد خود بھی موت کو گلے سے لگا لیتا اگر اس کی اپنی پیاری بیٹی کا خیال نہ آیا ہوتا! وسوندھرا نے وِشوا کی خوب عزت افزائی کی تھی اور اپنے اپنے رنج و غم کو ظاہر کرتے کرتے وہ رات بھر باتیں کرتے رہے تھے! وسوندھرا اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں اور وِشوا اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں ذکر کرتے رہے! دونوں اپنی والہانہ

محبتوں کا ذکر کرتے کرتے جذبات کی رو میں بہہ کر احساسات اور محسوسات کے ایک دوسرے سے ٹکرانے پر شروع میں چونک پڑے تھے لیکن دونوں پر اپنائیت کا اثر اس قدر حاوی ہوا کہ وِشوا کی تھکان دُور ہوگئی تھی اور وسوندھرا کی نیند اُڑ گئی تھی!

ساتھ والے کمرے میں اپنی ماں کا انتظار کر رہی وسوندھرا کی بیٹی آدھی رات تک ادھ کھلے دروازے سے جھانک جھانک کر دونوں کو کبھی روتے ہوئے اور کبھی ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دیکھ دیکھ کر اوب گئی اور سو گئی!

باتوں کا سلسلہ شاید آدھی رات کو ختم ہوا ہوتا اگر ماں نے بیٹی کو گہری نیند سوتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا! دراصل اس کو وِشوا نے ہی بیٹی کے تذبذب اور وسوسوں کی قیاس آرائی کر کے بیٹی کے کمرے میں جانے کے لیے کہا تھا اس بات کا حوالہ دے کر کہ وہ خود جب تک اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کو کوئی لطیفہ یا کوئی دلچسپ طلسماتی کہانی نہیں سناتا وہ سو نہیں پاتی! گویا وِشوا اور وسوندھرا کی حالت ایک جیسی تھی! دونوں کی بحث کا موضوع یا تو ان کے بچھڑ چکے شریکِ حیات تھے یا پھر ان کی بیٹیاں! وِشوا کی بیٹی کی بیماری کا ذکر یا پھر وسوندھرا کی بیٹی کی شادی کی فکر! دوسری شادی کر لینے کے لیے دونوں ہم خیال تھے! یعنی سوتیلی ماں بِن ماں کی بیٹی کا باپ بھی چھین لیتی ہے جبکہ سوتیلا باپ بھی بن باپ کے بیٹی کی ماں کو اپنی جائیداد سمجھ کر کبھی کبھی وحشیانہ سلوک کرتا ہے!

اپنی بیٹیوں کے بارے میں دونوں ایک جیسے خدشات ظاہر کرتے ہوئے نظر آتے تھے، دونوں کانپ اُٹھتے تھے اور باتوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کرتے تھے جہاں وہ لرز کر چھوڑ دیتے تھے! کب اور کیوں ایک کمزور لمحے کا شکار ہو کر وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے! پھر چمٹ گئے یہ شاید ان کو خود بھی معلوم نہ تھا! یہ نہ کوئی واقعہ تھا اور نہ کوئی حادثہ بلکہ یہ ایک صدمہ تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ جب ان کی بیٹیاں اس المیہ کے بارے میں جان جائیں گی تو کیا ہم نوحہ خوانی کریں گے یا وہ مرثیہ پڑھیں گی! دونوں کو اپنے گنہگار ہونے کا شدت سے احساس تھا! خاص طور پر وِشوا کو یہ خدشہ کرید رہا تھا کہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو ایک بزرگ سمجھنے لگا تھا اور اپنی ہم عمر عورتوں کو بھی بیٹی سمجھنے لگا تھا یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی زندگی کا رنگ ہی بدل دیا تھا بلکہ رُوپ بھی! وہ پانچ ستارہ ہوٹلوں کے ہیر ڈریسر (Hair Dresser) کی بجائے معمولی حجاموں سے بال کٹواتا تھا! اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ گزارا کرتا تھا! ایک باپ سے زیادہ ایک سیانی دادی کی

طرح! وسوندھرا کو بھی اس بات کا بہت دُکھ تھا کہ جس لاڈلی بیٹی کے لیے اس نے اپنی تمام خواہشیں ایک بیوہ کے آنچل میں چھپا کر رکھی تھیں وہ ہوا کے ایک جھونکے سے اُڑ کر اُس کی بیٹی کے سامنے گر چکا تھا! دونوں کو سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر آنکھ لگ گئی تھی اس لیے جب آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا! وِشوا اور وسوندھرا دن بھر ایک دوسرے سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ نہیں پائے تھے!

جیپ ٹھیک ہو جانے تک گاؤں میں رہنا ضروری تھا اس لیے وِشوا کو چند دن وسوندھرا کے گھر میں ہی رہنا پڑا تھا! شرم و حیا کے لیے انسانوں نے مختلف سانچے تیار کیے ہیں مگر زندگی گزارنے کے لیے قدرت نے کچھ ایسے قانون بنائے ہیں جو کہیں بھی لکھے نہیں گئے ہیں مگر انسان خود ہی ملزم، خود ہی وکیل اور خود ہی منصف بن کر فیصلہ کرتا ہے! ویسا ہی فیصلہ وِشوا اور وسوندھرا نے کیا تھا غالباً دونوں نے ایک دوسرے میں شریکِ حیات کی جھلک دیکھ لی تھی یا تصورات کی حسین دنیا میں ساتھ ساتھ چل کر محسوس کی تھی! اور دونوں اس خواب کو ٹوٹنے نہیں دینا چاہتے تھے! اس لیے شام نے جونہی کروٹ لی وسوندھرا اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر وِشوا کے کمرے میں آ بیٹھی اور اپنی بیٹی کو وِشوا کی زبانی اُس کے مرحوم باپ کے دلچسپ قصّے سناتی رہی!

کھانا کھا کر ماں بیٹی دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے تو وِشوا سمجھ بیٹھا کہ وسوندھرا کے دل میں اس کے لیے نفرت نہیں بلکہ عزّت ہے! مگر آدھی رات کو جب وسوندھرا وِشوا سے لپٹ گئی تب دونوں کو یہ احساس ہوا کہ دونوں ہم عمر ہم سفر بن کر ایک دشوار اور لمبا سفر طے کرنے کے لیے ایک دوسرے کو سہارا دیں تب تاریکی میں بھی چراغ جل اُٹھیں گے!!

پھر کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا! وِشوا مہینے میں ایک بار اپنے ملازموں کو تنخواہ دینے جایا کرتا تھا اور دو تین راتیں وسوندھرا کے گھر میں رہا کرتا تھا! گاؤں والوں کو دونوں کے اچھے کردار کے بارے میں معلومات تو تھیں پھر بھی جب کوئی وسوندھرا کو داشتہ کہہ دیتا تو گاؤں والے ایسی بے ہودہ باتوں کو نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے تھے! وِشوا اور وسوندھرا ہر بار چند پُر کیف لمحات کے لیے چالیس سال کی عمر میں بھی کامدیو اور رتی کا رومانی رقص تو کیا کرتے مگر وِشوا کی بیٹی کے علاج کے بارے میں یا پھر وسوندھرا کی بیٹی کی شادی کے بارے میں رات بھر باتیں ہوا کرتی تھیں! پھر اچانک گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ وِشوا اپنی بیٹی کے آپریشن کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے! وسوندھرا نے اس دوران اپنی بیٹی کے لیے ایک لڑکا تو دیکھ لیا تھا مگر لڑکے کی ضد تھی کہ وِشوا اپنے رسوخ سے یا

رشوت دے کر اس کو فاریسٹ گارڈ بنا دے! وسوندھرا وِشوا کی بیٹی کی صحت کے بارے میں فکر مند تو تھی مگر اس کو اپنی بیٹی کے بارے میں زیادہ پریشانی تھی! اس لیے نہیں کہ شادی کا خرچ اٹھانے کے لیے روپے نہیں تھے بلکہ جب سے اس کے شوہر کی موت ہوئی تھی تب سے وِشوا اپنے لانگری کی بیوہ کو اس کی تنخواہ دے رہا ہے بلکہ وِشوا نے اس کے لیے جہیز بھی خرید رکھا ہے!

اِدھر کئی دنوں سے برف باری ہو رہی تھی! وسوندھرا نے دن گن گن کر رکھ دیے تھے! پورے چار سو دس دن کے بعد جب اس نے وِشوا کو دیکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی! وِشوا کا بدلا رُوپ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کی بیٹی ٹھیک ہو گئی ہوگی! وہ معنی خیز نظروں سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اُن لمحات کا انتظار کرتی رہی کہ کب وہ اپنی بیٹی کے ٹھیک ہونے کی خبر سنائے تا کہ اپنی بیٹی کی شادی کی بات چھیڑ کر خوشیوں کو دوبالا کر سکے! مگر اس بار وِشوا اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا لگ رہا تھا بلکہ وہ باتیں بھی ویسی کر رہا تھا جو وسوندھرا کو جھٹکے دے رہی تھیں کیونکہ وہ جو ہر بات کو اپنی بیٹی سے جوڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اس بار اس کا ذکر تک نہیں کر رہا تھا!

آخر شام نے کروٹ بدلی اور جب وسوندھرا دیسی شراب لے کر آئی اور وِشوا اسکاچ وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ کہنے لگا کہ وہ اس بار ماضی کو بھول کر ان کو اپنے ساتھ لینے آیا ہے وسوندھرا سمجھ بیٹھی کہ بیٹی کے ٹھیک ہونے کے ساتھ وِشوا اب ایک نئی زندگی کی شروعات دوسری شادی سے کرنا چاہتا ہے! وسوندھرا نے نہایت رومانی انداز میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہی کہ وہ وسوندھرا کے ساتھ شادی کر رہا ہے کیا؟ لیکن وِشوا نے مسکرا کر کہا کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے!

وسوندھرا کو یہ سن کر یوں لگا جیسے برف کی چادر اُوڑھ کر سو رہی زمین پر بلڈوزر (Bulldozer) برف کے ساتھ اس کو بھی چھیل رہا ہے!

وسوندھرا نے جب وِشوا سے اس کی بیٹی کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو وِشوا ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے بولا کہ اس نے اپنی جان سے پیاری بیٹی کا امریکہ میں آپریشن کروالیا تھا! مگر اس کو بچا نہ سکا!

وسوندھرا کو یوں لگا گویا اس کے گناہ کی سزا اُس کی بیٹی کو مل گئی ہو!!

OO

وقفہ

راجدھانی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے ایک کمرے میں پانچ آدمی اپنے چہروں پر نقاب چڑھا کر، اپنے ہاتھوں میں گلاس لیے، ہوٹل میں دستیاب دنیا کی اعلیٰ ترین وہسکی نہ آنکھوں سے پی رہے ہیں اور نہ منہ سے لگا کر پی رہے ہیں! بلکہ سبھی ایک فون کال (Phone Call) کا انتظار کر رہے ہیں! ایک دوسرے کے چہروں پر نمایاں ہو رہے مصنوعی تاثرات کو دیکھ دیکھ کر غالباً ایک اَن کہی داستان پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے، یوں ظاہر کر رہے ہیں گویا ایک دوسرے کو ڈرا بھی رہے ہیں اور اپنائیت کا احساس بھی دلا رہے ہیں! اپنے چہروں پر اُبھرے تاثرات سے یہ بھی یقین دلا رہے ہیں کہ ہوٹل میں مکمل بکنگ (Booking) ہونے کی وجہ سے وہ ایک ہی کمرے میں موجود ہیں ورنہ کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی نہ تو کسی کا کوئی ارادہ ہے اور نہ کوئی منصوبہ ہے!

اچانک ایک جانے پہچانے چہرے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سبھی کی کیفیت یوں نمایاں طور پر اُجاگر ہوئی ہے گویا پانچوں اشخاص کو امتحان ہال میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو! یہ شخص نہایت تھکا تھکا سا لگ رہا ہے اور ایک صوفے پر بیٹھتے ہی گویا ایک چھوٹے سے چشمے کے پانی میں گر کر یوں بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا گویا سمندر کی عمیق گہرائی میں ڈوبتے ڈوبتے اپنی جان بچا کر بڑبڑا رہا ہے—!

خدشات کے بوجھ سے دِبے جسم کو
راحت دینے کی خاطر
ایک وقفے کے لیے سلا دیتا
اگر میرا اپنا گھر ہوتا!

اور پھر نہ چاہتے ہی وہ سو گیا ہے! پانچوں آدمی اطمینان کی سانسیں لے کر بھی، میز پر رکھے وہسکی سے بھرے گلاسوں میں برف ڈال کر بھی اپنے تشنہ لبوں کو ٹھنڈک کا احساس نہیں دلا پا رہے ہیں!

اچانک فون کی گھنٹی نے صوفے پر گہری نیند سو رہے صحافی کو جگا دیا! چونکہ فون اس کے قریب ہے اس لیے اُس نے نہایت ذمہ داری سے فون کا ریسیور اٹھا کر نہایت ترش لہجے میں ایک سانس میں یہ کہہ کر فون کاٹ دیا ہے کہ یہاں کِرن کیسے ہو سکتی ہے؟ فون رکھ کر اس نے اپنے موبائل فون پر کسی سے کہا ہے کہ وہ ہوٹل کے فون پر تازہ ترین اطلاعات دینے کی بجائے ہر خبر کو ایک پردے کی جنبش سمجھ کر، اس کے ذاتی موبائل نمبر پر دے، تا کہ خبر اُن کی ہی چینل پر نشر ہو کر تہلکہ مچا دے اور چینل کی مقبولیت میں اضافہ کر پائے! مگر فون بند کرنے کے بعد صحافی کمرے میں موجود پانچوں آدمیوں کی مشکوک نگاہوں سے خوفزدہ ہو کر کمرے سے نکل گیا!

اُس کے جانے کے بعد کمرے میں موجود ایک بزرگ، دل شکستہ ہو کر، بول پڑا ہے—

فون کو کاٹ کر اجنبی نے اپنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے!

دوسرے نوجوان نے غصّے سے ٹوک کر کہا، بے ہودگی کہا جائے تو بہتر— کیونکہ فون رام لیلا میدان میں ہو رہی ہڑتال کے بارے میں، میری دوست نے میری بیوی کِرن کے نام دی ہو گی— میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں!

تیسرے درمیانی عمر کے سفید بالوں والے نے بطور جواز پوچھا! میں ایک وکیل ہوں! مقدمے جیتنے کی عادت برسوں سے پال رہا ہوں ہوگا! پالتو کتّوں کے بھونکنے کی آواز پہچان لینے کا عادی ہوں! اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کیا آپ کی وفادار ہے یا معاون؟

چوتھے آدمی نے گرج کر کہا— حسّاس معاملات میں قانونی نقطوں کو گھسیٹ کر، جلوسوں، جلسوں یا عوامی تقریبات میں لانا عقلمندی نہیں ہے!

پانچواں آدمی قہقہے لگا کر بزم میں ایک ایسی بات کہہ گیا ہے جس کو سن کر سبھی نے ایک ہی گھونٹ میں اپنے سامنے رکھے وہسکی کے گلاس سے اپنا حلق تر کرنے والے کے دوسرے گلاس میں، چھلک رہے جام سے جام ٹکرا کر اس کی اچانک خوشی کا راز کرید کر جاننا چاہا تو اس نے اپنی تجربہ کاری کا مظاہرہ کر کے اپنے موبائل پر آ چکی ایک ایس. ایم. ایس اطلاع پڑھ کر سنانے سے پہلے اپنے مخصوص مسخرانہ انداز میں، اپنے اِرد گرد بیٹھے چاروں اشخاص کو اطلاع دی کہ بھوک ہڑتال کرنے والے نے نہ اپنے جوشیلے بھاشن میں بیرونی ممالک کے بینکوں میں کروڑوں روپے جمع کرنے والوں کے نام بتا دیئے اور نہ رقوم کی تفصیل بتا دی ہے! اس لیے رات گئی بات گئی!

''وہ کیسے؟'' چاروں نے ایک ساتھ پوچھا تو مسخرے نے ایک منجھے ہوئے سیاست داں

کی طرح سنجیدگی سے کہا—

''وہ ایسے کہ ایک وقفہ جو مل گیا—!''

وقفے کے بعد کہانی بدل جاتی ہے!

ایک لمبے ٹیلی ویژن سیریل کی طرح! جس میں کردار بدل جاتے ہیں! ایک وقفے کے بعد! جس میں موضوعات بدل جاتے ہیں! ایک وقفے کے بعد! بلکہ ایک وقفے کے بعد سیریل ہی بدل جاتا ہے! آخری وقفے کے بعد! سنجیدگی پر کامیڈی حاوی ہو جاتی ہے! ایک وقفے کے بعد! غمگین واقعات کروٹ بدل کر سنگین نہیں رہتے ہیں بلکہ رنگین نظر آتے ہیں! ایک وقفے کے بعد!!

اور ہم سب مل کر اب ایک نیا سیریل بنائیں گے! بشرطیکہ ہم سب ایک ہو کر سعی کر لیں!

آخر ہم سب ایک ہیں! ہیں نا؟ لو سیریل کا نام بھی طے ہو گیا— ہم ایک ہیں!

صحافی اپنے موبائل پر بات کر چکا ہے اور کمرے کے اندر پانچوں افراد کی خوشی دیکھ کر وہ حیران تھا کہ ایک وقفے کے بعد کیا سے کیا ہو گیا ہو گا جو کہانی میں بدل گئی!

اس لیے وہ وقفے کی وجہ سے بے حد پریشان ہے!

OO

کھیل

کارتِک میرا پوتا ہے، ہمیشہ ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ کر کارٹون چینل دیکھتا رہتا ہے، میں جب بھی روکنے کی کوشش کرتا ہوں تب وہ کوئی رٹا ہوا جملہ سنا کر اتنا ہنساتا ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ ساٹھ سال کا بچہ اور میں پانچ سال کا بوڑھا ہوں! وہ باتیں ہی ایسی کرتا ہے! اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ کبھی کبھی اپنی توتلی زبان میں گہری باتیں کر جاتا ہے اور اکثر خود کو چالاک چوہا اور مجھے بے وقوف بلّی سمجھ کر تنگ بھی کرتا ہے، ڈراتا بھی ہے اور کبھی کبھی اپنی معصوم باتوں سے چونکا بھی دیتا ہے! آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب اُس نے مجھ سے کہا کہ جو کھیل میں اپنے دوست کے کہنے پر کھیلنے والا تھا وہ ''کھتل ناکھ'' (خطرناک) ہوگا! اور اگر میں اس کے لیے ایک 'ماسک' (Mask) لے آؤں تو وہ مجھے بچا سکے گا! ایک چہرے پر طرح طرح کے مکھوٹے پہن کر کوئی کبھی راجا، کبھی رنک، کبھی دیوتا، کبھی راکھشس، کبھی رستم، کبھی سہراب، کبھی ستیہ وادی ہریش چندر، کبھی فریبی وغیرہ وغیرہ بن جاتا تو ہے مگر اصلی چہرہ تو وہی رہتا ہے! چاہے وہ طاقتور کا چہرہ ہو یا کمزور کا، امیر کا ہو یا غریب کا ہو! شہید کا ہو یا غدّار کا ہو، دوست کا ہو یا دشمن کا ہو!

میں نے ایک ایسے چہرے بدلنے والے کو پچاس سال پہلے دیکھا تھا تب میں دس سال کا تھا اور خوف زدہ ہو گیا تھا! اور پھر جوانی سے بوڑھاپے کے سفر میں اپنے ہم سفر دوست کے بدلتے ہوئے چہرے دیکھ کر اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں! تب کی بات بہت پرانی ہے! مگر اتنی پرانی بھی نہیں کہ اپنی ہی کہی بات کی تصدیق کے لیے تواریخ کے مطالعے اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدے کی ضرورت پڑ جائے! یقین کیجیے کہ خدا کو حاضر ناظر رکھ کر جو بھی کہوں گا سچ کہوں گا! کیونکہ یہ سنی سنائی کہانی تو ہے نہیں! بلکہ میری اپنی کہانی جو ہے!

پچاس سال پرانی کہانی مجھے یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو! میں اسکول سے لوٹ رہا تھا جب میرے سامنے ہنومان جی ظاہر ہوگئے! میری سانسیں رُک گئیں مگر اگلے لمحے ہی میرے

دل کی بہت تیز دھڑکنوں نے میری رُکی ہوئی سانسوں کو اتنا تیز دوڑایا کہ ہنومان جی بھی میری کیفیت بھانپ کر ایک اور لڑکے کی ٹوپی اُٹھا کر لے گئے! لوگ ہنومان جی کو دیکھ کر ہنس رہے تھے!

ہنومان جی بالکل ویسے ہی نظر آرہے تھے جیسے مندروں میں رکھی ان کی مورتیاں! بلکہ ہمارے گھر میں دیواروں پر آویزاں رنگ دار تصویروں جیسے! میں واحد تماشائی تھا جو سہما سہما، ڈرا ڈرا سا نظر آرہا تھا! باقی ناظرین ہنومان جی کی اداؤں پر نثار ہو کر سڑک پر اُترے ہوئے بھگوان کو اپنی عقیدت، احترام و اپنی قدر دانی کا احساس دلا کر ان کے پیچھے چند قدم چلتے رہتے تھے! پھر ہنومان جی ایک گروپ کو اُچھل اُچھل کر وداع کرتے ہوئے آگے نکل جایا کرتے تھے!

ہنومان جی صرف ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے دکانداروں کے سامنے ہی نہیں رُک جایا کرتے تھے بلکہ بازار میں ہر چھوٹی بڑی دُکان کے سامنے کھڑے ہو کر اُچھل اُچھل کر کبھی اپنے غصّے کا اظہار کرتے رہتے تھے اور کبھی ایک فاتح کی طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہتے تھے جبکہ تماشائی اپنے غم یا خوشی کے احساسات کو بھول کر ہنومان کے کرتب دیکھ کر خوشی کی لہروں کی طرح جھومتے ہوئے نظر آتے تھے!

ہنومان جی کے پھٹے جوتے دیکھ کر میرا بھی ایک قہقہہ لگانے کو جی چاہتا تھا مگر ڈر نے میرے دماغ کو اس قدر گھیر لیا تھا کہ میں اپنے گھر جانے والی گلی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا پھر جب ہنومان جی بھی اسی گلی میں داخل ہوا تو میں یقیناً بے ہوش ہوا ہوتا اگر میں اپنے ابا کو سامنے پایا ہوتا!

میرے چہرے کے اُترے ہوئے رنگ کو دیکھ کر وہ میری کیفیت بھانپ گئے تھے اس لیے وہ مجھ سے کچھ کہنے کی بجائے مجھے دریا کے کنارے واقع اس مندر میں لے گئے تھے جہاں ہنومان جی اپنی لمبی پونچھ اُتار کر ایک پرانے ٹرنک میں رکھ کر اپنے چہرے سے ایک مکھوٹا اُتار رہے تھے!

''ارے واہ! یہ تو ایک آدمی ہے!'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ جونہی نکلا گویا ایک خوف کے پھیل رہے غبارے کی پھونک نکل گئی!

ابا نے اُس سے پوچھا! کل کون سا رُوپ دکھا رہے ہو؟ تو وہ جواباً بولا! نرسنگھ اوتار یا راون! میں قریب جا کر جب اس کے ٹرنک میں جھانک کر دیکھتا رہا تب اس نے خود ہی مجھے چند مکھوٹے، نقاب اور راجوں، مہاراجوں، سلطانوں اور طلسمی کرداروں کی پوشاکیں دکھا کر یہ سمجھایا کہ وہ ایک بہروپیا ہے! شہر شہر، گاؤں گاؤں جا کر وہ کسی اچھے یا بُرے کردار کا مکھوٹا و پوشاک پہن کر روز کسی علاقے میں اپنا یہ کھیل دکھا کر آخری دن ایک کشکول ہاتھ میں لے کر دکانداروں اور

لوگوں سے دان لیتا ہے جو وہ خوشی خوشی اس کو دے کر وداع کرتے رہتے ہیں!

ہمارے زمانے میں عام لڑکوں کی ذہنی عمر اصلی عمر سے بہت کم ہوا کرتی تھی اس لیے میں اُس وقت یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ''بہروپ'' بھی ایک تفریح کا ذریعہ ہوا کرتا تھا اور یہ بھی فنونِ لطیفہ کا ایک رنگ ہے! جس کو تماشائی عقیدت کی نگاہوں سے کم اور تفریح و ثقافتی زاویوں سے زیادہ دیکھا کرتے تھے! یعنی 'بہروپ' بھی اظہار کا ایک ذریعہ ہے جس کو لوک فن کا ایک فارم (Form) کہا جاسکتا ہے! لیکن دوسرے مقامی اظہارِ فنون کی طرح یہ آرٹ بھی ایک کھنڈر بن چکا ہے! نہ وہ بہروپی ہیں، نہ وہ شہر یا گاؤں ہیں اور نہ وہ بازار ہیں جہاں بہروپی کبھی ہنومان اور کبھی راون کا مکھوٹا پہن کر آتا جاتا تھا!

تب فلمیں دیکھنا ایک عیب سمجھا جاتا تھا اس لیے لوگ کتھائیں پڑھ لیا کرتے تھے یا مندروں میں کھیلی جانے والی رام لیلائیں اور کرشن لیلائیں دیکھ کر تفریح کا سامان تلاش کیا کرتے تھے! جبکہ آج کل فلمیں، ٹی وی، سیٹلائٹ چینلیں جب پراچین کتھائیں اور جدید کہانیاں دکھا رہے ہیں تب بے چارے غریب بہروپی کا کھیل کوئی کیوں دیکھے گا؟ میرے ایک بہت ہی امیر دوست کے اندر دبے ہوئے فنکار کو جب میں نے ایک بدحال بہروپی کی داستانِ غم سنائی تو وہ اپنی امیری کے منوں بوجھ کو ہٹا کر فنکار کو باہر لے آیا اور بہروپی کو اپنے کپڑے پہنا کر خود اس کا لباس پہن کر کشکول ہاتھ میں لے کر شہر شہر، گاؤں گاؤں کو بہ کو گھومتا رہا! ناظرین کو یہ مناظر اس قدر پسند آئے کہ الیکشن میں اس کا کشکول نوٹوں کی بجائے ووٹوں سے بھر دیا!

میں نے سوچا کہ لوگ میرے دوست کو ایک ایسے فنکار کی حیثیت میں قبول کر چکے ہیں اور میں منصوبے بناتا رہا کہ کیسے کلاسک آرٹ کو ایک فنکار منسٹر کی مدد سے ازسرِ نو نکھار کر پیش کیا جائے! جبکہ فنکار ایک بہروپی کی طرح کبھی رام کبھی شیام بن کر اپنے ووٹروں کا دل و دماغ جیتنے میں کامیاب ہوتا رہا!

میں سمجھ بیٹھا تھا کہ گزرا زمانہ لوٹ کر آیا ہے! اس لیے ویسے ہی جیسے میرے ابا نے بہروپی سے مندر میں پوچھا تھا کہ کل کون سا رُوپ اُجاگر کرنے کا ارادہ ہے، میں نے بھی ایک فنکار کے اندر چھپے ایک منسٹر سے پوچھا! اب کون سا رُوپ لے کر لوگوں کے سامنے آؤ گے؟ میرا یہ دوست بھی میری طرح ساٹھ سال کی عمر کا نشانہ پار کر چکا ہے اس لیے وہ اب گلی کوچوں میں نہیں جاسکتا ہے جبھی تو وہ کچھ ایسا سوچ رہا ہے کہ لوگ ہی اس کے دروازے پر دستک دے کر ایک کرشماتی لیڈر

سے مدد مانگ لیں اور وہ ان کی مدد کر کے ان کا من جیت لے!

اچانک سیلابی پانی نے جہاں گاؤں، کھیت اور لوگوں کو اُجاڑ دیا وہاں سانپوں کے بل بھی اکھاڑ کر ان کو پہاڑوں اور جنگلوں سے نکال کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا!

ہاہا کار مچ گیا تو لوگوں نے بچوں کے لیے دودھ، اپنے لیے روٹی، کپڑا اور مکان مانگنے کی بجائے سانپوں کو مار بھگانے کی التجا کی اور پھر جب میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ الیکشن سر پر ہیں، اب کیا کرو گے! تب وہ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر طنزاً بول پڑا! سرکاری نیولے ڈیوٹی پر لگا دیے جائیں گے! پھر میری سنجیدگی کو دیکھ کر اور مجھے اپنا ہم راز بنا کر بول پڑا!

میرا مشورہ تو یہ ہوگا کہ جس گھر میں سانپ گھس جائے ان کے فرش پر پاؤں نہیں رکھنے چاہئیں اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اپنی کھٹیا اوپر کرنے سے پہلے ایک لوک سیوک شیو بھگت سے فوراً ملیں یا پھر میرے ایک دوست سے جن کو آپ اپنے گھر کا جغرافیہ سمجھا دیں تو وہ آپ کے دُکھ درد مٹا کر آپ کو ایک نیا جنم دے گا! کسی کو کسی قسم کی دکھشنا یا پھر دان ڈونیشن (Donation) دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں جو ہوں ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے! دونوں ناگوں کو اپنے بس میں کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں! اس نے جب دونوں کے پتے ہاہا کار کرنے والے مصیبت زدوں کو لکھا کر دیے تو ان میں ایک پتہ میرا تھا!

میں نے جب اُس سے پوچھا کہ میرا نام بطور شیو بھگت کیوں دیا تو اس نے سرگوشیانہ لہجے میں یہ احساس دلایا کہ جب بھگوان نے تمھیں یہ شکتی دی ہے تو کیوں اپنی روحانی طاقت کو چھپا رہے ہو

میں اس کی اشاروں سے دی گئیں ہدایات پر عمل کر کے جب اپنے گھر پہنچا تو وہ تھوڑی دیر بعد رختِ فقیری میں میرے دروازے پر دستک دینے آیا! میرے پیچھے میرا چار برس کا پوتا بھی آ کر ہماری باتیں سنتا رہا! وہ مجھے پہلے یہ بتا گیا کہ میں نے ایک فارم ہاؤس کرائے پر لے رکھا ہے! کاروالے تمھارے پاس نہیں آئیں گے بلکہ میرے پاس آئیں گے! اس لیے جا رہا ہوں! میرے تذبذب کی کیفیت بھانپ کر وہ بول پڑا!

جیسے بدلتے موسم کو دیکھ کر اپنا لباس بدلنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح بدلتے حالات دیکھ کر ہم لوگوں کو رُوپ بدلنا پڑتا ہے! میرے طاقتور سیاسی مخالف مچھروں سے بچاؤ کے لیے تمام ملک میں مچھر مار دوائیاں بانٹ چکا ہے! مچھر بھاگ جائیں گے تو ہم یہ کیسے ثابت کریں گے کہ مچھروں کی پیدائش اُس کی فیکٹری میں ہوتی ہے!

اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں گے تو الیکشن ہار جائیں گے! ہار گئے تو اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیسے کر پائیں گے؟ ورنہ تمھارے بیٹے کی پرموشن اور تمھارے پوتے کا کسی اچھے اسکول میں داخلہ کیسے ہو سکے گا؟

''میری مدد بیٹ مین (Bat Man) کرادے گا! وہ سب کی مدد کرتا ہے'' کارتک بول پڑا!

''ارے واہ یہ لڑکا تو پیدائشی ایکٹر ہے! کہو تو! نہیں نہیں ابھی نہیں علم بڑی دولت ہے!''

میں خاموش تھا اس لیے کہ میرا پوتا میرے دوست کی باتیں اُسی دلچسپی سے سن رہا تھا جیسی دلچسپی سے وہ کارٹون دیکھتا رہتا ہے! میرے تذبذب کو دیکھ کر میرے دوست نے میرے ارادے کو مضبوط کرنے کی خاطر یہ بتادیا کہ علاقے میں جو سانپ اُس کے آدمیوں نے ڈال دیے ہیں ان میں بیشتر سانپ ربڑ کے ہیں اور جو اصلی ہیں وہ سب بے اثر ہیں! نہ ان کے کاٹنے والے دانت ہیں اور نہ منہ میں زہر!

یہ سن کر کارتک بول پڑا: ''دادا! اگر زہر والا سانپ ہوگا تو وہ جادوگر بھیس بدل کر آیا ہوگا! پھر کھیل کا مزہ آئے گا! آپ مدد کے لیے ماسک مین (Mask Man) کو آواز دو گے! کھیل کتھل ناکھ (خطرناک) ہو جائے گا! پھر سانپ آپ کو نگل جائے گا! مگر میں ماسک پہن کر سانپ کے پیٹ سے نکال دوں گا! لیکن آپ کو میرے لیے ایک ماسک لانا پڑے گا! لے آؤ نا دادا؟''

میں کارتِک کو دیکھتا رہا اور میرا دوست یوں بولتا رہا گویا وہ مجھے ویسے ہی اُپدیش دے رہا تھا جیسے بھگوان کرشن کروکھشیتر کے میدانِ جنگ میں ارجن کو ہتھیار اُٹھانے کی ضرورت سمجھا رہا تھا! دراصل میرا دوست میرے خدشات کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار یہ بتا رہا تھا کہ اصلی سانپ بھی اگر ہاتھ میں آئے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ ایک آزمودہ کھیل کھیلنے جا رہے تھے!

میرا دوست میرے دل سے ڈر نکال کر اپنے کھیل کی تاثیرِ مسیحائی کے بارے میں جب بتا رہا تھا تب میری نگاہیں اپنے پوتے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں حیران تھا کہ جس پانچ سال کے بچے کا دادا دس سال کی عمر میں ایک منورنجن کرنے والے بہروپی کو دیکھ کر لرز اُٹھا تھا وہ ایک خطرناک کھیل کے بارے میں ہماری گفتگو یوں سن رہا تھا گویا وہ پہلے بھی ایسی کہانیاں سن چکا ہے!

میرے دوست کے جانے کے بعد کارتِک اپنی توتلی زبان میں مجھے یہ بتاتا رہا کہ اگر بُرا آدمی ایک مگرمچھ بن کر مقابلے کے لیے آ گیا تو ماسک مین ہی آپ کو بچا سکتا ہے! اس لیے وہ مجھے

نقاب (Mask) پہن کر جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے لیے بھی ایک ماسک مانگ رہا ہے تا کہ وہ مگر مچھ کو اپنے منہ میں ڈال کر ایک چاکلیٹ کی طرح کھا سکے! پھر کارتِک مجھے گئی رات تک ایک کے بعد ایک اور سی! ڈی (C.D) چلانے کے لیے مجبور کرتا رہا تا کہ میں Mask یعنی کرشماتی نقاب کے کرامات دیکھ کر اس کے لیے ایک ماسک لے آؤں!

میں سوچ رہا ہوں کہ اُس پھٹے جوتے اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے بہروپی کے بیٹے اور پوتے اب کیا کر رہے ہوں گے؟ کہیں وہ بھی کوئی خطرناک کھیل تو نہیں کھیل رہے ہوں گے؟

میری سادگی تو دیکھیے میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں! اپنے تصوّر سے ڈر رہا ہوں!

اپنے پوتے کی سوچ سمجھ سے ڈر رہا ہوں!!

اُجالوں کو دبوچنے والی تاریکیوں میں جنم لینے والے شیطانی کھیلوں سے ڈرتا ہوں!!

مگر کیا کروں ایک نڈر کھلاڑی ایک ڈرپوک کو بھی اپنے کھیل میں شامل کر چکا ہے!!

کارتک سو رہا ہے اور علی الصبح کوئی میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے!

گویا میرے دوست کا نیا کھیل شروع ہو چکا ہے!!

OO

ایک اور ایجاد

میں کہاں تھا یہ مجھے یاد ہے!

ہمالیہ پربت کی ایک اونچی چوٹی پر بے آواز سرد ہواؤں نے میری انگلیوں میں لرزش پیدا کر کے مجھ سے میرے اعتقاد کی لاٹھی چھین لی تھی اور میں تذبذب اور تجسس کا شکار ہو کر اُس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب میرا ہم سفر اپنی پُر اسرار وڈراؤنی خاموشی توڑ کر مجھے یہ بتا دے گا کہ اس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک کیوں نظر آ رہی ہے جبکہ میری نظر دُھندلانے لگی تھی!

ہم دونوں ایک دُشوار پہاڑی پر سفر طے کر رہے تھے! میں اعتقاد کے بھروسے پر چل رہا تھا حالانکہ قدم قدم پر میری پھولتی ہوئی سانسیں میرے پھیپھڑوں کو کُرید کر میری چھاتی کو دو پھاڑ کر دینے کی صدائیں سنا رہی تھیں مگر میں پھر بھی اُس سر بفلک برفیلی چوٹی کی طرف جا رہا تھا جہاں مجھے بھگوان شنکر کے درشن کرنے کی اُمید تھی! میں اُس سے اپنی بیٹی آشا، جو میری زندگی ہے، بلکہ اس صدی کی اُمید بھی ہے، کے لیے اَمر ہو جانے کے واسطے آبِ حیات حاصل کرنے نہیں جا رہا تھا بلکہ حیات کے لیے آب کی چند بوندیں مانگنے جا رہا تھا تا کہ آشا کے سوکھے ہونٹوں کو تر کر سکتا!

میری آشا ایک ایسے اُجڑے دیار میں آخری سانسیں لے رہی ہے جہاں کا قطرہ قطرہ آب یزیدوں نے پی لیا ہے یا پھر کوئی راکھشس یہاں کی سب سے بڑی اور گہری جھیل کا پانی چوس گیا ہے! اس جھیل کے صاف وشفّاف پانی میں شیش ناگ پر براجمان بھگوان وِشنو کی نابھی سے ایک خوبصورت کمل کا پھول نکلتا تھا اور وہ دنیا بنانے والے بھگوان برہما کا آسَن ہوا کرتا تھا! ہم جہاں رُک گئے تھے وہاں سے جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو یوں لگا تھا جیسے میں اور میرا ہم سفر آسمان سے زمین کو دیکھ رہے تھے! مگر اتنی بلندی پر آ کر بھی مجھے وہ چوٹی جس پر بھگوان شنکر مجھے درشن دے سکتے تھے، چاند سے بھی دُور نظر آ رہی تھی! میرے ہم سفر نے جب خاموشی توڑ کر مجھے شِو شنکر کے درشن کیے بغیر اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے چند منجمد آب کے ٹکڑے دکھا دیے تھے تو میں نے سوچا

تھا کہ یہ موتی جیسے ٹکڑے اگر میں اپنے ہم سفر سے چھین کر لے جاؤں اور بھگوان سے ایک بادلوں کا اُڑن کھٹولہ مانگ کر اپنی بیٹی آشا کے پاس چلا جاؤں تو اس کے ہونٹوں پر آب رکھ دوں تو مٹی مٹی کے ساتھ، ہَوا ہَوا کے ساتھ، آگ آگ کے ساتھ اور آب آب کے ساتھ مل کر پھر زندگی کو ہرا بھرا کر دے گی! مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا پھر ویسی ہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی! وہ خاموشی جو کسی آنے والے طوفان کی اطلاع نہیں دے رہی تھی بلکہ کسی بھیانک طوفان کے گزرنے کے بعد جیسی چھائی خاموشی بھی نہیں تھی! قہرِ آدم کے بعد ہیروشما اور ناگاساکی میں چھائی خاموشی جیسی بھی نہیں تھی! سومالیہ میں قحط کے بعد چھائی خاموشی جیسی بھی نہیں تھی! وہ خاموشی مجھے جہاں بہرے پن کا احساس دلا رہی تھی وہیں اپنے اِرد گرد ہو رہی سنسنی خیز کارکردگی اپنی بھر آئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں اور اپنی آشا سے کتنا دُور آ چکا ہوں!!

نظر دُھندلا تو گئی ہے مگر میرا ہم سفر بھی یہاں موجود ہے! یہ دیکھ رہا ہوں! میری طرح آکسیجن ماسک (Mask) لگا کر وہ کیا کر رہا ہے میں جان نہیں پاتا ہوں!

یہ کون سی جگہ ہے، کوئی تو بتا دو دنیا والو؟؟ — ؟؟

کیا یہ جگہ کسی اسپتال کا آئی سی یو (I.C.U) ہے یا کسی تجرباتی لیبارٹری کا حصّہ ہے؟

میں زمین پر ہوں، پاتال میں ہوں یا خلا میں ہوں؟ کچھ تو بتا دو ہم نسلو؟ کم از کم یہ تو بتا دو میرے ہم عصرو! کہ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے جبراً کر لایا گیا ہے! اِغوا کر لایا گیا ہے! یا میں بھی کسی خاقان کی فتوحات کا حصہ ہوں؟ میرے ہم سفر! تم جب بھی خاموشی توڑ دیا کرتے تھے کچھ نہ کچھ بتا کر مجھے نہ صرف چونکا دیا کرتے تھے بلکہ اپنے اعتماد اور عقل سے حاصل کیے گئے چمتکاروں اور ایجادوں کے بارے میں کبھی ہنسایا کرتے تھے کبھی ڈرایا کرتے تھے اور کبھی رُلایا کرتے تھے! اس بار خاموشی توڑ کر بس اتنا بتا دو کہ جب پہاڑوں پر بادل نہ تھے، نہ آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے! نہ دور سے کوئی بارش یا برف کا طوفان آیا تھا! نہ اونچی چوٹیوں سے برف کے تودے کھسک کر ہمارے اِرد گرد گرے تھے اور نہ سرد ہواؤں میں نمی تھی! پھر وہ پانی کی بوندیں کہاں سے آئی تھیں جن کو منجمد ہوتے ہی تم سمیٹ لیا کرتے تھے؟ کیا وہ میرے پربھو کا ایک معجزہ تھا یا پھر کسی ساحر کا سحر؟ کہیں وہ تمھاری ایجاد کا ثبوت تو نہیں تھا؟

کاش کوئی میرے کسی ایک سوال کا جواب دے پاتا!؟

کوئی جواب دے بھی تو شاید میں بہرہ ہو گیا ہوں!!

نہیں نہیں، میرے اعتقاد کے مطابق انسان مر کر بھی تب تک سب سُن لیتا ہے جب تک جسم مٹی کے ساتھ نہیں مل جاتا ہے! تبھی تو چتا کو آگ دکھانے سے پہلے مُردے کے کانوں کے پاس ایک مٹکا توڑ کر آتما کو جسم سے آزاد کیا جاتا ہے!

مگر میں تو زندہ ہوں جبھی تو رو رہا ہوں!

کہیں میں گونگا تو نہیں ہو گیا ہوں! دھرتی ماں کی طرح! جو بارود سے چھلنی ہو کر بھی کچھ بولتی نہیں ہے! پیاسی ہو کر بھی آسمان پر بیٹھے خُدا اور اس کے اَن گنت دیوی دیوتاؤں سے پانی نہیں مانگ سکتی! گونگی ہے نا؟ جبھی تو؟

لیکن جب میں بول سکتا تھا یعنی میرا ہم سفر میری باتیں سن لیا کرتا تھا تب میں نے دنیا بنانے والے سے اپنی آشا کے لیے نہ نئی زمین مانگی تھی نہ نیا آسمان مانگا تھا! میں نے اُس سے اپنی زندگی کے لیے دو بوند پانی مانگا تو تھا! مگر اس نے اپنی ہی کائنات پر ستم کرنے والے شیطان کو میرے دیار کی ایک متبرک جھیل کو برباد کرنے سے روک دیا ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی!!

میں نے ایک مقصد کی خاطر اپنے دوسرے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنا سفر جھیل کی خشک تہہ پر چل کر شروع کیا تھا اور جھیل کی بدصورت خشک تہہ پر چلتے چلتے مجھے ایک بدیشی اجنبی مل گیا تھا!

میں نے اس کو جب یہ بتایا تھا کہ کبھی ہم سردیوں میں گہری جھیل کی جمی ہوئی تہہ پر کھیلا کرتے تھے تب وہ حیران ہونے کی بجائے مسکرا کر بول پڑا تھا! 'لوگ سمجھتے ہیں کہ پانی پر رِشی منی ہی چل سکتے ہیں! بلکہ یہ بھی نہیں مانتے ہیں کہ پانی کو تلوار سے کاٹا جا سکتا ہے اور پانی بھی جم کر تیز تلوار کی طرح خون بھی بہا سکتا ہے'! اس کی دلچسپ باتیں سنتے سنتے ہم نے ہم سفر بن کر جھیل سے ہی اپنا سفر شروع کیا تھا! میں جھیل میں وہ جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں کمل کے پھول ہوا کرتے تھے! یہ سوچ کر کہ زمین کھود کر وہ متبرک کمل کا پھول نکال سکوں جس پر تین سروں والے بھگوان برہما بیٹھے ہوں گے! مجھے یقین تھا کہ وہ مل گئے تو مجھے خوشحالی کے بھگوان وِشنو بھی مِل جائیں گے! وہ مل گئے تو بات ہی اور ہو گی!! ان کے حکم سے بارش ہو گی! برف باری ہو گی! اولے پڑیں گے اور جھیل پھر بھر جائے گی! حیات کو آب ملے گا اور میری بیٹی آشا کے سوکھے ہونٹ تر و تازہ ہوتے ہی وہ جھومتی گاتی میرے سینے سے لگ جائے گی! وہ میرے دل کی دھڑکن بن جائے گی اور میں ٹِک ٹِک کر کے زندگی کے لمحات کو آگے لیتا جاؤں گا! موسم بدلتے رہیں گے، رنگ اور بو بدلتے رہیں گے اور ویسا ہی ہوتا رہے گا جیسا لاکھوں صدیوں سے ہوتا رہا ہے یعنی آشا زندگی ہو گی اور میں وقت ہوں گا!

میں آشا سے بہت پیار کرتا ہوں! جنم جنم سے! اس لیے نہیں کہ وہ میری بیٹی ہے بلکہ وہ کبھی میری پڑدادی، پڑنانی، دادی، نانی ماں، موسی، پھوپھی، بہن اور بیٹی کے رُوپ میں جنم لیتی ہے! پھر مر جاتی ہے اور ہمارے عقیدے کے مطابق پھر جنم لیتی رہتی ہے! سوچ کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر ایک ہی بات سمجھ نہیں پاتا تھا! وہ یہ کہ کیا وقت تھم جائے گا اور زندگی فنا ہو جائے گی؟-؟؟

دراصل میں اپنے اور اپنی آشا کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا نا؟ میری کیفیت بھانپ کر میرا ہم سفر مجھے بار بار اپنائیت کا احساس دلا کر سمجھایا کرتا تھا اور وہ بھی مجھے ہم نسل، ہم عصر، ہم نفس، ہم نوا کے القاب سے نواز کر نہایت حلیمی سے کہتا رہتا تھا کہ اگر میں جوں توں اس چوٹی پر پہنچ پاؤں جہاں بھگوان شنکر براجمان ہیں اور یہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ پاؤں کہ انھوں نے اپنے بالوں سے نکل رہی پانی کی دھارا کو روک دیا ہے! تب کیا ہوگا؟

''ہوسکتا ہے کہ وہ تمھاری اُمید پر پانی پھیر دینے کی بجائے تمھیں تمھاری آخری سانس لے رہی بیٹی آشا کو پانی کی دو بوندیں دینے کی بجائے تمھیں امرت کا کُنڈ ہی دے دیں! مگر تم وہاں پہنچ کر زندہ رہو گے تب نا؟ جانتے ہو پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پر آکسیجن نہیں ہوتی ہے! بھگوان کو نہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے نہ آکسیجن کی، بلکہ آب کی بھی نہیں! آب سے پیدا ہونے والی ضروریاتِ زندگی کی بھی نہیں! مگر تمھیں تو ضرورت ہے ان سب کی! ہے نا؟ مگر یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ خلد سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدم نے صرف زمین پر آب دیکھ کر، زندگی کا ہرا بھرا چہرہ دیکھ کر ہی اس سیارے پر قدم رکھا ہوگا ورنہ اور بھی سیارے تھے زمین کے سوا! تھے نا؟ اگر اُس نے تب ریگستان کا شیطانی فریب یعنی سراب دیکھا ہوتا تو؟ تو بات اور ہوتی! ہوتی نا...؟

''اگر اُس نے تب پہاڑوں کو انسانی دماغ سے پیدا شدہ آنچ سے برف کی چادر اُتارتے ہوئے یا گلیشیروں کو پگھل کر بھاپ بنتے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...؟

''اُس نے اگر موسمِ بہار میں خزاں آلودہ درختوں کی شاخیں دیکھی ہوتیں تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...؟؟

''اگر اُس نے موسمِ برسات میں سُوکھے ندی نالے، دریا اور جھیل خشک ہوتے ہوئے دیکھ لیے ہوتے تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...؟؟

''اُس نے اگر کسانوں کو اپنے کھیتوں میں ہل چلا کر بیج بونے کی بجائے ان ہی کھیتوں میں فوجی جوانوں کو بارودی سرنگیں بچھاتے ہوئے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...؟؟

''اگر آدم نے بحیثیت اشرف المخلوق روپہلی سمندر کی لہروں کو تیل کی تہہ کے نیچے دَب جاتے دیکھا ہوتا اور آبی جانداروں کو گھٹن سے مرتے ہوئے دیکھا ہوتا تو بات اور ہوتی! ہوتی نا؟...؟؟

''ضرورت کو ایجاد کی ماں سمجھا جاتا ہے کیونکہ کھوج جب ضرورت پوری نہ کر سکے تب ایجاد کا بیج انسان کے دماغ میں داخل ہو جاتا ہے! گویا ماں کی کوکھ میں بیٹھا بچہ جب اندھیروں سے نکل کر روشنی دیکھ لیتا ہے تب ایک نئی ایجاد دنیا کو چونکا دیتی ہے! تم اعتقاد کی لاٹھی لے کر اُس چوٹی پر پہنچ نہیں پاؤ گے جبکہ میں ایک آکسیجن کا سلنڈر لے کر خلاؤں میں بھی جا سکتا ہوں اور پاتال میں بھی جا سکتا ہوں! اس لیے اپنی سوچ بدل کر سفر طے کر لو!''

میرے ہم سفر کی باتوں کے اعتماد سے بار بار میرے اعتقاد میں لرزش پیدا ہوتی رہتی تھی مگر ہر بار ایک بات جو مجھے ہر طرف گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور سیدھے دل میں اُتر جایا کرتی تھی وہ یہ تھی کہ تمھارا ہم سفر مکّار ہے، عیار ہے، کیونکہ اِس کا قول اُس کے عمل سے جُدا ہے! یہ تمھارے ساتھ اذیت ناک سفر کیوں طے کر رہا ہے؟ دراصل یہ آب کیسے ایجاد کر سکتا ہے؟ ایک حصّہ آکسیجن کے ساتھ دو حصّے ہائیڈروجن ملا کر؟ مگر اتنی مقدار میں وہ دونوں گیس کہاں سے لائے گا جو دریا بہنے لگے! یورینیم سے آگ پیدا ہوتی ہے، آب نہیں!! یہ تمھیں گمراہ کر کے تمھیں پیچھے دھکیل کر خود بھگوان شنکر سے ملنے جا رہا ہے! ان سے پانی مانگنے جا رہا ہے!۔؟

میرے لیے یہ سفر ایک عقیدت کی یاترا تھی! بھگوان کے درشن کرنے کے بعد ان سے پانی طلب کرنے کی خاطر، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ شِو شنکر بھولے ناتھ سچے بھگتوں کی بھگتی سے خوش ہو کر ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں! مگر اپنے ہم سفر کے ارادے اور ہی تھے!

خشک جھیل میں چلتے چلتے شک تو مجھے تب ہوا تھا جب وہ ان چشموں کو ڈھونڈ رہا تھا جو بقول اُس کے ہزاروں میل دور برفیلے پہاڑوں میں جذب ہوئے پانی کو زمین دوز راستوں سے شیطان کی نظریں چُرا کر، سرحدوں کی پروا کیے بغیر اور معاہدوں کو نظر انداز کر کے ایک ملک کے پانی کو دوسرے ملک میں جھیلوں اور دریاؤں کو وجود میں لاتے ہیں! نہ تو مجھے کمل کے پھولوں کا سراغ ملا تھا اور نہ میرے ہم سفر کو کوئی چشمے ملے تھے!۔!!

میں تب مایوس ہو کر اپنی یاترا پر چل پڑا تھا جبکہ وہ کچھ سوچ کر پانی کے وسائل کی تلاش کرنے کی خاطر میرے ساتھ آیا تھا!

ہم لوگ میرے دیار سے بہت دُور چلے گئے تھے! اور ہمارا ہر قدم ہم کو بلندیوں پر لے جا رہا

تھا! میں عقیدت اور عقیدوں کی باتیں کرتا رہا جبکہ ایک کٹھن سفر کے دوران جب بھی اس کو مطمئن کرنے کی خاطر کچھ مناظر دکھا کر اپنا نقطۂ نگاہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تب وہ یا تو زیرِ لب مسکرا دیتا تھا یا کہا کرتا تھا: ''میرے ہم نفس، میرے ہم نوا یہ بادل نہیں دُھواں ہے! جنگل میں آگ لگ جائے تو دن کے اُجالوں میں دُھواں نظر آتا ہے اور رات کی تاریکیوں میں دُور سے یا پاس سے آگ کی لالی نظر آتی ہے! کسی علاقے میں جنگ ہو رہی ہو تب بھی ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں! سنو یہ ایک سلسلہ ہے جس کو توڑا جا سکتا ہے! سوچ رہا ہوں کیا یہ سلسلہ جوڑا بھی جا سکتا ہے؟''

وہ یہ کہہ کر بڑبڑاتا رہتا تھا! ''بحر سے بھاپ اُٹھتی ہے! بھاپ سے بادل بن جاتے ہیں! بادل، بارش، برف اور کبھی کبھی اولے بن کر برستے ہیں! اور پھر پانی کی لکیریں، ندی نالے بن جاتے ہیں! دریا اور جھیل بن جاتے ہیں! چشمے، کنوئیں! گہرے کنویں، آبیاری، آبپاشی، گلستان، بوستاں، چرندے پرندے، کیڑے مکوڑے اور اشرف المخلوق انسان! براعظم، ملک، امریکہ، انگلستان، عراق، افغانستان، بھارت، پاکستان!'

اپنے ہم سفر کی باتیں سن کر بھی مجھے اپنے ہی دُکھوں کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں گویا دل میں اُٹھی ہوک اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی!

یہ جان کر کہ میرا ہم سفر دُور دیش سے آبِ حیات کی کھوج میں آیا ہوا الف لیلیٰ کی داستانوں کا کوئی کرشماتی کردار نہیں ہے بلکہ ایک سائنس داں ہے، میں نے اسی کی زبان میں اپنی روداد اُس کو سنا کر یہ بتا دیا کہ ایک یونانی مفکر کی تحقیق کے مطابق دنیا بنانے والے نے دُنیا اگر جیومیٹری کی مدد سے بنا دی ہے تو اس نے ہماری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے الجبرا کے فارمولے بھی بنائے ہوتے!

دراصل مجھے اپنی بیٹی آشا کی یاد آ رہی تھی! آشا اس صدی کی اُمید بھی تو ہے؟ اسی کو دو بوند پانی پلانے کی خاطر میں ہمالیہ کے پہاڑوں پر یہ دُشوار سفر طے کرنا چاہتا ہوں! اس امید کے ساتھ کہ ایک معجزہ ہوگا! بھگوان شنکر اپنے بھگت کی بھگتی سے خوش ہو کر اپنے بالوں سے پانی نکال کر میری ایک ہی خواہش پوری کر دیں گے!

میں جذبات کی رَو میں بہہ کر رو پڑا! اور آنسو یوں بہتے رہے جیسے میگھا کی اٹوٹ پھوار! سرد ہواؤں نے میرے آنسوؤں کو منجمد کر دیا تو میرا ہم سفر ویسے ہی اُچھل پڑا جیسے بھگوان کے درشن کر لیے تھے!

میرے ہم سفر نے بھگوان کو تو نہیں دیکھا تھا مگر پانی کے ایک منجمد ٹکڑے میں اُفق پر کھڑی چمکیلی

سحر کی کرنوں کا عکس دیکھا تھا اور میں نے اس کی خوشی کے عکس اس کی آنکھوں میں دیکھ لیے تھے!

اس نے ایک ایک کر کے جب بہت سارے موتی جیسے ٹکڑوں کو دیکھا تو حیران اس لیے ہوا کہ آکاش میں نہ تو بادل تھے اور نہ ہوا میں نمی تھی! آس پاس دیکھا تو نہ برف تھی نہ اولے تھے! پھر یہ پانی کی بوندیں کہاں سے آگئیں؟ کیا یہ بھگوان کا کیا ہوا کوئی اُپکار تھا! یا ایک معجزہ؟؟

میری کیفیت بھانپ کر میرا ہم سفر اس بار القاب کا استعمال کیے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا تھا!

''آشا کی یاد آرہی ہوگی؟ جبھی تو رو پڑے ہو؟ تم لوگ بات بات پر رو پڑتے ہو! جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہو! غم ہو یا خوشی، بس رو پڑتے ہو! کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اور کبھی مسرت کا اظہار کرنے کے لیے! کوئی پیدا ہو تو وہ روتا ہے اور کوئی مر جائے تو تم شدّت سے آنسو بہاتے ہو!''

میں نے جواباً جب اور شدّت کے ساتھ رونا شروع کیا تو وہ پھر بڑبڑاتا رہا!

''دہقان بھی اپنی سوکھی کھیتی دیکھ کر آنسو بہاتا ہے اور بہاتا رہے گا! بھوکے ننگے، سردی سے ٹھٹھر رہے لوگ بھی روتے ہیں اور روتے رہیں گے! اس خطے میں آنسوؤں کی تجارت شروع ہوسکتی ہے! خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہوگا تو خون بیچنے والوں کی قطاریں نظر آئیں گی! بھوکا بچّہ ماں سے کہہ دے گا کہ میری خوب پٹائی کردو تاکہ میں آنسو بہا کر تاجر سے کھانا مانگ سکوں!

ایک ارب لوگوں کے آنسو جمع کیے جائیں تو بوند بوند سے مل کر آب کا ذخیرہ بنا سکتے ہیں اور اس کا مالک میرا آقا ہوگا! اور پھر آقا ہی اپنی ایجاد کی حرارت سے تپش پیدا کرے گا، دھرتی پر موجود پانی کو چوس لے گا اور پھر پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لیے اپنے غلاموں کو پانی دے گا!

پھر زمین میں چھپے تیل کا مالک وہی ہوگا!! ہوا کو زہر آلودہ بنا کر آکسیجن دینے والا مسیحا بھی وہی ہوگا! آشا، اس صدی کی اُمید کو زندہ رکھنے والا، تاثیرِ مسیحائی پہنچانے والا، آب کی بوندیں دینے والا شہنشاہوں کا شہنشاہ بھی میرا ہی آقا ہوگا!!

''مگر یہ وہ ملک ہے جہاں سنگیت سمراٹ تان سین نے مغل اعظم کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لیے دیپک راگ گا کر تاریکیوں کو اُجالوں میں بدل کر اپنے وجود کو جلا دیا ہوتا اگر اس کو دل و جان سے چاہنے والی تانی راگ میگھ ملہار گا کر بارش نہ برساتی! اگر آشا نے بھی وہی راگ چھیڑ کر بارش کے دیوتا اندر کو خوش کر دیا تو جھیل پھر بھر جائے گی اور عبادت کرنے والے، پرستش کرنے والوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنے اعتقاد سے تمھارا اعتماد چھین کر لے گئے تو کیا ہوگا؟''

یہ سن کر میں نے اپنے ہم سفر کے خیالات کے تسلسل کو توڑ کر کہا: ''ایک بار میری آشا کے

سوکھے ہونٹ تر ہو جائیں اور خشک حلق سے آواز نکل پائے تو ماتا سرسوتی شاردا کی کرپا سے وہ ملہار گا لے گی!! اور بارش ہو گی!! پانی گرج کر برسے گا!!"

میرا ہم سفر چونک پڑا اور بول پڑا!

"نادان باپ! تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ برف کے ٹکڑے تمھارے دیار کی تپش سے پگھل جائیں گے اور خالی ہاتھوں سے تم فقط اپنی بیٹی کی ارتھی اٹھا سکو گے! تم وقت ہو اور وہ زندگی...!

"تم ہرن کی طرح احمق ہو! کستوری کی مہک سونگھ سونگھ کر یہاں آئے ہو جبکہ کستوری تمھارے پیٹ میں ہے..."

"یہ پانی تمھاری آنکھوں سے بہہ رہا ہے اور سرد ہوائیں اس کو اولے بنا رہی ہیں!' یہ سن کر میں نے اپنے گالوں پر جم چکے اپنے ہی آنسو کے قطرے کو چھوا! میں نے پوچھا کہ "میں اپنی آشا کو اپنے آنسو کیسے پلا سکوں گا! عقیدت کا جذبہ مجھے اپنے دیار سے بہت دور لا چکا ہے! اب تم ہی بتا دو کہ میں کیا کروں؟"

تب وہ پہلی بار فاتحانہ قہقہہ لگا کر بولا! "مجھے پہچان لے اے انسان! میں نے تیل کے کنویں دریافت کیے ہیں! اور ایٹم (Atom) ایجاد کیا ہے! اب ایک نئی ایجاد کرنے جا رہا ہوں! تم جیسے ضرورت مندوں کے لیے! آنسو تمھارے ہوں گے اور ان کو تمھاری آشا تک پہنچانے کا طریقہ میں ایجاد کروں گا!'

یہ وہ آخری جملہ تھا جو میں نے سن لیا تھا! پھر خاموشی چھا گئی تھی اور میں اپنے ہم سفر کی مضبوط گرفت میں یہاں اُڑ کر آیا ہوں یا کسی تیز رفتار طیارے میں بیٹھ کر آیا ہوں مجھے معلوم نہیں کیونکہ اپنی اشک بار آنکھوں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا!

میں بہت آنسو بہا چکا ہوں اور اب جب رُک رُک کر ایک ایک قطرہ بہہ کر جم جاتا ہے تو میرا ہم سفر ایک فورک (Fork) سے اُٹھا کر بوتلوں میں ڈال دیتا ہے!

کیا یہی میرے ہم سفر سائنس داں کی نئی ایجاد ہے؟ کوئی تو مجھے بتا دے؟ — ؟؟

انسان نہیں، بھگوان نہیں! شیطان بھی تو نہیں بتا رہا ہے! کیوں؟

OO

ایک ہی خواہش

ہم دونوں پر ایک جیسی کیفیت طاری ہے!

ذراسی آہٹ ہوتی ہے تو ہماری نظریں اِدھر اُدھر جھانک کر لاجو کو ڈھونڈتی رہتی ہیں!

دراصل ہم دونوں بے صبری سے لاجو کا انتظار کر رہے ہیں!!

حالانکہ میں نے اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھ لی ہے پھر بھی جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے سوال پوچھے بغیر ہی مجھے جواب ملے گا! شاید اس لیے کہ انتظار کے لمحات میں مجھے بار بار یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے جنت سے آئی ہوئی ایک اپسرا اپنے کرشماتی مٹکے سے ایک سوکھے تالاب کو بھر کر پانی کی تہہ پر پھول برسا رہی ہو......!

فاروق کو یقین ہے کہ اس کی خواہش پوری ہوگی اور وہ آج ہی لاجو کو شام کو فلائٹ سے ممبئی لے جاسکے گا جبکہ میں اپنے ہی خیالات، احساسات، جذبات کے دلدل میں پھنس کر کبھی خدشات کا شکار ہو جاتا ہوں اور کبھی خواہشات کے پر لگا کر آکاش میں اُڑتا رہتا ہوں، شاہین کی طرح......!

فاروق نے جب لاجو کو پہلی بار دیکھا تھا تب وہ لاجو کو میری چھوٹی بھابھی آرتی سمجھ بیٹھا تھا اور جب آرتی کو میں نے یہ بتا دیا تھا تب ہم سب دن بھر ہنستے رہے اور ہمارے قہقہوں کی آواز سن کر فاروق اپنی احمقانہ حرکت پر اس قدر نادم ہوا تھا کہ اسی روز واپس بمبئی لوٹنے کا پروگرام بنا رہا تھا مگر لاجو کو دوسری بار دیکھ کر اس نے اپنی تمام مصروفیات اور شوٹنگ شیڈول کینسل کر دیئے تھے اور فقط چار دن میں لاجو اس کے لیے اتنی اہم بن گئی ہے کہ دن میں دس دس بار بمبئی سے فون آنے کے بعد بھی لاجو کو اپنے ساتھ لیے بغیر وہ واپس لوٹنا نہیں چاہتا ہے!

فاروق بمبئی میں فلمیں بناتا ہے اور میں قالینوں کا تاجر ہوں! ہم دونوں بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں، ہم بچپن کے دوست ہیں مگر الگ الگ راستوں پر چلتے چلتے اکثر کسی نہ کسی موڑ پر ملتے رہتے ہیں! کبھی ہوائی اڈے پر کبھی کسی ہوٹل میں یا کسی نہ کسی پارٹی میں ملتے رہتے ہیں اور ان چھوٹی

چھوٹی ملاقاتوں کے دوران ہمیں ہر بار یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخوں کی طرح ایک دوسرے سے دُور رہ کر بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں! اور دھوپ، بارش، آندھی، طوفان یا جھولنے والی ہواؤں کے اثر میں، دونوں کی، ایک جیسی کیفیت ہوا کرتی ہے! لیکن ان دنوں، ہم مدتوں بعد ویسے ہی باتیں کرتے رہے جیسے ہم کالج کے زمانے میں کیا کرتے تھے! چونکہ ہم لاجو کے بارے میں باتیں کرتے رہے اس لیے گفتگو کی سہانی آنچ سے برف پگھلتی رہی اور منوں برف کے تودوں کے نیچے دَبی ہماری خواہشات، جنون کا لبادہ پہن کر سامنے آتی رہیں! چالیس سال کی عمر میں ہم بیس سال کے لڑکوں کی طرح باتیں کرتے رہے! فاروق بھی میری طرح کنوارا ہے نا؟ —؟؟

ایسا نہیں کہ ہم شادی نہیں کرنا چاہتے تھے! ہاں شادی کی عمر تب پیچھے رہ گئی جب ہم دولت یا شہرت پانے کے لیے دوڑتے رہے اور دوڑتے دوڑتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر دوڑ میں حصہ لینے والوں کی طرح اپنی رفتار تیز کرتے رہے! یوں تو فاروق اپنے بہت ہی بڑے پیمانے پر بنائے جانے والے ٹیلی سیریل کی چند پہاڑی لوکیشنز دیکھنے کے لیے آیا تھا لیکن لاجو کی خوبصورتی کے جادو کا شکار ہو کر نہ تو لوکیشنز دیکھنے گیا اور نہ ہی گھر سے باہر نکلا، بس لاجو کے حسن کے بارے میں یوں قصیدے پڑھتا رہا گویا مہا کوی کالی داس شکنتلا کے بارے میں بتا رہا ہو!

فاروق کی باتیں سن سن کر جب میں نے بھی لاجو میں دلچسپی لی تو یہ سوچتا رہا کہ میں نے اس سے پہلے اپنی کاروباری فائلوں سے نظریں ہٹا کر لاجو کو غور سے کیوں نہیں دیکھا تھا؟

لاجو ہمارے گھر میں تقریباً چار سال پہلے ائی ہے! مجھے یاد ہے میں نے تب آرتی کو یہ ہدایت دی تھی کہ لاجو نہ تو میرے لیے چائے لایا کرے گی اور نہ میری موجودگی میں میرے کمرے میں داخل ہوگی! وجہ یہ کہ تب اس کے میلے کچیلے کپڑوں سے ناقابلِ برداشت بدبو آتی تھی اور یہ تیرہ یا چودہ سال کی لڑکی اپنے لمبے لمبے میلے ناخنوں سے اپنے گندے بالوں کو کھرچتی رہتی تھی! لیکن اب آرتی کے پرانے کپڑوں میں یوں نظر آ رہی ہے جیسے کیچڑ میں کھلا ہوا کنول کا پھول!!

لاجو صبح سے شام تک ہمارے گھر میں ہی رہتی ہے! کبھی زیادہ گرمی ہو تو وہ خود ہی کولر آن کر کے ڈائننگ ہال میں سو جاتی ہے! وہ کچھ بھی کرے کوئی کچھ نہیں کہتا! کوئی اس کو روکے یا ٹوکے بھی تو کیسے؟ لاجو ہمارا گھر جو سنبھالتی ہے! برتن اور کپڑے دھو لیتی ہے، کمروں کی صفائی کرتی ہے، کپڑوں پر استری کرتی ہے! جب ہم اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، وہ گھر کی دیکھ بھال کرتی

ہے! فون آئے تو وہ یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ وہ گھر کی نوکرانی ہے! ہمارے ساتھ ساتھ رہ کر اس کا تلفظ اتنا اچھا ہے کہ کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ وہ صرف چار جماعتیں پڑھی ہے! کبھی کبھی وہ انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کرتی ہے! ظاہر ہے یہی خوبیاں فاروق کی دلچسپی کا مرکز بن گئی ہیں اور اب میری خواہش کی بنیاد بھی!

فاروق اپنے ہنر میں ماہر ہے اس لیے اس کے انتخاب کو شک کی نظروں سے نہیں دیکھا جاسکتا ہے! فاروق اپنے نئے سیریل میں ایک بہت ہی مشہور فلم ایکٹریس کو ہٹا کر لاجو کو ہیروئن بنا لینے کا خواہش مند ہے اور اس کی بات سن کر میں بھی ان دنوں لاجو کے رنگ روپ کے علاوہ اس کی چال ڈھال اور بول چال میں خاصی دلچسپی لے کر یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے سوئے ہوئے جذبات راکھ کے نیچے دبے انگاروں کی طرح دہکنے لگے ہیں! پہلے شادی کا خیال آیا اور پھر لاجو کو پانے کی چاہت نے دل پر دستک دی! پھر لاجو کے قدموں کی اہٹ سُن کر جب ہر بار یوں لگتا رہا جیسے اندر سنبھاسے آئی اپسرا مینکا مہارِشی وشوامتر کی زندگی میں آرہی ہے! تب ان دنوں کسی نہ کسی بہانے لاجو کو بار بار بلاتا رہا! فاروق سمجھتا رہا کہ میں اُس کو سمجھنے میں، اس کو قریب لانے میں اس کی مدد کررہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سے میں نے اس کو آرتی کے پرانے مگر بھڑکیلے لباس میں دیکھا ہے تب سے میں لاجو کو شہزادہ سلیم کی انارکلی سمجھ بیٹھا ہوں مگر اس خوبصورت تصور کے ساتھ ساتھ کل گئی رات تک میں جب بھی اپنے خاندان کے بارے میں سوچتا رہا تب لاجو کے خاندان کا احساس میری سانسیں دبوچتا رہا!

لاجو کی ماں کو محلے والے نوکرانیاں پیدا کرنے والی مشین کہتے ہیں! سات بیٹیاں ہیں اور وہ محلے کے تقریباً ہر گھر میں کام کرتی ہیں! ایک کی شادی ہوئی تو دوسری بہن اس کی جگہ لیتی ہے! لاجو سے پہلے اس کی تین بہنیں بھی ہمارے گھر میں کام کرچکی ہے! بلکہ ہمارے گھر میں کام کرنے کی شروعات لاجو کی ماں نے کی تھی! تب وہ مرحوم نند وحلوائی کی بہو چنچل تھی اور اب وہ چنچلو بن گئی ہے اور یہ یاد آتے ہی پہلی بار میرا کلیجہ پھٹ سا جاتا ہے!

لاجو کا گھر کبھی خوشحال ہوا کرتا تھا! لاجو کے دادا نند و حلوائی کا ایک بہت بڑا گھر تھا! ایک بہت بڑی دُکان تھی! دکان پر مٹھائیاں بنانے کے لیے کئی کاریگر کام کیا کرتے تھے! مگر اس کی موت کے بعد لاجو کے شرابی باپ موتی نے دو سال کے اندر پہلے مکان بیچ ڈالا اور جب وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ دُکان کے ایک حصے میں رہنے لگا تب دُکان سکڑ کر ایک پکوڑے کی دکان

بن گئی تھی! جب پکوڑوں کی کمائی شراب کی بوتلوں میں ڈوب گئی تب وہاں جہاں مٹھائیاں بنتی تھیں سوکھے پھلکے بھی نہیں بنتے رہے! پھر چنچلو نے ہمارے گھر میں کام کرنا شروع کیا! ہمارے گھر سے لیا ہوا کھانا خاندان کے لیے پورا نہ ہوا تو لاجو کی بہنیں اسکول کی وردیاں پہن کر کئی گھروں میں جھاڑو لگاتی رہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساتوں بیٹیاں ہم لوگوں کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر نوکرانیاں یا گھروں میں کام کرنے والیاں بن گئیں! رادھا رادھو اور سیتا ستیو بن گئی ہے! تب سے اب تک محلے میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو چنچلو یا اس کی خوبصورت بیٹیوں کے بارے میں اِدھر اُدھر کی بات نہیں کرتا رہتا ہے! لاجو کے بارے میں کچھ بہت زیادہ بولا جاتا ہے! آرتی نے بھی ایک بار لاجو کو اس کے والدین کے کشیدہ تعلقات کے بارے میں پوچھا تو وہ دوسرے دن برتن دھونے نہیں آئی تھی! پھر آرتی زوردار بارش میں بہت سارے پرانے کپڑے بلکہ اپنا پھٹا ہوا شادی کا جوڑا رشوت میں دے کر اُس کو منا کر واپس لے آئی تھی! اسی ڈر سے محلے والے ان لوگوں کے بارے میں کھل کر باتیں نہیں کرتے ہیں، ہاں اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ لاجو بھی اپنی ماں کی طرح پتی پرمیشور کے جھمیلوں میں اُلجھنے کی بجائے ہمارے ہی گھر میں نوکرانی رہنا پسند کرے گی! جب کبھی یہ افواہیں اُڑتی اُڑتی ہمارے گھر پہنچ جاتی ہیں تب آرتی لاجو کو نکالنے کے بارے میں سوچتی ضرور ہے مگر عملاً کچھ بھی نہیں کرسکتی ہے! بلکہ جب کبھی وہ لوگ کسی شادی بیاہ میں شرکت کے لیے جاتے ہیں تب لاجو بھی بن ٹھن کر کار میں بیٹھ جاتی ہے اور یہ بھول کر کہ وہ گھر کی نوکرانی ہے وہ تقریبات میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیتی رہتی ہے، گاتی ہے، ناچتی ہے! سب چونک تو پڑتے ہیں مگر کوئی لاجو کو سمجھا نہیں سکتا! روکنے اور ٹوکنے کی بات دُور ہے!!

یہ سارا محلہ جانتا ہے کہ چنچلو نے اپنے بدصورت شرابی شوہر کو اپنی زندگی سے الگ کردیا تھا! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ موتی کو چنچلو یا اپنی بیٹیوں کا گھروں میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا جبکہ چنچلو کو سات گھروں سے آرہے سات قسم کے پکوان کھاتے کا چسکا لگا ہے اس لیے وہ نہ خود کام کرنا چھوڑتی ہے اور نہ بیٹیوں کو منع کرتی ہے! یہ سچ ہے کہ موتی رام اپنی دُکان کے ایک حصّے میں یا تو دن بھر شراب پیتا رہتا تھا یا پھر اپنی بیوی اور بیٹیوں کو گالیاں دیتا رہتا تھا! گھر والے اس کو کھانا تو دیتے تھے مگر یوں پھینک کر جیسے کتے کو کھانا ڈالا جا رہا ہو!!

یہ سب دیکھ سن کر اس گھر سے بدنامی کی بدبو آتی تھی لیکن جب موتی رام مر گیا تب ہم سب سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ کیا زندگی میں ایسے بھی رنگ ہوسکتے ہیں؟

یہ سب ایک سال پہلے ہوا تھا! موتی رام کی لاش دُکان میں پڑی تھی لیکن محلے کا کوئی بھی لاش کے قریب جانے کے لیے تیار نہیں تھا! وجہ یہ کہ موتی رام اسی جگہ ٹٹی پیشاب کیا کرتا تھا جہاں وہ کبھی پکوڑے بنایا کرتا تھا! جب چنچلو نے اکیلے ہی دُکان کی صفائی کی اور اپنے شوہر کو نہلا کر لاش کو گھسیٹ کر باہر لائی تب ہم سب حیران ہو گئے تھے! پھر چند روز پہلے جب چنچلو اپنے مرحوم شوہر کا شرادھ کرانے کے لیے آرتی سے ادھار لینے آئی تھی تب یہ بات سامنے آئی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی تھی! اس کو موتی رام کا بغیر کام کاج کیے شراب پینا بھی منظور تھا مگر اس کو ڈر تھا کہ اگر موتی رام دس سال میں سات بیٹیاں پیدا کر سکتا تھا تو اگلے چند برسوں میں پانچ چھ بیٹیاں یا نوکرانیاں اور نہ پیدا کرے! دراصل اس کو اپنی بیٹیوں کا گھروں میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا اس لیے وہ موتی رات کو آپریشن کے لیے کہتی رہی مگر وہ ٹالتا رہا! بے چاری نے اپنا آپریشن کروانے کے لیے جو رقم جوڑی تھی، موتی رام نے وہ بھی شراب کے ٹھیکیدار کو دے ڈالی تھی! تب اس نے موتی رام کو اپنے سے دُور رکھا تھا! ایک مقصد کی خاطر!!

کل رات جب میں نے یہ ساری باتیں فاروق کو بتادی تھیں، تب میں اپنے آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر میں لاجو سے شادی کرلوں تو سماج کے ٹھیکیداروں سے یہ کہہ سکوں گا کہ غریبی عذاب ہے کوئی عیب نہیں! مگر فاروق کچھ اور سمجھ کر مجھے چارلی چیپلن اور ہالی وُڈ کی مشہور اداکارہ مارلن مونرو کی مثالیں دے کر یہ سمجھاتا رہا کہ جدوجہد ہی انسان کو کامیاب بناتی ہے! پھر کامیاب شخص کا تاریک دور بھی، جگمگاتی روشنی میں، دلچسپ نظر آتا ہے! وہ رات بھر لاجو کے شاندار مستقبل کے بارے میں یوں بولتا رہا گویا ناس ٹرڈامس اپنی پیشین گوئیاں سنا رہا تھا!

یہ سب سن کر میرے خدشات پانی کے بلبلوں کی طرح اُڑتے گئے اور میری خواہش کا بیج ایک پودا بن کر لہکنے لگا تھا! میں نے فاروق کو بتائے بغیر دل ہی دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ جونہی فاروق لاجو کو بطور ہیروئن سائن کرے گا تو میں بمبئی میں فلیٹ خرید کر لاجو سے شادی کرلوں گا اور اپنا قالینوں کا بزنس بھی بند کر کے فلمیں بناؤں گا!

کروٹیں بدل بدل کر رات بھر یہی سوچتا رہا اور صبح سویرے میں نے اپنے دل کی بات دل میں رکھ کر آرتی سے فقط فاروق کے دل کی بات کی!

آرتی کو بھی لاجو میں کئی فنکارانہ صلاحیتیں نظر آئی تھیں اس لیے ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے لاجو کی رضامندی کا انتظار کرتے رہے جبکہ آرتی لاجو سے کچن میں باتیں کرتی رہی! ایک

طویل مگر سہانے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں تو لاجو کے پُرکشش چہرے پر پھیلی سحر انگیز مسکراہٹ دیکھ کر میری خواہش کا پودا ایک سربفلک درخت بن کر یوں جھومنے لگا گویا پتہ پتہ جل ترنگ بجا رہا ہے! اور شاخیں چار سو خوشبو پھیلا رہی ہیں!

فاروق کی مسکراہٹ اس کے بہترین انتخاب کی ترجمانی کر رہی ہے اور وہ یہ جان کر خوشی سے اُچھل پڑا ہے کہ لاجو کو سیریلز کے بارے میں خاصی دلچسپی ہے بلکہ فاروق کے اصرار پر اس نے چند مشہور سیریلز کے چند کرداروں کی نقل بھی ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح پیش کی ہے، ہاں ہم سب کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ لاجو، جس کو ہم اب لاجونتی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں، کو یہ بھی معلوم ہے کہ ٹی.وی پر کام کرنے والوں کے پاس دولت اور شہرت، بنگلے اور کاریں، نوکر چاکر ہوتے ہیں!

اتفاقاً لاجونتی نے آج آرتی کی شادی کا پرانا جوڑا پہن لیا ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری خوشی ایک گلیشیر سے نکلی ہوئی دھارا اچانک ایک آبشار بن گئی ہو! اچانک لاجو نے ہم سب کو چونکا دیا ہے!!

''صاحب جی! میں بمبئی کیسے جا پاؤں گی! میری شادی ہو رہی ہے نا!''

''کس سے؟'' میں نے جب چلا کر پوچھا تب سبھی چونک پڑے! لاجو بھی! جبکہ فاروق میرا بھائی اور آرتی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے! لاجو ہمارے سامنے قالین پر بیٹھ گئی ہے! پہلے وہ شرمائی اور پھر مسکرائی! گویا کیمرے کے سامنے راز کی بات بتانے جا رہی تھی!

''ہے کوئی! اس کا باپ پکوڑے بیچتا ہے! اور وہ خود سرکاری دفتر میں چپراسی ہے!''

یہ کہہ کر وہ ایک آہ بھر کر مایوس ہوگئی!

میں نے جان بوجھ کر مایوس ہونے کی وجہ اس لیے پوچھی کہ اگر وہ مجھے اشارتاً بھی میرے دل کی بات بتا گئی تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر شادی کا اعلان کر دوں گا! لیکن لاجو نے ایک بار پھر آہ بھری اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے یوں مخاطب ہوئی جیسے وہ فریادی تھی اور میں منصف!

''اور تو سب ٹھیک ہے! بس میری ایک ہی خواہش ہے! میرا پتی میرے باپو کی طرح شرابی نہ ہو!''

OO

گردش!

اچانک سراسیمگی کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگا رہی رجنی شرما کو یہ احساس ہوا کہ اُس کی اُمید کی سحر ایک گیند کی طرح اُچھل کر رات کے اندھیرے میں کھو گئی ہے! یعنی اُمید نے نہ دِن دیکھا اور نہ شام!

گویا زندگی کا سفر ایک بار پھر اُس کے اپنے طے شدہ راستے پر چلتے چلتے اس بار بھی ایک دوراہے پر رُک چکا ہے!

ایسا اس کے ساتھ بار بار کیوں ہوتا رہتا ہے!؟

منزل کے قریب پہنچ کر بھی وہ اپنی من چاہی منزل سے کیوں دُور ہو جاتی ہے؟ کیا اُس کی تدبیروں میں ہر بار کوئی کمی رہ جاتی ہے یا اُن پر، اُس کے جنم سے وابستہ تاروں (گرہوں) کی گردش حاوی ہو جایا کرتی ہے!

اس بار اُس نے اپنے آپ کو اُس ہم سفر کے ساتھ منسلک کر دیا تھا جو اُس کے ایک مقررہ وقت پر ایک خاص جگہ پر مِل کر اُس کا ہم سفر ہم نوا بن گیا ہے اور دونوں کی ایک ہی منزل ہے جو سامنے تو ہے مگر نظر نہیں آتی! کیا اُس کو اسی منزل کو جو بے شکل ہے اپنی من چاہی منزل سمجھ کر قبول کرنا چاہیے یا پھر اپنے اعتماد کے بل بوتے پر تدبیر کی راہ پر چل کر دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی من چاہی منزل کی تلاش کرنے کی سعی کرنی چاہیے!

مگر تذبذب و تجسّس کی شکار رجنی کے قدم گویا ایک دوراہے کے آگے تھم گئے ہیں—! وہ بے حد ذہین ہے اس لیے وہ جانتی ہے کہ ایک راستہ اُس کی من چاہی منزل تک جائے گا اور دوسرا اُس کو اپنی منزل سے، ہر قدم چل کر منزل سے دُور کرتا جائے گا—! یہ وہ تب سے جانتی ہے جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہے!

چھ سال کی عمر میں وہ ایک سولہ سال کی لڑکی کی طرح اپنی ماں اور اپنے باپ کی باتوں اور

مشوروں پر سوچ کر اپنی رائے بنانے کی عادی ہو چکی ہے—!

ہاں اپنی رائے بنانے سے پہلے وہ اپنے والدین کے متضاد خیالات سے متاثر ہو کر اکثر ایک پینڈولم (Pendulome) کی طرح جھولتی رہتی ہے! اور یوں عذاب دِہ لمحات کی شدّت سے فیصلے نہیں کر پاتی ہے کہ اعتقاد کی ڈور پکڑ لے یا پھر اپنے اعتماد کے بل بوتے پر زندگی کا سفر جاری رکھے! جوش کی بجائے ہوش میں رہ کر! مگر ایک انقلابی بن کر یا پھر ایک انتقامی بن کر؟ -!! ماں کے عقیدوں یا باپ کے خیالوں کو اپنی طاقت بنا کر!؟ -؟

آج بھی اُس پر ایسی ہی سیمابی کیفیت طاری ہو چکی ہے! اور یہ فیصلہ حالات نے اس کے مقدّر کے کھاتے میں ڈال دیا ہے! اور اُس نے فقط اپنے ہم نفس ہم نوا کے بھروسے پر قبول بھی کیا ہے! مگر اُس کی شادی یوں ہو پائے گی یہ اُس نے کبھی سوچا بھی تھا!

رجنی اپنے باپ کی لاچاری سے باخبر ہے اس لیے اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ شادی کی رسومات دھوم دھام سے ہوں—! مگر وہ یہ تو چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہو— باپ لگن منڈپ پر اُس کا کنیادان کرے تب جب اُس کی ماں سہاگ راگ جس کے لیے وہ اپنے چھوٹے قصبے میں مشہور ہے، گاتی رہے— اور پھر والدین اُس کو وداع کریں—! لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے!!

دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں اور وہ جانتی ہے کہ ماں کو اُس کی مجبوری سن کر دُکھ ہو گا مگر بیٹی کی شادی ہو گئی یہ جان کر وہ مسرّت کا بھی اظہار کرے گی! یہ سمجھ کر کہ شادی شدہ لڑکی کو نرک (جہنم) میں نہیں بھیجا جا سکتا ہے جبکہ اچھے کرموں (کارکردگیوں) کے باوجود ایک کنواری کو نرک میں ہی مرنے کے بعد جگہ ملتی ہے!

پہاڑوں کی گود میں، ایک پہاڑی دریا کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک پراچین مندر ہے جہاں دیواروں پر کریدی ہوئی جنت اور جہنم کی تصویریں ہیں—! مندر میں موجود قدیم زمانے کے ہاتھ سے لکھی کتابیں ہیں—! اُن میں ہاتھوں سے بنی تصویریں ہیں جن کے تعلق اور حوالوں سے دُور دُور سے لوگ اپنی تقدیر کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے رہتے ہیں!

روز شام کو مندر کے احاطے میں کتھائیں سنائی جاتی ہیں اور دن بھر لوگ کتابوں کے حوالوں سے اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرنے آتے جاتے رہتے ہیں! مندر کے پجاریوں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ نہ صرف ہاتھوں کی لکیریں پڑھنے بلکہ جنم پتری بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے

ہیں! اور اہم بات یہ کہ مندر کے پجاری صدیوں سے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے بارے میں یہ سخت ہدایات ہیں کہ پجاری دکھشنا میں وہی لیتے ہیں جو یاتری اپنی مرضی سے دیتے رہتے ہیں!

ظاہر ہے کہ پجاریوں کی اقتصادی حالت کسمپرسی میں ہی قید رہتی ہے! رجنی کا باپ تب ایک انقلابی اسکول ماسٹر تھا جب اُس کا باپ مر گیا تھا! مجبوراً بے چارے کو نوکری چھوڑ کر مندر کا پجاری بننا پڑا تھا! اعتقاد کے اصولوں کا غلام بن کر اور اعتماد کی طاقت کو بے مطلب سمجھ کر!

اُس کی ماں چونکہ بچپن میں ہی مر گئی تھی اس لیے کئی برسوں سے اُس کی بیوی مندر کی صفائی کرتی رہتی ہے اور دیواروں پر بنی تصویروں کو رنگ کر پھیکا ہونے نہیں دیتی ہے! بلکہ وہ کبھی کبھار غریب لوگوں کی بستیوں میں جا کر کتھائیں سناتی رہتی ہے! عورتوں کی زچگی کے بارے میں وہ اُن کی مسیحا بھی ہے!

یعنی وہ جو وقت پر مفت اسپتالوں کے دروازوں تک بھی نہیں پہنچ پاتے ہیں اُن کے بچوں کو وہ کوکھ کے اندھیروں سے نکال کر سورج، چاند، ستاروں کی روشنی دِکھاتی رہتی ہے!

وہ دائی ہے مگر بدلے میں وہ کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتی ہے وہ اس لیے کہ وہ اس جنم میں کارِ نیکی کر کے اُس کی جزا اگلے جنم میں لینا چاہتی ہے—! ایک اعتقاد پرست جو ٹھہری!

اس لیے وہ اپنی اس جنم کی مشکلوں کو اپنے پچھلے جنم یا جنموں کے کارِ بد کی سزا سمجھ کر یعنی وہ جو ہوتا ہے، جو ہو چکا ہے یا جو آنے والے کل ہوگا، کو مقدر سمجھ کر خوشی خوشی قبول کر لیتی ہے!

جبکہ یاتریوں میں اپنے ہنر کے لیے ہر دل عزیز رجنی کا باپ، تقدیر کی وکالت کرنے والا اپنے بارے میں فقط تدبیر کو اہمیت دیتا رہتا ہے! ظاہر ہے کہ اس کے قول اور عمل میں لیل و نہار کا فرق ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں تکرار بلکہ جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں! جن کا اثر ان کی اِکلوتی اولاد کی سوچ و سمجھ پر حاوی ہوتا رہتا ہے!

رجنی کے باپ نے اپنی بیٹی کی جنم پتری بھی نہیں بنائی ہے اور نہ کبھی اس کے ہاتھوں کی لکیریں پڑھی ہیں کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو ہمیشہ یہ بتاتا آیا ہے کہ امریکہ کے ایک صدر ابراہم لنکن کے ہاتھوں میں جنم لیتے وقت ہاتھوں میں کوئی لکیر نہیں تھی—! گویا ہاتھ ایک بیابان کے مانند تھے! مگر اُس نے اپنے آہنی ارادوں، بلند عزم اور اعتماد سے اُس کو کھیتوں میں بدل دیا تھا! اس جنم میں کیے گئے اچھے کرموں اور کارگیوں کا پھل اسی جنم میں پالیا تھا—! وہ چاہتا ہے کہ اس کی

بیٹی بھی اپنے آپ پر بھروسہ رکھ کر، اپنی تدابیر سے اپنی تقدیر تراش لے! ظاہر ہے کہ وہ مندر کی اگلی پجارن نہیں بن سکتی ہے! وہ بیٹی کی پیدائش سے بہت خوش ہے! اس لیے وہ بیٹی کو دھرم کرم کے ہر کام سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے! جبکہ ماں نے اپنی بیٹی کو چھ سال کی عمر سے ہی اپنے قرب میں رکھ کر مندر کی سرگرمیوں اور قدیم کتابوں کے مفہوم سے باخبر رکھتی آئی ہے کیونکہ اس کے اعتقاد کے مطابق اُس کا جنم یاتریوں کی خدمت کرنے کے لیے ہی ہوا ہے! اُس کا بس چلتا تو وہ اُس کی شادی کروا چکی ہوتی!

ماں نے اس کو ساوتری کا نام دیا تھا مگر باپ نے اسکول میں اُس کا نام رجنی درج کرایا تھا! وہ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹی رجنی گندھا پھول کی طرح باغ میں زمین سے پانی چوس کر شاداب نظر آئے اور زمین سے الگ ہو کر وہ کسی قدردان کے گلدان میں رکھے پانی کو چُوس کر کھلتی رہے اور مہکتی رہے!

دو سال پہلے رجنی نے اپنے باپ کے اصرار پر ملک گیر میڈیکل کالجوں کے داخلے کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کر کے بھی ریزرویشن کوٹوں کی وجہ سے بازی جب ہاری تھی تب ماں نے چند باتیں کہی تھیں! ذہن نشیں کرنے کی خاطر! یعنی اس پر ہو رہی زیادتی پر اعلانِ جنگ کرنے کی بجائے یہ قبول کرنے کی خاطر کہ ہر جنم لینے والا، کوکھ میں ہی، اپنی بند مٹھیوں میں اپنی زندگی کا، کاتبِ تقدیر کا لکھا ہوا سفر نامہ یا ازل نامہ لے کر آتا ہے! کون کس جگہ، کس وقت، اور کس کی کوکھ کے اندھیروں سے نکل کر آتا ہے یہ خالقِ جہاں ہی طے کرتا ہے! جو ہوتا ہے، تاروں کی گردش کے سبب ہوتا رہتا ہے! غم اور خوشی، آہ اور واہ کے واقعات اسی میں درج ہوتے ہیں اور جو بھی ہوتا ہے جنم دینے والے کی مرضی سے ہوتا ہے! اس لیے شوخیوں اور تلخیوں دونوں کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے!

تب اُس نے بیٹی کو یہ احساس بھی دلایا تھا کہ اگر ڈاکٹر بن جانا اُس کے نصیب میں ہوتا تو وہ ایک غریب پجاری کے گھر میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہوتی! بلکہ کسی کوٹے والے کے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی پھر یا کسی ایسے گھر میں جنم لے چکی ہوتی جہاں اس کو ڈاکٹری کی سیٹ خرید کر دی جا سکتی تھی —!

دِل شکستہ! رجنی کو، تب ماں نے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ باپ کے بتائے ہوئے نہایت دشوار راستوں پر چلنے کی بجائے مندر کے احاطے میں غریب بچوں کو سرسوتی کا دان دے کر اپنا اگلا جنم خوشگوار بنانے کی کوشش کرے! تو ثواب کا پھل اگلے جنم میں ضرور مل سکتا ہے!

لیکن رجنی کا باپ تب بھڑک اُٹھا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے ایک بار پھر تدبیر سے بگڑی تقدیر کو سنوارنے کی خاطر ایک نیا راستہ کھوج سکتی ہے!!

رجنی نے اپنے باپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بی.ایس.سی کرنے کے بعد آئی.اے.ایس. کا امتحان پاس کر لیا ہے اور وہ اپنے چھوٹے قصبے سے بڑے شہر انٹرویو کے لیے آئی تھی اور دس دن بعد وہ آج اس وقت عدالت کے احاطے میں اپنی شادی رجسٹر کروانے کی خاطر اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے!

اس کے اِردگرد درجنوں جوڑے بھی اپنی باری کا بے صبری سے انتظار کرتے ہوئے جج صاحب کے دروازے پر اُبھر چکے نمبر کو دیکھ کر پھول رہی سانسوں پر قابو پانے کی خاطر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر مسکرا رہے ہیں! جبکہ اپنے ٹوکن نمبر کے قریب آتے دیکھ کر رجنی اپنے ہونے والے شوہر سے بار بار اپنی دو شرطوں کے بارے میں کُرید کُرید کر جواب طلب کرنا چاہتی ہے مگر دیپک ہر بار اس کو اِدھر اُدھر کی باتیں یا لطیفے سنا کر ٹال دیتا ہے ــــ!

رجنی جواب طلب کرنے کی خاطر اپنی محسن ہیڈ نرس مسز شانتی سے بات کرنا چاہتی ہے مگر وہ ڈاکٹر عالمگیر اور ڈاکٹر کرانتی کی طرح یہ کہہ کر گئی ہے کہ تینوں گواہ، جن کی موجودگی میں شادی رجسٹر ہوگی! فون پر اطلاع ملتے ہی دس منٹ پہلے عدالت کے احاطے میں حاظر ہو جائیں گے اس لیے رجنی تذبذب کی لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کی آمد کا انتظار کر رہی ہے! رجنی کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر بم حادثے کے بعد دیپک نے اس کو گود میں اُٹھا کر بڑے شہر کے سب سے بڑے نرسنگ ہوم میں داخل نہ کرا دیا ہوتا اور وقت پر اپنا خون نہ دیا ہوتا تو آج اس وقت اس کے والدین، اس کے آبائی قصبے میں اُس کا دسویں دن کا شرادھ کروا رہے ہوتے ــــ!

یہ شادی نظریں ملتے ہی چاہت کے جذبے کی وجہ سے نہیں طے ہو پائی ہے بلکہ حالات ہی ایسی کروٹ لے چکے ہیں کہ شادی کے بغیر کسی اور حل کے بارے میں سوچا ہی نہیں جا سکتا ہے!!

پہل ملٹی کروڑ پتی کے بیٹے نے کی ہے اور رجنی نے مسز شانتی کے ذریعے اپنے والدین کے بارے میں دیپک سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے!

ہوا یوں تھا کہ رجنی اپنا چھوٹا سا بیگ سینے سے لگا کر جب ریلوے اسٹیشن کے باہر یو پی ایس سی کے دفتر جانے کی خاطر ایک آٹو رکشا کا انتظار کر رہی تھی تب اُس کے کانوں میں ایک گرج نما آواز گونج کر اس کے حواس چھین لی تھی! پھر لیا ہوا تھا وہ مسز شانتی نے رجنی کو اور دیپک نے ڈاکٹر

کرانتی کو بتایا تھا!

مسز شانتی نے جب دیپک کی گود میں ایک خون سے لت پت لڑکی دیکھی تھی تب یہ سوچا تھا کہ اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر ایک بہت ہی مہنگے نرسنگ ہوم میں علاج کے لیے لانے والا، فوری طور پر کیے جانے والے آپریشن کے لیے ایک موٹی رقم کا چیک دینے والا بلکہ آپریشن کے دوران اپنا خون دینے والا، رجنی کا کوئی رشتے دار ہوگا مگر تیسرے دن اپنے آپکو ایک عالیشان کمرے میں نرسنگ ہوم کی ملائم وشاداب مریضوں کی پوشاک میں پاکر وہ جان گئی تھی کہ کوئی اجنبی اس کو یہاں لے آیا تھا ــــ! یہ جان کر مسز شانتی انسانی رشتوں کی قدر کرنے والے ایک خُوبرو کروڑ پتی دیپک کی مدّاح بن گئی تھی!

اُس روز اخبار پر تاریخ دیکھ کر رجنی یہ جان گئی تھی کہ اس کے انٹرویو کی تاریخ نکل گئی ہے! وہ حادثے کا حوالے دے کر ایک بار متعلقہ افسران سے فوری طور پر رابطہ قائم کرنے کی خاطر جب مسز شانتی اور ڈاکٹر کرانتی سے مدد مانگ رہی تھی تب وہ جان گئی تھی کہ اس کے کھو چکے بیگ کے بارے میں کسی کو جانکاری نہیں تھی! اور وہ سکتے میں آگئی تھی کیونکہ اس کی ساری سندیں اور سرکاری چٹھیاں بلکہ اس کے کپڑے بھی بیگ میں ہی ہیں! سراسیمگی کے عالم میں وہ گھڑی بھی یاد آگئی تھی جب گھر سے نکلتے وقت ایک کالی بلّی نے اس کا راستہ کاٹ لیا تھا! تب ماں نے گھر میں داخل ہوکر، پوجا کرنے کے بعد، پرشاد کھا کر جانے کی ضد پکڑ لی تھی مگر باپ نے ایسے اقدام کو ترقی پسند سوچ میں رکاوٹیں ڈالنے والے ڈھکوسلے بتا کر یہ کہا تھا کہ مشرق میں اُلّو کو منحوسیت کی علامت سمجھا جاتا ہے جبکہ مغرب میں وہ خوش بدبختی کا پیغام دینے والا پرندہ ہے!

رفتہ رفتہ افسردہ رجنی اپنے آنسوؤں کو پی تو گئی تھی مگر ماں کی سوچ سمجھ پر یقین ہونے لگا تھا! مگر اچانک حالات نے کروٹ بدل دی تو اُس کو اپنے باپ کی باتوں میں امید کے عکس نظر آنے لگے!

ہوا یوں تھا کہ آٹھویں دن جب اُس کی پٹیاں اُٹھ چکی تھیں اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی دیپک بیگ لے کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا تھا!

اُس نے یہ بتایا تھا کہ اُس کی کار جس میں وہ رجنی کو نرسنگ ہوم لے آیا تھا اُس کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے اس لیے کار مرمت کے لیے گئی تھی ــــ! اور اُسی دن آچکی تھی! دراصل جب بم دھما کہ ہوا تھا رجنی دیپک کی کار کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی! دیپک نے اس کو فقط انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے جب کار میں ڈالا تھا تب اس کے اکڑ چکے بازوؤں میں اس کا بیگ تھا

جس کو ہٹا کر دیپک نے اس کا بہہ رہا خون روکنے کی خاطر اپنی قمیض کے دونوں بازو کاٹ کر، ابتدائی مرہم پٹی کی تھی! اور یوں ورک شاپ والوں نے بیگ میں رجنی کی سندیں دیکھ کر کار کی سپردگی کے وقت دیپک کو بیگ کی طرف متوجہ کیا تھا! ایک بار پھر انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے دیپک خود بیگ لے کر نرسنگ ہوم آیا تھا! تب اپنی پہلی ملاقات کے دوران رجنی جان گئی تھی کہ اُس کا مسیحا ایک کروڑ پتی والدین کا پچیس برس کا اکلوتا وارث ہے!

ڈاکٹر کرانتی دیپک کی بے لوث خدمت سے متاثر ہوا تھا جبکہ دیپک رجنی کی تعلیمی قابلیت کے علاوہ اُس کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوا تھا!

وجہ یہ کہ پہلی بار اُس نے رجنی کو خون میں لت پت ہو کر دیکھا تھا! پھر اس کے بیگ میں موجود اُس کے امتحان میں داخلے کے فارم پر چسپاں ایک تصویر دیکھ لی تھی اور اب نرسنگ ہوم کے شاداب پلنگ پر بیٹھی ایک نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے مگر پُرکشش جسم کی نمائش کرنے والے لباس میں دیکھ کر وہ چونک پڑا تھا! فوٹو میں اُس کے جو بال گویا تیل کے اثر سے چپکائے گئے تھے! وہی بال گھٹاؤں کی طرح اُس کے نورانی چہرے کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے! اور بار بار دیپک کی دلچسپی کا مرکز بنے جا رہے تھے!

پھر جب دیپک نے رجنی کو اپنائیت کا احساس دلایا تھا تب رجنی نے اشارتاً مدد مانگ لی تھی تاکہ وہ یو پی ایس سی کے افسران سے مل کر معقول حالات کا حوالہ دے کر اُس کی اُمید کو پھر ضیا بخش سکے! جواباً دیپک جاتے جاتے رجنی کو ایک ماڈل بن جانے کا مشورہ اشارتاً دے گیا تھا! گویا اس نے اپنی غیر دلچسپی کا اشارہ بھی دیا تھا!

کمرے سے نکلتے وقت، کمرے کے باہر جب ڈاکٹر کرانتی نے دیپک کو دیکھ لیا تھا تب اس نے ڈاکٹر عالمگیر، جو نرسنگ ہوم کی پیتھولوجی یعنی خون پیشاب وغیرہ کی جانچ کرنے کے شعبے کے سربراہ ہیں، کو دیپک کی بے لوث خدمات کے بارے میں قصیدے پڑھنے شروع کیے! مگر جونہی خون دینے کے بارے میں ذکر ہوا تھا تو ڈاکٹر عالمگیر چونک پڑا تھا! اور اُس نے فوری طور پر رجنی کے خون کی جانچ کرانے کی مانگ کر دی تھی!

جانچ ہوئی تو ڈاکٹر عالمگیر نے ڈاکٹر کرانتی کی مجبوری کی قدر کی تھی کیونکہ بلڈ گروپ اے بی نگیٹو بلڈ بینک میں ہوتا نہیں ہے اور بہت کم لوگوں میں پائے جانے والے اس گروپ کے خون خیرات کرنے والوں یا خون بیچنے والوں کو بلانے میں جتنا وقت لگ سکتا تھا اس دوران رجنی خون

کی کمی کی وجہ سے مر گئی ہوتی! مگر اس بات سے دونوں بے حد افسردہ ہیں کہ دیپک ایچ آئی وی پازیٹو ہے اور وہ یہ مہلک لاعلاج بیماری غیر دانستہ طور پر رجنی کو دے گیا ہے! گویا عذاب دہ کشمکشِ زندگی سے بچا کر اُس کو ایک معین عرصے کی شرم ناک اور ذلت کی زندگی دے گا!

ڈاکٹر عالمگیر دیپک کو جانتا ہے!

دیپک ایک سونے کا چراغ ہے جو اپنی باتی سے تیل چوس کر جلتا رہتا ہے!

جب تیل ختم ہو جاتا ہے تب وہ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا ہے! اکثر جنسی لذت کی طلب اس پر ویسی ہی کیفیت ٹھونس دیتی ہے جیسی ایک ڈرگس عادی پر ڈرگس نہ ملنے کی وجہ سے طاری ہو جایا کرتی ہے! بقول دیپک، وہ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے میں دلچسپی لیا کرتا تھا لیکن چند لالچی دلالوں نے اس کو ہر فن مولا کا خطاب دے کر، محفلیں سجانے کی عادت ڈال دی ہے! متواتر اپنے خرچے پر، پانچ ستارہ ہوٹلوں میں سجی سجائی ایسی محفلوں میں وہ بھی خاص طور پر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے گلوکاروں اور مصوروں کی صحبت میں رہ کر، وہ کبھی اعلیٰ صداکار بن جایا کرتا ہے اور کبھی چتر کار! یوں وہ لاکھوں روپے خرچ کر چکا ہے! پھر دو سال پہلے ایک لالچی دلال نے اس کی ملاقات اٹلی سے آئی ایک ایسی پوشاکوں کی ماڈل سے کرادی تھی جو نیوڈ پینٹنگز (Nude Paintings) میں دلچسپی لیا کرتی تھی —! جو قربتوں کا فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو دیپک کی ماڈل اور دیپک کو اپنا ماڈل بنا کر اس کو جنسی لذت کا چسکا بھی لگا گئی تھی!

دلال نے اُس کو ایک دلدل میں ڈال کر جان بوجھ کر بچاؤ کی ترکیبیں اپنے پاس رکھ لی تھیں!

پھر اچانک اس کو خون کی جانچ کرانی پڑی تھی اور اپنے انجام سے باخبر ہو کر تب سے ایک انتقامی جذبے کے تحت اس نے بیرونی ممالک کی حسیناؤں کو اپنے خرچے پر بُلا کر اُن کو بیماری بھی معاوضے کے ساتھ دینے کا ایک سلسلہ وار منصوبہ بنا ڈالا ہے!

مگر بقول ڈاکٹر عالمگیر وہ اب انتقامی کی بجائے ایک انقلابی بن جانے کا خواہشمند ہے!

دونوں نے رجنی کے بہت زیادہ قریب رہنے والی مسز شانتی سے بات کی تو رجنی بھی اپنے انجام کے بارے میں جان گئی تھی!

حادثے کے بعد اس کو اپنی ماں کے عقیدوں میں سچائی نظر آیا کرتی تھی اس لیے وہ بے ساختہ روتے ہوئے مسز شانتی کو بتا گئی تھی کہ وہ کنواری ہو کر مرنا نہیں چاہتی ہے!

رجنی کی معصومیت میں سچائی بھی تھی اور ذہنی بالغیت بھی —! ڈاکٹر عالمگیر نے رجنی سے کہا

تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک لڑکی جو اپنی سوجھ بوجھ اور ذہانت سے انڈین فارین سروسز کے لیے منتخب ہو چکی ہے وہ اپنی لاعلاج بیماری کا مقابلہ دلیری سے کر سکتی ہے! اس لیے تقدیر اور تدبیر کے دوراہے پر کھڑے مسافر کی طرح سمجھ لے! جو ہونے جا رہا ہے اس کو قبول کر لے! ایک اچھے ہم سفر کا ہاتھ پکڑ کر!!

اگلے دن ڈاکٹر عالمگیر جب دیپک کی شادی کی تجویز لے کر رجنی سے ملا تھا تب اُس نے اپنی ماں کے عقیدوں پر عمل کر کے شادی کو کاتبِ تقدیر کی ہونی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا تھا مگر شادی کے لیے دو شرطیں رکھ لی تھیں جو دیپک نے قبول کی ہیں! اور آج وہ دیپک سے ان کے بارے میں تفصیلاً جواب چاہتی ہے مگر وہ اپنائیت کا احساس دلا کر اس کو چھوٹی سی زندگی میں وہ تمام خوشیاں دلانے کا یقین دلاتا رہتا ہے جو بقول رجنی، ان کے موروثی قدیم مندر کی دیواروں پر نمائش کے لیے جو بھی جنت کے تصور کے بارے میں عیاں کیا گیا ہے!

سچ تو یہ ہے کہ ایڈز بیماری کے بارے میں جان کر اُس کی سوچ تقدیر اور تدبیر، اعتقاد اور اعتماد کے درمیان ایک پینڈولم کی طرح جھولتی ہوئی تب بھی محسوس ہوئی تھی اور اب بھی محسوس ہو رہی ہے!! لیکن اپنی شادی کے لیے رکھی دو شرطوں کو وہ ایک ایسی بازی سمجھ رہی ہے جس کی مدد سے تدبیر ہی تقدیر پر حاوی ہو سکتی ہے! رجنی نے شادی کرنے کی درخواست پر یہ سمجھ کر دستخط کر لیا تھا کہ شادی ایک ماہ کے بعد ہونی ہے اس لیے تب تک حالات کو سمجھا جا سکتا ہے! بدلا جا سکتا ہے!! لیکن ایک دن بعد ہی تاریخ ملنا یا تو دیپک کے رسوخ کا میوہ ہے یا پھر دونوں کی اچھی کارکردگی کی جزا جو دونوں کو اسی جنم میں مل گئی ہے!

رجنی تذبذب میں ہے کیونکہ شک کا کیل جو قلب میں اُتر کر دماغ کو منتشر کرتا رہا وہ اپنی ماں کی باتیں یاد آتے ہی نکل گیا!

ماں کہا کرتی تھی ہے کہ اس جنم میں پوجا پاٹھ یا اچھے کام کرنے کے عوض کڑی دھوپ میں سفر کرتے وقت سر پر ایک چھاتا یا اوڑھنے کے لیے چادر مل جاتی ہے! مطلب یہ کہ یہی سوچ رجنی کے لیے اپنے آپ کو دیپک کے حوالے کر دینے کی ایک ٹھوس وجہ تھی! مگر پھر تذبذب کیوں؟

اچانک اس کے خیالات کا تسلسل دیپک کی آواز سن کر ٹوٹ گیا ہے اور وہ چونک پڑی ہے! دیپک ڈاکٹر کرانتی کو فون پر یہ اطلاع دے چکا ہے کہ آدھے گھنٹے تک ان کی باری آنے کی توقع ہے___! پھر دیپک نے کسی کو فون پر یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایک گھنٹے تک اپنی بیوی کے ساتھ

سہاگ رات کی بجائے سہاگ دن منانے کے لیے آ رہا ہے! رات کی بجائے دن؟ — کیوں؟؟

رجنی جانتی ہے کہ وہ زمین سے کٹ کر ایک رجنی گندھا پھول کی طرح دیپک کے گلدان سے پانی چوس چوس کر مُرجھانے سے پہلے کِھلی کِھلی نظر آئے گی اور آخری سانس تک مہکتی رہے گی —! مگر شک کی کیل نے پھر کرید شروع کر دی تو اُس نے فیصلہ کن لہجے میں دیپک سے اپنی دونوں شرطوں کے بارے میں جواب مانگا! اور یہ کہہ کر کہ جواب سن کر ہی جج کے سامنے حاظر ہو گی! تب دیپک نہایت میٹھی زبان میں بول پڑا!!

"رجنی اب ہم ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہونے جا رہے ہیں اس لیے یہ شرط کہ ہم بچے کو جنم نہیں لینے دیں گے ایک بے شکل شرط ہے!"

ایک بیابان میں ایک پرندہ ایک بیج چھوڑ آتا ہے اور وہ ایک درخت بن جاتا ہے جبکہ زرخیز زمین میں بوئے بیج کو پرندے اپنے شکم میں ڈال دیتے اور کاشتکار فصل کا انتظار کرتا رہتا ہے!

ہم کیسے جان پائیں گے کہ کون کب اور کیوں ہمارے گھر میں جنم لے گا!!

جو پیدا ہو گا اپنا مقدر لے کر پیدا ہو گا! اور اگر کسی نے جنم لیا ہی نہیں ہے تو اس کے لیے جنم دینے والے کو ہی پریشان ہونے دو!!

تمھاری دوسری شرط بھی بے معنی سی لگتی ہے! اوّل تو وہ دفتر ہماری شادی رجسٹر ہونے تک بند ہو چکا ہو گا، دوم یہ کہ ایک کروڑپتی کی بیوی سرکاری ملازمت کیوں کرنے لگی؟ بیماری لگ چکی ہے! دونوں کا سفر لمبا تو ہو گا نہیں —!! چھوٹی سی دُنیا میں میاں بیوی محبت کی انتہا نہ دیکھ لیں تو دونوں کو تشنگی کا احساس شدت سے تڑپاتا رہے گا —! اُس کو زیادہ جو اپنے ہم نفس کو وِداع کر کے تنہا رہ سکتی ہے! کون جانتا ہے کہ کون، کس کو الوداع الوداع کہے!!

دیپک کچھ اور کہہ کر اپنے ارادوں کو صحیح ٹھہراتا لیکن جونہی اس نے ڈاکٹر عالمگیر، ڈاکٹر کرانتی اور مسز شانتی کو عدالت کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے! وہ دوڑ کر اپنے گواہوں کا استقبال کرنے کے لیے چل پڑا ہے!!

رجنی ایک دانشور ہے اور وہ سمجھ گئی ہے کہ دیپک ایک سونے کا چراغ ہے، ایک پانی بھرا گلدان نہیں ہے! وہ رجنی گندھا پھول کو شاخ سے کاٹ کر تر و تازہ رکھنے کی خاطر پھول کو آخری سانس تک پانی نہیں پلا دے گا بلکہ اس کی نمی کو چُوس کر بدبودار بنا دے گا بلکہ اَدھ کھلے شگوفوں کو وہ جھلس دے گا! اس کے جل رہے ہونٹوں کی طرح!

رجنی کا ماتھا ٹھنکا ہے! — سہاگ دن اگر حمل ٹھہر گیا تو کیا وہ بچہ گرا کر اپنے سنگین گناہ کے لیے جہنم میں جائے گی؟

بصورت دیگر کیا وہ اپنی اولاد کو بچپن میں ہی مرجانے کے لیے جنم دے گی؟

اس کے سامنے ایک دوراہا ہے!

ایک پر باپ آوازیں دے رہا ہے! رجنی تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالو! اعتماد کے سہارے، بلند عزم سے، ایک نیا راستہ کھوج لو — تمھاری منزل یو پی ایس سی کا دفتر ہے!!!

دوسرے پر ماں سمجھا رہی تھی — ایک اجنبی کی طرح ملا دیپک ستیہ وان ہے اور تم ساوتری! رُک جاؤ اور اس کو ملک الموت سے بچالو! وہ جنم جنم سے تمھارا ہے! یا اس جنم میں تمھارے پچھلے جنم کا قرض اُتار رہا ہے یا تم پر اُدھار کا بوجھ لاد کر اگلے جنم میں وصول کرے گا! عقیدت کے آئینے میں دیکھو! حقیقت سے جُدا ہے! ہے نا؟ جو نظر آ رہا ہے وہ چشمہ نہیں ایک سراب ہے!

ذہنی انتشار کی وجہ دونوں کے جنم سے وابستہ گروہوں کی گردش ہے! یہ ایک آزمائش بھی ہوسکتی ہے!

آزمائش پر کھرے اتر گئے تو جزا بھی مل سکتی ہے!

تم دونوں اپنی بیماری کو ہرا بھی سکتے ہو! عقیدت کا راستہ اپنالو!

رجنی دیپک کا اشارہ دیکھ کر دوڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے!

شادی کے تینوں گواہ اس کو ایک ہرنی کی طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں!

رجنی جج صاحب کے دروازے پر اُبھر چکا اپنا ٹوکن نمبر دیکھ کر ہاتھ میں دبوچا ہوا ٹوکن پھینک کر، دروازے کی طرف جانے کی بجائے ایک آٹو رکشا میں بیٹھ گئی ہے!

تینوں گواہ اس کو دیکھتے ہی رہ گئے ہیں جبکہ دیپک اپنی کار میں آٹو کا یوں پیچھا کر رہا ہے گویا ایک شیر ایک ہرنی کا تعاقب کر رہا ہو!

رجنی یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیپک کو اپنی کار میں آگے جاتے ہوئے دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہی ہے

ٹریفک جام کی وجہ سے کار اس کے سامنے رُک گئی ہے اور یوں دیپک بھی اس کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے کیونکہ اُس کی کار میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی ہے!

یہ دیکھ کر اس کو اپنے باپ کی باتیں یاد آتی رہی ہیں!

راستے میں کانٹے بچھائے گئے ہیں اور تم سے کہا جا رہا ہے کہ اعتقاد کی پٹی باندھ کر اوّل تو بینا ہو کر نابینا بن جاؤ اور اور گروہوں کی گردش اپنے حق میں کرنے کی خاطر کانٹوں پر ننگے پاؤں چلو!

کیوں؟ کیوں؟؟

آسمان پر نظر آ رہے تاروں اور سیاروں کو زمین پر رہنے والے کے مقدر سے جوڑ کر ان کی گردش کا نام دے کر تدبیروں کو بے ہودہ گردشوں کی آلودگی کا شکار مت بنالو!؟

تم وہ مت کرو جو میں کرتا رہتا ہوں! بلکہ وہ کرو جو میں تمھیں سمجھاتا رہتا ہوں! ایک انقلابی رہبر کی طرح!

ہاں میرا قول عمل سے بہت دُور ہے!

میں وہ سبزی خورڈ کاندار ہوں جو انڈے بیچتا ہے!!

OO

آزمائش

یہ ایک آزمائش ہے یا ایک سزا؟ اور آزمائش کی آڑ میں بھگوان اپنے ہی نیک بندوں کو طرح طرح کی تکلیفیں بلکہ اذیتیں کیوں دیتا رہتا ہے؟

کہتے ہیں جن کو اس جنم میں آزمانے کی خاطر سزا دیتا ہے ان کو بطور جزا پرلوک کا سکھ دینے کا بھروسہ دیتا ہے!

بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ مہارِشی وِشوامتر نے ایک نیک راجا ہریش چندر سے آزمانے کے لیے راج پاٹھ چھین لیا اور ظلمات کی انتہا تب ہوئی تھی جب ہریش چندر کی بیوی تارامتی ان دونوں کے اِکلوتے بیٹے رُوہت کی لاش جلانے کے لیے شمشان میں لے گئی تھی تب مجبور شوہر نے لاچار بیوی سے جلانے کے لیے ایک سکّہ مانگا تھا جو نہ ملنے کی وجہ سے بیٹے کی لاش زمین پر پڑی رہی تھی اور اُس کے والدین ایک اذیت ناک کرب سے گزر رہے تھے! اگر آزمائشیں ایسی ہوں تو——

نندو اپنے آپ کو سمجھاتا رہا مگر دُکھ درد کو کیا سمجھا جا سکتا ہے! ہریش چندر کی کہانی تو ایک سنی سنائی اساطیری کتھا ہے مگر جو بھی نندو پر گزری ہے وہ تو ایک سچّی مگر دردناک کہانی ہے! وہ پوجا پاٹھی برہمن تو ہے مگر اس کا تعلق برہمنوں کے اُس طبقے سے ہے جو دسویں دن کے شرادھ پر مُردے کے کپڑے، چھتری، بستر، برتن وغیرہ لے کر آتماؤں کی شانتی کے لیے دُعا کرتے ہیں! یہ وہ برہمن ہوتے ہیں جو نہ شادی بیاہ کے لیے لگن کرواتے ہیں اور نہ ہَون وغیرہ کرواتے ہیں بلکہ یہ پنڈ دان یا شرادھ بھی نہیں کرتے ہیں بس دسویں دن کے ندی یا دریا پر ہو رہے شرادھ پر بلائے جاتے ہیں! پھر مرے ہوئے انسان کے کرم کرنے والے کے سامنے بٹھا کر اُن کو یہ بتایا جاتا ہے کہ جو مر گیا اس کی روح اس شخص میں ہے اس لیے اس کو عزت دے کر کھلاؤ پلاؤ اور اُس کی اپنی وہ چیزیں یا وہ ذاتی سامان جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر چل پڑا ہے اُس کے حوالے کر دو تا کہ وہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جائے! اور وہ پھر چلا جاتا ہے! آج وہ بھی یہی کام کرنے گھاٹ پر آ کر چل

پڑا تھا! مگر ریتی رواج کے مطابق نندو چاریہ کو نہ تو کہیں رُکنا تھا اور نہ پیچھے مُڑ کر شرادھ کرنے والوں کو دیکھنا تھا مگر نندو گھاٹ سے چند قدموں کی دوری پر رُک بھی گیا اور پلٹ کر اُس لڑکے کو دیکھنے لگا جو اپنے باپ کا شرادھ کروا رہا ہے! ظاہر ہے گھاٹ پر سنسنی پھیل گئی کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا ہے جب علاقے کے یہ کام کرنے والے واحد شخص نندو چاریہ جی سے ایسی غلطی ہوئی تھی اس لیے بزرگ لوگ وَسوسوں کے دلدل میں دھنس گئے ہیں، نندو سے رُک جانے کی وجہ پوچھنے کی کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی! بلکہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی گھاٹ پر جمع لوگوں کو وہم کی اندھی غار سے نکالنے کی جرأت نہیں کرر ہا تھا! اس لیے وہی تماشہ تھے اور وہی تماشائی! مگر سبھی کی نظریں نندو چاریہ جی پر یوں جمی ہوئی تھیں گویا واقعی مرحوم دیپ کمار شرما کی روح کچھ مانگ رہی تھی! وِداع ہونے سے پہلے نندو جب اپنے لمبے سفید بالوں اور لمبی سفید داڑھی میں آیا تھا تب وہ ایک مہاتما جیسا نظر آیا تھا اور اب اُس کے موٹے شیشوں والی عینک میں اُس کی آنکھیں سبھی کو ڈراؤنی نظر آ رہی تھیں! گویا انسان ایک بھینسا نظر آ رہا تھا!

نندو کا باپ بھی یہی کام کیا کرتا تھا! یعنی یہی اُن کا خاندانی پیشہ ہے! شہر کے حدود کے باہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا کبھی، جہاں ہر ذات کے لوگ رہتے تھے بلکہ اب بھی رہتے ہیں اور سبھی نندو کو تب بھی اور اب بھی جانتے ہیں! اُن میں چند لوگ پاس کے گاؤں کے پرائمری اسکول میں اُس کے جماعتی بھی ہوا کرتے تھے! اُن میں بیشتر لوگ تب بہت غریب تھے بلکہ اب بھی غریب ہیں! ان کے کپڑے پھٹے پُرانے اور گاؤں کے درزی کے بنائے ہوئے ہوا کرتے تھے مگر نندلال شرما کے کپڑے سائز میں بڑے تو ہوا کرتے تھے مگر عمدہ ہوا کرتے تھے! رنگ برنگے ہوا کرتے تھے! اور یوں نظر آیا کرتے تھے جیسے جھاڑیوں میں کھلا ایک گلاب کا پھول ——!

برسات کے موسم میں اسکول میں وہ ایک ہی لڑکا تھا جس کے سر پر چھتری ہوا کرتی تھی یا پھر بڑے سائز کے رین کوٹ سے جڑی ٹوپی! تب وہ نندلال شرما تھا جو ایک ذہین لڑکا تھا! اُس سے رشک کرنے والے بھی تھے اور حسد کرنے والے بھی! ایک رشک کرنے والے کے باپ نے اُس کو یہ بتا دیا تھا کہ نندلال برہمن ہے اس لیے ایک ہریجن سے آگے نہیں جا سکے گا مگر حسد میں جل رہے بچوں کے والدین نے ایک بھیانک آگ کو یہ کہہ کر بجھا دیا کہ نندلال چندو چاریہ جی کا بیٹا ہے اور اُس کے کپڑے مُردوں کے کپڑے ہیں!

یہ جان کر سبھی مل کر اُس کو چڑاتے رہتے تھے!مُردوں کے کپڑے پہن کر اسکول کا سب سے گورا لڑکا رنگ دار کپڑوں میں ایک بھوت ہے! وہ جو کپڑے پہنا کرتا ہے وہ واقعی مُردوں کے تھے، یہ وہ جان گیا تو اُس کو اپنے کپڑوں سے نفرت ہونے لگی تھی بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی ڈرنے لگا اور پھر جب اُس کو یہ پتہ چلا کہ یہ اُن کا خاندانی پیشہ ہے تب وہ تذبذب کا شکار ہو کر اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا اور نتیجتاً جب اگلی بار اُس کا باپ معمول کی طرح اپنے ساتھ کپڑے، لحاف، ایک قیمتی کمبل اور ایک کوٹ لے آیا تو باپ بیٹے میں زبردست جھگڑا ہوا، باپ فخر سے اپنے کام کی تعریفیں کر کے نندو کو بار بار سمجھاتا رہا مگر بیٹا ہر بار اپنی ضد پر اڑ کر ایک دن گھر سے بھاگ ہی گیا اور شہر کی ایک نئی کالونی میں دودھ، دہی اور پنیر بیچنے والے کی دکان میں کام کرنے لگا! بطور ایک نوکر اُس نے اپنے مالک کا دل جیت لیا! تب نندلال شرما مشکلاً چودہ سال کا تھا! نہا دھو کر، پوجا پاٹھ کر کے جب ایک سفید کرتے پاجامے میں وہ اپنے مالک کی جگہ دُکان پر گاہکوں کی نظروں کے سامنے آیا تو دُکان گویا چمک جایا کرتی تھی! ایک تو اس لیے کہ دُکان کا مالک کبھی کوڑھ کا مریض تھا! حالانکہ اب وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو چکا تھا مگر ہاتھوں پر چند بدنما داغ نظر آیا کرتے تھے! داغ دار ہاتھوں سے وہ کام تو کیا کرتا تھا لیکن چند نفسیاتی وجوہات کے سبب گاہک قریب آ کر اپنی اُبکائی روک کر دُور ہو جایا کرتے تھے! دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ نندلال بہت سُریلا تھا اور شکل صورت سے بہت خوبصورت تھا، اس لیے گاہک نندو کو دینو مہاجن یعنی حلوائی کا بیٹا سمجھ کر اس سے خوب گھُل مِل جایا کرتے تھے! کالونی نئی تھی، آدھی بن چکی تھی آدھی بن رہی تھی! ساتھ ساتھ رہنے والے بھی اجنبیوں کی طرح پہلے پہل ملا کرتے تھے مگر بعد میں ماضی کو کریدے بغیر وہ نیک پڑوسی بن جایا کرتے تھے! اس لیے جان پہچان بھی نئی ہوا کرتی تھی! ذات پات کے بارے میں کوئی تناؤ نہیں ہوا کرتا تھا! کون ہندو، کون مسلمان، کون برہمن، کون ہریجن، ان موضوعات پر امیر لوگ ویسے بھی بحث نہیں کرتے ہیں، کیونکہ ان کے لیے رُتبہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے نا؟ اس کا پورا پورا فائدہ لے کر نندو پھر نندلال بن گیا تھا! نندلال شرما ولد چندن داس شرما! دُکاندار نے نندلال کو برج کے نندلال کرشن کنہیا کی طرح چمتکاری پایا تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی پڑھائی جاری رکھوا کر نندلال کو ہی مٹھائیاں بنانے کا ہنر سکھا دیا! اور چند برسوں میں ان کی دُکان مٹھائی محل کے نام سے ایک مشہور دُکان بن گئی!!

دُکاندار ایک اچھا آدمی تھا اس لیے اس نے نندلال کو گھر دیا اور اس کی شادی ایک گاؤں کی گونگی بہری مگر بے حد خوبصورت لڑکی سے کروادی! دراصل یہ نندلال کی ہی پسند تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی اُس سے اس کے والدین کے بارے میں کُریدتی رہے، کیونکہ نندو نے اپنے محسن دُکاندار کو بتایا تھا کہ وہ دُور ایک ایسے پہاڑی علاقے سے آیا ہے جہاں جانے کے لیے دو دن بس میں اور پھر تین دن کا پیدل سفر طے کرنا پڑتا ہے! یہ پہلا اور آخری جھوٹ اس نے اس لیے بولا تھا تا کہ نندو چاریہ جی اس کا تعاقب نہ کرتا رہے!

دُکاندار چل بسا تو اس کے بیٹوں نے نندلال کے ہی بل بوتے پر سرکاری افسری ٹھکرا کر دُکانداری کو ہی ترجیح دی! ان برسوں میں وہ اپنے گھر جان بوجھ کر اس لیے نہیں گیا کہ اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنا خاندانی پیشہ نہ اپنانا پڑے! اُس کے خاندانی پیشے کے بارے میں صرف ایک گوجر کو معلوم تھا جو اُن کی دُکان پر دودھ دینے آیا کرتا تھا! لیکن نندلال کے کہنے پر وہ خاموش رہا کرتا تھا! ایک دن گوجر نے ہی تو اس کو یہ بتایا تھا کہ اس کے والدین ہری دوار گئے تھے اور وہاں ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں! اس دردناک سانحہ پر بھی وہ اپنے گھر نہیں گیا تھا! مگر اُس روز وہ اتنا رویا تھا کہ اس کی گونگی بہری بیوی بھی سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساس سسر مر گئے ہیں!! اس لیے تب وہ بھی اپنے دودھ پیتے بچّے کو ساتھ لے کر اپنے پتّی کے ساتھ ہری دوار گئی تھی! اور ایک اچھی سنسکاری بہو کی طرح اپنے پتی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ساس سسر کا شرادھ کروایا تھا! کیونکہ ان کے پاس والدین کے کپڑے تھے نہیں اس لیے انھوں نے اپنے سارے کپڑے بھکاریوں کو دے دیے تھے بلکہ نئے کپڑے بھی دان کیے تھے! اُس کے بعد نندلال خوش تھا کہ اس کو کسی بھی وجہ سے اپنے گاؤں لوٹ کر نہیں جانا پڑے گا اور اپنے باپ کی جگہ وہ کام نہیں کرنا پڑے گا جس سے نفرت کرنے کی وجہ سے اس کو گھر سے بھاگ جانا پڑا تھا! مگر اُس کو رنج اس بات کا تھا کہ وہ اپنے والدین کو اَگنی دان نہیں دے سکا تھا!

وقت گزرتا گیا، ان کا مٹھائی محل اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ شہر کے لوگ دُور دُور سے مٹھائیاں خریدنے آیا کرتے تھے! نندلال تجربے کر کے عام مٹھائیاں بھی خاص طریقے سے بنا کر اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ جن مٹھائی بنانے والوں کی بزنس متاثر ہو گئی تھی وہ اس کو لالچ دے کر اپنے پاس کھینچ کر لانے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن نندلال اپنے محسن کی آتما کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس

لیے وہ ان سب کو مایوس کر کے ان کے انتقامی جذبے کو اُکساتا رہا! وہ تاک میں بیٹھ کر کسی بھی طریقے سے اُسے مٹھائی محل سے نکالنے کے چکّر میں تھے! نندو کے خلوص کو مالکوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا بلکہ اس کی خدمات کو دیکھ کر نندلال کے بیٹے کو ڈونیشن دے کر انجینئرنگ کی سیٹ دلا کر اس کی ٹریننگ کا خرچہ بھی اپنے ذمّے لیا تھا!

وہ دن نندلال کے لیے بہت ہی اہم تھا جب اُس کے انجینئر بیٹے کو سرکاری نوکری دلانے والے نے ہی اس کو اپنا داماد بنالیا تھا! جب اُس کے پوتے کے جنم دن پر شہر کے تمام عزّت دار لوگ اس کو آشیرواد دینے آئے تھے تب اُس دن اس کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم چندو چاریہ جی کے بیٹے نندو چاریہ جی کو اب لوگ شردھ کمار شرما کے دادا کو پنڈت نندلال شرما کے نام سے یاد کرتے رہیں گے! یعنی اپنا گاؤں چھوڑتے وقت اُس نے جو خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیر نظر آئی تھی! جنم کی بجائے کرم پر انسان کی شناخت ہو، یہی تو وہ چاہتا تھا! اس کو اس بات پر بے حد خوشی تھی کہ اُس کے ساتھ کام کرنے والے برہمن، کھتری، مہاجن، ہریجن اور مسلمان بھی کاریگر کے نام سے جانے جاتے تھے! اور وہ سب ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے لیکن اپنے مطلب کے لیے ذات پات اور ماضی کے گندے انڈوں کو اُچھالنے والے، نندلال کو ننگا کر کے انتقام لینے والے کہاں اُس کا یہ نیک خیال و ثمر آفریں عمل قبول کرتے؟ اس لیے وہ نندو کے پیچھے ہی پڑ گئے تھے! ان کے مٹھائی محل کی مٹھائیاں جب شہر سے درآمد ہونے لگی تھیں تب شہر کے تمام مٹھائیاں بنانے والے ایک ہو گئے تھے اور نندلال کے ماضی کو کُریدنے میں کامیاب ہو گئے تھے پھر میدانِ جنگ میں ایک نئی مہابھارت شروع کرنے کے لیے کود پڑے تھے!

مٹھائی محل پر کوئی بھی اثر نہیں پڑا تھا مگر نندلال کو اچانک نندو چاریہ جی سے ڈر لگنے لگا تھا، خاص طور پر یہ سوچ کر کہ اگر اس کا بیٹا جان گیا کہ اس کا دادا چندو چاریہ جی تھا تو کیا ہوگا؟ — ! اور اُس کے دشمنوں نے نندو کو نندلال کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اس سے پہلے کہ پھر حملہ ہوتا اور مٹھائی محل میں شگاف پڑ جاتے وہ اپنے بہو بیٹے سے ملا تھا! ایک فیصلہ کر کے جو اُس کے لیے بُرا تو تھا مگر اس کے بیٹے اور پوتے کے لیے مفید تھا! خوش قسمتی سے اس کے بیٹے کی پوسٹنگ ایک دُور دراز پہاڑی علاقے میں تھی اور وہ اپنے شہر میں ہو رہی مٹھائی کے تاجروں کی سیاست سے بے خبر حالانکہ بیٹا چاہتا تھا کہ باپ حلوائی کا کام چھوڑ کر اُس کے ساتھ رہے مگر باپ مذاق میں بات ٹال

دیا کرتا تھا!

مگراس بار ایسا نہیں ہوا! نندلال نے اپنے بیٹے پر ایک ایسی جنگ تھوپ دی تھی کہ اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا اور نندلال یہی تو چاہتا تھا! نندلال یوں تو اس کوٹی.وی پر کھانا بنانے والوں کی مثال دے کر کہا کرتا تھا کہ میں تو حلوائی نہیں ہوں چیف ہوں مگر اِس بار اس نے اپنے بیٹے کو اُکسانے کے لیے کہا تھا کہ اگر وہ نوکری چھوڑ کر ایک نیا مٹھائی محل بنا دے تو باپ کی ایک ہی خواہش حسرت میں نہیں بدل جائے گی! پھر وہ اپنی بیوی کو ساتھ کے گھر چھوڑ کر، سارے رشتے ناطے بندھن توڑ کر پہاڑوں میں جا کر رہنے کی اطلاع دے گیا کر چلا گیا تھا!

یہ عمل صرف اپنے آپ کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا! سچ تو یہ ہے کہ نندو چار یہ جی اپنے گاؤں میں رہ کر بھی اپنے بیٹے اور پوتے کے قریب رہنا چاہتا تھا! یعنی گلشن نظر آئے یا نہ آئے، ہوائیں تو مہک لے آئیں گی نا! یہ سوچ کر وہ اپنے شکستہ دل کو تسلیاں دیا کرتا تھا! مٹھائی محل کے مالکوں کو جب یہ جانکاری ملی کہ ان کے رقیبوں نے نندو چار یہ جی کے خوف سے نندلال کو رُسوا کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے تب وہ شاید اپنا ردِعمل ظاہر کرتے مگر یہ جان کر کہ نندلال کے رہنے یا جانے سے مٹھائی محل کی مضبوط بنیاد ہل نہیں سکتی تو انھوں نے ایک باپ کی طرح پیار کرنے والے ایماندار ہنر مند کاریگر کی کہانی ختم کر کے ورق ہی اُلٹ دیا تھا! نندو سے نفرت کرنے والا نندلال شرما جب اپنے گاؤں کے مکان میں داخل ہوا تھا تب اُس نے ایک آواز سن لی تھی! گویا کوئی اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا!

''اچھا ہوا جو گھر میں پھر دیا جل گیا! وہ دیا جو بھڑک رہی آتماؤں کو روشنی دکھا کر اَشانتی کی تاریکیوں سے نکال کر سکون کے محفوظ دائرے میں لے جاتا ہے!!—!!''

نندو نے جب جھانک کر دیکھا تھا تو اُسی گوجر کو دیکھا جو یہ جانتا تھا کہ مٹھائی محل کا نندلال شرما ہی اُس کے بچپن کا دوست نندو چار یہ جی ہے! یہ گوجر نورالدین تب بھی دودھ والا تھا اور اب بھی دودھ والا ہے! وہ تب بھی نندو کا کئی یاروں میں ایک یار تھا اور اب اس کا واحد دوست ہے! ان کے ساتھ پڑھنے والے گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہتے ہیں کوئی سرکاری ملازم تو کوئی دُکاندار، سپاہی یا ٹھیکیدار! اس سے پہلے کہ نندو اُس سے کچھ پوچھتا گوجر نے خود ہی اس کے سوالات کے جوابات دے دیے تھے!

''نندو تُو سوچ رہا ہوگا کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے یہ کیسی باتیں کر رہا ہوں! ارے میرے یار میں اپنے عقیدوں پر ہی یقین رکھتا ہوں! پانچ وقت سجدہ کرتا ہوں! نہ میں ہندو بن گیا ہوں اور نہ تم مسلمان بن جانا! میں تو اُس باپ کی بات دُہرا رہا ہوں جس کا بیٹا ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں فوت ہو گیا تھا اور وہ خود تمھارے باپ کو اُس کے دسویں دن کے شرادھ پر، دان لینے کی التجا لے کر آیا تھا کیونکہ اُس شام بھی اس گھر میں دِیا جل رہا تھا! اور وہ میں نے جلایا تھا! معلوم ہے کیوں؟ وہ یوں کہ تمھارا باپ ہری دوار جانے سے پہلے گھر کی چابیاں مجھے دے گیا تھا! مندر کی چابیاں بھی! وہ لوٹ کر نہیں آیا تو گاؤں والوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ مُردوں کے کپڑے لینے والا سانپ بن اس ویران گھر میں رہتا ہے! پھر میں نے سوچا کہ گھر کو آباد رکھنے کے لیے یہاں ہفتے میں ایک رات تو گزار کر دِیا جلایا کروں گا! میں رات بھر دِیا جلا کر تمھارے باپ کی طرح بت پرستی تو نہیں کیا کرتا تھا مگر عبادت ضرور کیا کرتا تھا! آج بھی دِیا جلانے آیا تو تمھارا اچھل رہا سایہ دیکھ کر پہلی بار چونک پڑا! یہ کیا! مرحوم چندو چار یہ جی گھر میں آیا ہے؟ نندو! ان لمبے بالوں اور لمبی داڑھی میں تو بالکل اپنے باپ جیسا لگ رہا ہے! جب داڑھی اور بال بالکل سفید ہو جائیں گے اور یہ پاجامہ اُتار کر دھوتی پہننا شروع کرے گا تو باپ جیسا نہیں چندو چار یہ جی ہی نظر آئے گا! اللہ کی قسم لوگ سوچیں گے کہ ان کے سامنے نندو چار یہ جی نہیں بلکہ چندو چار یہ جی کھڑا ہے! اور تمھیں دان لینا پڑے گا!!''

گوجر کو گلے لگا کر اس شام نندو آخری بار رویا تھا! اور پھر اگلی صبح وہ نندلال کو اپنے ذہن سے نکال دینے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر وہ اپنی شناخت کو پردے میں رکھنے کی خاطر کہیں نہیں جایا کرتا تھا! مگر اپنی جگہ ایک دُور کے رشتے دار کو گھاٹ پر بھیجا کرتا تھا! لوگ سمجھ رہے تھے کہ چندو چار یہ جی کا پوتا ہے! دان میں جو بھی آیا کرتا تھا وہ اس کا رشتے دار ہی لے جایا کرتا تھا! پھر دس سال بعد جب اس کی بیوی کو سانپ نے کاٹ کر اپنے ساس سسر کے پاس بھیج دیا تو وہ رویا نہیں تھا بلکہ اس نے خود ہی اس کا انتم سنسکار کیا تھا اور شرادھ بھی کیے تھے! بیوی کے مر جانے کے بعد اس نے اپنی ساری جائیداد بیچ ڈالی تھی اور ایک دن اپنے بیٹے کے گھر تب گیا تھا جب اس کا بیٹا شہر سے باہر تھا اور پوتا کالج گیا ہوا تھا!

بیٹا ٹور پر جا رہا ہے یہ وہ تب جان گیا تھا جب وہ ایک دن پہلے ایک وفد کے ساتھ افسرِ اعلیٰ

سے پینے کے پانی کو دستیاب کرنے کے لیے گیا تھا! بیٹے نے باپ کو نہیں پہچانا تھا! حالانکہ دونوں آمنے سامنے تھے!! باپ کا دل شاد بھی تھا اور ناشاد بھی!

اُس روز اُس کی بہو نے اُس کو پہچان لیا تھا وہ بھی شکل وصورت کی بجائے نندو کی سُریلی آواز سے! نندو وہاں تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا مگر جانے سے پہلے ایک بیگ میں زیورات اور نقد چار لاکھ روپے ڈال کر اُس میں ایک خط رکھ دیا تھا! اور خط کی مختصر تحریر میں یہ لکھا تھا کہ میرے پوتے کو ٹریننگ پر بھیجنے کے لیے اگر ڈونیشن کی ضرورت پڑ جائے تو یہ زیور بھی بیچ دینا! تمھاری مرحومہ والدہ کے ہیں اور روپے میری ساری جائیداد کی قیمت ہے! تمھارے بزرگوں کی زمین پر اب ایک کالونی بن رہی ہے نا! مگر کہاں! یہ میں نہیں بتا سکتا ہوں!'' پھر بیگ کونے میں رکھ کر وہ اچانک غائب ہو گیا تھا!

دوسرے دن وہ اپنے گھر میں سمادھی لے کر بیٹھ گیا تھا! رشتے دار کو اپنے گھر بھیج کر! ایک سنیاسی کی طرح روح کو جسم سے الگ کر دینے کی خاطر! مگر ایک صدا نے اس کو چونکا دیا تھا اور یوں اس کی دس دن کی تپسیا بھنگ ہو گئی تھی!!

''نندو! ایک شرادھ میں جانا ہے! تمھیں لینے کے لیے کار آئی ہے! بے چاروں پر قہر ٹوٹ پڑا ہے! تمھارا رشتے دار ہے نہیں! تم کو ہی جانا پڑے گا! دوست! عقیدوں کی باتیں ہیں اب تمھارے دان لینے سے روح کو سکون ملتا ہے یا نہیں یہ تم جانتے ہو! اب وہ رو رو کر التجا کر رہے ہیں تو اس بار جاؤ! انسان کے عقیدوں کی خاطر!''

نندو اپنی سمادھی توڑنا نہیں چاہتا تھا مگر گوجر کے اصرار پر وہ تب چل پڑا جب اس نے یہ بتایا کہ دس دن پہلے ہوئی موت ایک حادثے کی وجہ سے ہوئی ہے اور اگر وہ دان لینے کے لیے نہیں جائے گا تو مرحوم کی آتما بھٹکتی رہے گی! خاص طور پر تب جب گوجر نے کہا کہ اگر تمھارے عقیدوں کے مطابق یہ سچ ہے کہ بھٹکتی ہوئی آتما ایک بھوت یا پریت بن جاتی ہے تو تمھیں جانا ہی ہوگا! نندو کا دل تیز رفتار سے دھڑکنے لگا اور وہ کار میں بیٹھ گیا! اور اپنی نرالی کیفیت بھانپ کر خود بھی حیران و پریشان تھا!

گھاٹ پر چند جانے پہچانے چہرے دیکھ کر وہ چونک تو پڑا تھا مگر کوئی اس کو پہچان نہ لے اس لیے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے اور منہ چھپا لیا تھا! پھر وہ وقت آیا جب وہ اپنے پوتے کے

سامنے بیٹھ گیا اور شرادھ کرانے والے پنڈت نے اُس کے پوتے سے کہا!

''تمھارے سامنے تمھارے باپ کی آتما ہے جو اس جسم میں بیٹھی ہے ان کی سیوا کرو! کھلاؤ پلاؤ اور اُن کی چیزیں ان کو دے کر وِداع کرو!''

سب کچھ رسم کی ضرورتوں کے مطابق ہوا! اچانک جب ایک جانا پہچانا بیگ نندو کے کندھے پر رکھا گیا تو پوتے نے کہا کہ یہ ''بیگ میرے دادا میرے پاپا کو دینے کے لیے دے گئے تھے! لیکن پاپا لوٹ کر آئے نہیں؟''

یہ آخری جملہ نندو کے کانوں میں گونجتا رہا تو اُس کے قدم رُک گئے تھے اور ایک دادا نے اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے مڑ کر دیکھا تھا!!

شرادھ کروانے والے پنڈت نے جب نندو کو رسم یاریت کی اہمیت کا احساس دلایا تب وہ زمین پر یوں گر گیا گویا ایک چنار کا درخت کھوکھلا ہو کر آری کے دانتوں سے کٹ کر زمین پر گر پڑا تھا!!

جو بھی ہو چکا تھا اور جو بھی ہو رہا تھا، ایسا پہلے نہ کسی نے سنا تھا اور نہ دیکھا تھا! ایک رنجیدہ ماحول ایک سنسنی خیز ماحول بن گیا تھا! گوجر نے نندو سے گر جانے کی وجہ جاننا چاہی تو نندو نے اپنی مخصوص آواز میں جواب دیا کہ اب زندگی کا بوجھ اٹھایا نہ جائے گا! ایک اور آزمائش؟ کیوں؟ کیوں!!

نندو دریا کے کنارے پڑے پتھروں پر گر کر چل بسا!

یہ دردناک منظر دیکھنے والے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ جو ہوا وہ اچھا ہے یا بُرا؟ شبھ ہے یا اَشبھ؟

شاستریوں سے پوچھنا پڑے گا! اور اگر مرنے والے یا اُس کے گھر والوں کے لیے اس شخص کا اس طرح مر جانا بُرا ہے تو کیا ایک اور شرادھ کرنا پڑے گا؟

کسی نے غصّے سے کہا! جانے کس آزمائش کی بات کر رہا تھا! بدبخت نے ہمیں ایک آزمائش کی طرف دھکیل دیا ہے!؟

OO

ایک ادھوری کہانی

ہوش میں آنے کے بعد جب وِدّیا نے اپنے کو تپتی ریت کی بجائے ساحل کی نرم نرم اور بھیگی بھیگی ریت پر پایا تب وہ یہ نہیں مجھ پا رہی تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی ہے! یعنی اس کو یہاں کون لایا ہے؟ سبز پوش درویش یا گیروی پوشاک پہننے والا رشی؟ کمہار تو ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اس کو پیچھے پیچھے آنے کی آوازیں دیتے ہوئے تب بہت آگے نکل کر دھوئیں میں گم ہو گیا تھا جب وِدّیا تپ رہی زمین پر بکھرے پڑے اپنے تازہ تازہ لکھے ہوئے اوراق کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر وہ بے ہوش پڑی وِدّیا کو کہیں پا بھی لیتا تو وہ نہ تو اپنے کندھے سے اپنی چکّی اُتار پاتا اور نہ اپنی گود میں اٹھائی ہوئی اندھی بچی کو چھوڑ کر اس کو یہاں پہنچا سکتا! پھر اس کا مسیحا کون تھا؟ یہ سوال نہ وہ کسی سے پوچھ سکتی ہے اور نہ کوئی اس کا یہ معمہ حل کر سکتا ہے! کیونکہ دُور دُور تک اس کو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ اس کو شہر کے وہ اونچے مینار جو دُور دُور سے نظر آیا کرتے تھے، اب کہیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں! ہاں شہر نظر تو آ رہا ہے مگر راکھ اور خاک کے نیچے دَبا ہوا دیار دھول یا دھویں کا لبادہ اوڑھے اپنی شناخت کرا رہا ہے!

سمندر کے کنارے کنارے بوجھل قدموں سے چلتے چلتے وِدّیا اپنے مسیحا کو ڈھونڈ رہی ہے! بار بار وہ سمندر کی آتی جاتی لہروں کو اس امید سے دیکھ رہی ہے کہ شاید اِک زیتون کا پتہ ساحل پر رُک جائے گا اور پھر ایک سبز پوش درویش پانی پر چل کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور...اور...اور پھر اس کو اس انوکھے جزیرے پر لے جائے گا جس کی نرالی کہانی اس کو کمہار نے سنائی تھی!!

مگر وِدّیا ہر قدم پر اپنے آپ کو تنہا پا رہی ہے اور احساسِ تنہائی نے اس کا علم کی دیوی پر سے اعتقاد اور اپنی تحقیقی قابلیت پر سے اعتماد دونوں کو مایوسی کے دلدل میں دھکیل دیا تھا!

بین الاقوامی شہرت یافتہ میڈیا شخصیت وِدّیا ایک بیرونی ملک کی چینل کے لیے ایک اہم کہانی بعنوان ''تیسری جنگِ عظیم کے خدشات پر عام لوگوں کے تاثرات'' کو مکمل کرنے کے لیے

مواد اکٹھا کرنے آئی تھی مگر جب سے کمہار کے خود پر گزری کہانی کے بارے میں اس کو طرح طرح کی جانکاری ملتی رہی، وِدِیا کے لیے کمہار کی کہانی زیادہ اہم بن گئی تھی! خاص طور پر اس لیے کہ اکیسویں صدی میں بھی شہر والوں نے ایک آدم زاد کو منحوسیت کی علامت سمجھ کر شہر بدر کیا تھا!

کمہار کی کہانی بھی انوکھی ہے!

جتنے منہ اتنی ہی باتیں! کچھ لوگ کمہار کو ذہنی طور پر بیمار سمجھتے تھے! کچھ لوگ اس کو ایک پاگل سمجھ کر ٹال دیا کرتے تھے یا پھر اس کو بھگا دیا کرتے تھے! کچھ لوگ اس کو ایک دیوانہ یا مستانہ سمجھ کر اس کی ادھوری کہانی سن کر خود ہی کسی تپلی گلی سے بھاگ جایا کرتے تھے لیکن وہ ان باتوں کی گہرائیوں میں ڈوب جایا کرتے تھے جو کمہار اندھی بچی کے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا! بقول اس کے اندھا بچہ اندھا مستقبل ہوتا ہے! جس کو ایک بگڑی ہوئی شکل کا برتن سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا اور وہ بھی ایک چوراہے پر! ٹھوکریں کھانے کے لیے یا کسی کا کھانا بن جانے کے لیے! میں نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا تو کیا بُرا کیا؟ کیا معلوم کبھی اس نابینا کو وہ اَن دیکھی چیزیں نظر آ جائیں جو ان لوگوں کو نظر نہیں آتیں جن کو دنیا بنانے والے نے بینائی دی ہے!

کمہار کا دعویٰ تھا کہ دنیا بنانے والا ایک کمہار ہی تو ہے جس نے دودھ دینے والی بھینس کو بدصورت اور زہریلے سنگ چور کو خوبصورت بنا ڈالا ہے! ایسی باتیں چونکا بھی دیا کرتی تھیں! یہ چونکا دینے والی باتوں کی گہرائی ہی وِدِیا کی دلچسپی کو عمیق گہرائیوں تک لے گئی تھی! اس لیے وہ خود لوگوں سے کمہار کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کیا کرتی تھی اور وہ یہ تو جان گئی تھی کہ جب تک کمہار برتن بناتے بناتے یا فروخت کرتے آہ یا واہ کے تاثرات کے ساتھ مٹی، پانی، ہوا، دُھوپ، بارش اور آگ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سناتا رہتا تھا، شہر والے اس کو برداشت کرتے تھے! پھر جب سے وہ بارود کا حوالہ دے کر شہر والوں کو ڈراتا اور ان کو شہر چھوڑ کر سمندر کنارے جانے کے مشورے دینے لگا تب سے لوگوں نے اس کی بے تکی باتوں پر ہنسنا شروع کیا تھا! بیشتر لوگ اس کی ادھوری کہانی سن کر اس کو ٹوک کر بھاگتے رہتے تھے! کبھی کبھی تو وہ اپنے ایک انوکھے سفر کی پوری کہانی سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا تھا جبکہ اس کے پیچھے دوڑنے والے اس کی باتوں میں تفریح کا مواد پانے کے لیے اس سے مذاقاً، طنزاً یا شرارتاً اوٹ پٹانگ سوالات پوچھا کرتے تھے اور ان سوالات کے جوابات دیتے ہوئے وہ کبھی بے ساختہ رو پڑتا تھا اور کبھی ہنس پڑتا تھا! کبھی کبھی بوکھلا کر ایک بندر کی طرح اُچھل کر کاٹنے کو آیا کرتا تھا! ایسے لوگوں کی نظر میں

کمہار ایک پاگل تھا!

چند لوگ اس کی باتوں کو پانی پر لکھی تحریر سمجھتے تھے جبکہ کچھ لوگ کمہار کو دیوانہ کہہ کر اس کو تنگ کرنے والوں کو سمجھاتے ہیں کہ دیوانہ دیوانوں کی بات نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا! بہت کم لوگ تھے جو کمہار کی باتوں کو الہام سمجھ رہے تھے مگر جب کمہار لوگوں کو تلخ لہجے و ترش کلام کی مدد سے یہ بتاتا رہا کہ شہر پر جلتا ہوا آسمان گرنے والا ہے تب بیشتر لوگوں نے اس کی باتوں کو منحوسیت کی علالت سمجھ کر اس کو نظر انداز کیا تھا! پھر جب دِلوں میں نفرت کا جذبہ اُبھر آیا تھا اور دماغوں میں خدشات اور وسوسوں کا لاوا اُبل پڑا تھا تب کمہار کو شہر بدر کر دیا گیا تھا!

کمہار اپنے کندھے پر برتن بنانے والی چکّی رکھ کر اور اندھی بچی کو اپنے مستقبل کی طرح اپنے سینے سے لگا کر چلاّتا ہوا شہر سے نکل گیا تھا مگر صدائیں دیتے ہوئے کہ ہوش باش! زمین پگھلنے والی ہے!! آسمان سے انگاروں کی بارش ہونے والی ہے! شعلوں کی آندھیاں شہر کو گھیرنے والی ہیں! زندگی سے پیار ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ ورنہ نابود ہو جاؤ گے!!

وہ اپنی صدائیں لوگوں تک پہنچانے کے لیے ایک رات قبل بے صدا دروازوں پر دستک دیتا رہا تھا! بند کھڑکیوں پر پتھر مارتا رہا تھا، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو شاید اس کو اتنی بڑی سزا نہ ملتی! یہ ساری باتیں وِدّیا کو ایک چور نے سنائی تھی جو اسی رات کمہار کی آوازیں سن کر ایک عمارت کی بالکونی سے گر کر اپاہج ہو گیا تھا اور درد کی وجہ سے اس رات کے بعد سو نہیں پایا تھا کیونکہ اس کو کمہار کی باتوں میں سچائی نظر آئی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی کمہار کے پیچھے پیچھے جا نہیں سکا تھا! مگر وہ بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ کمہار کس طرف چل پڑا تھا لیکن وِدّیا شہر سے بہت دُور ایک بیابان میں اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور وہ پر امید تھی کہ وہ ایک ادھوری کہانی کو پوری کر پائے گی!

دراصل وِدّیا، کمہار کی بجائے اس اندھی بچی کی کہانی لکھنا چاہتی تھی جس کو کمہار اپنے ساتھ لے آیا تھا اور بیابان میں اس کو درندوں، آدم خور پرندوں اور زہریلے مکوڑوں سے بچانے کی خاطر ایک مٹکے میں چھپالیا تھا یہ سوچ کر کہ اگر روزِ قہر زمین میں دبا ہوا یہ مٹکا صدیوں بعد یا کسی آنے والے یگ میں کسی راجہ جنک کو ہل چلاتے چلاتے مل جائے تو اس میں سیتا کی طرح یہ بچی مل جائے!

وِدّیا نے جب پہلی بار دُور سے کمہار کو دیکھا تھا تب اس کو یوں لگا تھا جیسے وہ دھندلی دھندلی روشنی میں چلتے چلتے وہ سوگئی ہے اور گہری نیند میں وہ ایک خواب دیکھ رہی ہے جہاں کمہار بیٹھا تھا وہ ایک کھنڈر ہے کوئی اُجڑا دِیار ہے! وہاں ایک مٹکے کے ساتھ بیٹھا ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے جس

کے اوپر مٹی نے ایک انسانی شکل دے دی ہے! نزدیک پہنچ کر وِدّیا کا خواب تو ٹوٹ گیا تھا مگر حقیقی منظر دیکھ کر اس پر سراسیمگی کا عالم طاری ہو گیا تھا! وہ اس لیے کہ اس کو اندھی بچی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی! اس پر طرہ یہ کہ کمہار بھی ایک بت کی مانند بے حرکت تھا! ہونٹ گویا پتھر کے تھے مگر اس کی آنکھوں میں بے چینی عیاں تھی اور لگتا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا اس لیے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو رہا تھا!

وِدّیا کو پیاس لگی تھی اس لیے اس نے جب مٹکے کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانک کر دیکھا تو وہ چونک پڑی! پہلی نظر میں اس کو ایک گھونسلے میں رکھے جو انڈے دکھائی دیئے تھے وہ دراصل کمہار کے ساتھ آئی ہوئی اندھی بچی تھی! بچی یوں بیٹھی تھی جیسے ایک ماں کی کوکھ میں جنم لینے کے لیے بے قرار بچہ! وِدّیا نے جب بچی کو مٹکے سے نکالنا چاہا تب کمہار یوں اُچھل پڑا جیسے ایک مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت کے لیے قریب آ رہی بلی پر اُچھل پڑتی ہے! مٹکے کو سینے سے لگا کر اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے!

وِدّیا اس کی کیفیت بھانپ گئی تھی اور ایک ماہر نفسیات کی طرح کمہار کو اس کی ہی کہانی، اس کی ہی باتیں سنا دی تھی! اپنائیت کا احساس دلا کر کہ وِدّیا کمہار کی پوری کہانی اسی کی زبانی سن سکے تا کہ تحریر میں نہ بناوٹ ہو اور سجاوٹ بلکہ حقیقت کے رنگ ہوں!

وِدّیا کا تجربہ کامیاب رہا تھا اور جونہی اس نے کمہار سے اتنا کہہ دیا تھا کہ دنیا بنانے والے نے اگر آپ کے برتنوں کی طرح اپنی مخلوق کو دل اور دماغ نہ دیا ہوتا تو نہ کسی کے دل میں دنیا کا مالک بن جانے کی چاہ ہوتی اور نہ اس کو پورا کرنے کے لیے ہوس یا حرص اس کے دماغ میں جڑیں پکڑ کر خطرناک ارادوں کے جنگل اُگا دیتے!

کمہار کے ہونٹ تھرتھرانے لگے تھے اور وہ بولتا رہا پھر اپنی کہانی سنا دی تھی! مگر ادھوری!

کمہار ایک زاہد تھا اور وہ روز عبادت کے بعد جب دنیا بنانے والے سے اندھی بچی کے لیے آنکھوں کا نور مانگا کرتا تھا تب ایک غیبی آواز اس کو چونکا دیا کرتی تھی! یہ بچی تمہارا آنے والا کل ہے! تم اس بچی کو کیا دکھانا چاہتے ہو؟ اُجالوں میں جھانک رہیں تاریکیاں یا پھر تم روزِ قیامت یا اس قیامت سے پہلے وہ قیامت دکھانا چاہتے ہو جو قہر آدم کی پیدائش ہے!

پھر ایک روز جب آفتاب ڈوب چکا تھا تب مہتاب کی روشنی میں کمہار کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اس کو بلا رہا تھا! ایک سرگوشیانہ آواز کا تعاقب کرتے کرتے جب وہ سمندر کے کنارے پر

رُک کر دُور سے آتی جاتی روپہلی لہروں کو دیکھ رہا تھا تب اس کی پیٹھ پر اندھی بچی سو چکی تھی اور ایک چیونٹی جانے کہاں سے اس کے بدن پر رینگتے ہوئے اس کے ماتھے پر چپک گئی تھی! چونیٹی ہی شاید کمہار کو اس جگہ لے آئی تھی! پھر اچانک اُس کے کانوں میں وِینا کی آواز گونج اُٹھی تھی اور گونج کے ساتھ کمہار کو ایک پتہ نظر آیا تھا! قریب سے دیکھتے ہی کمہار کو پتے پر سوار ایک عجیب شکل کا مکوڑا دکھائی دیا تھا!

پتہ زیتون کا تازہ پتہ تھا اور مکوڑا سبز رنگ کے دائرے جیسا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے زیتون کے پتے پر سوار مکوڑا ایک سبز پوش درویش بن گیا تھا اور زیتون کا پتہ ایک سفید شے بن کر درویش کے ساتھ ساتھ کنارے پر رُک گیا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے درویش کا قد اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ کمہار اس کے ساتھ آنکھ نہیں ملا سکتا تھا! وہ اس کو ویسے ہی دیکھتا رہا جیسے وہ عبادت کرتے وقت نظروں کو اوپر اٹھا کر دنیا بنانے والے کی موجودگی کو محسوس کیا کرتا تھا! اس دوران سفینے میں چند انسانوں، حیوانوں، پرندوں کے علاوہ طرح طرح کے کیڑے مکوڑے سوار ہو کر ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھ گئے تھے! ہر منظر غور طلب تھا اور دلچسپ ہونے کے ساتھ معنی خیز بھی تھا!!

پھر اچانک چاند کو لال رنگ کے بادلوں نے دبوچ لیا تھا! ایک طوفان اٹھا تھا اور چیونٹی نے کمہار سے کہا تھا کہ وہ پتوار اٹھا کر سفینے کا ناخدا بن جائے!

اتنی کہانی سن کر کمہار کے ہونٹوں پر لگی مہرِ خاموش ٹوٹ گئی تھی اور اس نے ایک بے ٹوک روانی سے کہانی کا وہ حصہ سنا دیا تھا جس کو شہر والے سننے سے پہلے ہی اس کو روکا کرتے تھے، ٹوکا کرتے تھے بلکہ اس کو ٹال کر یا اس کو ہٹا کر چلے جایا کرتے تھے! بقول کمہار سمندر کی لہریں اُچھلتی رہی تھیں مگر سبز پوش پانی کی سطح پر چلتے ہوئے سفینے کے لیے راستہ بناتا جا رہا تھا اور سفینہ اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلتا رہا تھا! سفینہ کئی دنوں اور کئی راتوں چلتا جا رہا! حالانکہ اندھی بچی کے بالوں میں چُھپ کر ساتھ آئی ہوئی ایک مکھی کمہار کو تنگ کر کے اس کی توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے سفینے کو بار بار موجوں کی اُچھال کی طرف لے جا رہی تھی مگر چیونٹی ہر بار کمہار کو سبز پوش درویش کے بنائے ہوئے راستے پر چلانے کا احساس دلاتی رہتی تھی! یعنی وہ راہ جو درویش نے لہروں کو روند کر بنایا تھا! سفر کے دوران اس کے ہمسفروں میں کون بے ہوش ہو گیا تھا اور کون سو گیا تھا، یہ کمہار کو معلوم نہیں تھا لیکن ایک بہت لمبے سفر کے بعد جب طوفان تھم گیا تھا اور سبز پوش درویش ڈوبتے سورج کے ساتھ غائب ہو گیا تھا تب سفینہ ایک ایسے جزیرے کے ساحل پر رُک گیا تھا جو دور سے نظر نہیں

آرہا تھا! تب مکھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی مگر کمہار کے ہم سفر سو رہے تھے!

حیران کُن بات تو تھی کہ شکار شکاری سے لپٹ کر سو رہا تھا! یعنی بھیڑ، شیر ببر کی گود میں سو رہا تھا! بھیڑیا انسان سے چپک کر سو رہا تھا! سانپ کے پہلو میں نیولا تھا! کبوتر باز کے پر کے نیچے یوں نظر آرہا تھا جیسے ایک مرغی کے پروں کے نیچے بیٹھے اس کے محفوظ چوزے!

یہ منظر دیکھ کر کمہار بھی اندھی بچی کو سینے سے لگا کر سو گیا تھا! یہ کمہار تب جان گیا تھا جب سحر ہونے کے بعد اس نے معمول کی طرح عبادت کے بعد پہلے نظریں اٹھالی تھیں اور پھر جھکا دی تھیں! گھبراہٹ پر مشکلاً قابو پا کر جب وہ جزیرے پر چلتا رہا تو بار ہا اس کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ سمندر میں چل رہا تھا! گویا جزیرے کا وجود آب کا فریب تھا! شاید اسی وجہ سے وہ دور سے دکھائی نہیں دے رہا تھا! اچانک کمہار کو یوں محسوس ہوا تھا کہ جہاں آب نظر آرہا تھا وہ دراصل سراب تھا کیونکہ وہ آب پر نہیں بلکہ ریت پر چل رہا تھا! یہ ایک ایسا جزیرہ تھا جہاں کی ہوا بھی بے آواز تھی مگر پھر بھی اپنی رفتار کا احساس دلا کر سانسوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی! چار سو سراسیمگی کا عالم تھا!

کیونکہ کمہار جب مدد کے لیے صدائیں دے رہا تھا وہ خود بھی اپنی آواز سن نہیں پا رہا تھا! اس لیے وہ چیونٹی کی آواز یا اندھی بچی کے رونے کی آواز کیسے سن سکتا تھا! دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا مگر وہ چل رہا تھا! ایک اُمید کا تعاقب کرتے ہوئے کہ شاید کہیں کوئی مل جائے! جزیرے کی بناوٹ بھی ایسی تھی جیسی ایک تکونی مچھلی کی پیٹھ! نشیبی حصے یوں نظر آرہے تھے جیسے کوئی راکھشس گہری جھیلوں کا پانی پی گیا ہو! بالائی حصے یوں نظر آرہے تھے جیسے بستیاں ریت کی چادر اوڑھ کر دفن ہو چکی ہوں! کہیں بھی زندگی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا! اس کے ہم سفروں کا اتہ پتہ دینے کے لیے چاروں طرف پھیلی صحرا کی ریت پر نہ کہیں قدموں کے نشانات مل رہے تھے نہ کسی کے رینگنے کے نشان دکھائی دے رہے تھے!

ہوا تھم گئی تو چیونٹی نے کمہار کو ایک ایسا واقعہ سنا دیا جس سے وہ لرز اُٹھا! ہوا یوں تھا کہ رات کو جب کمہار تھک کر گہری نیند سو رہا تھا، شیطانی مکھی نے سوئے ہوئے تمام جانداروں کو اس قدر تنگ کیا تھا کہ سب جاگ پڑے تھے! جاگ کر سبھی کو بھوک کا شدت سے احساس ہوا تھا اور پھر سب غذا کی تلاش کرتے ہوئے ایک انوکھے باغ میں داخل ہو گئے تھے! دراصل یہ ایک ایسا جزیرہ تھا جو رات کو اپنا رنگ و روپ بدل دیتا تھا! ریت ہری بھری گھاس میں بدل جاتی تھی! یعنی صحرا ایک گلستان میں بدل جاتا ہے! چاروں سو خوشبو پھیل جاتی ہے اور ہوا میں وینا کی آواز سنائی تو دیتی ہے،

پتے جل ترنگ کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر رقص کرتے رہتے ہیں! کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے مگر اِرد گرد گھومنے پھرنے والے کا چہرہ یا جسم نظر نہیں آتا! سرسبز مخملی گھاس پر پانی کے قطرے پکھراج کے مانند چمکنے لگتے ہیں اور ہر طرف عجیب قسم کے درخت نظر آتے ہیں! دُور سے جو برگد کے پیڑوں جیسے لگ رہے تھے لیکن وہ سیبوں کے درختوں کی طرح پست قد ہیں اور اُس کے پتے زیتون کے پتوں جیسے ہیں! چھوٹے بڑے یا سر بفلک پیڑوں پر طرح طرح کے پھل لٹک رہے ہیں جن کی شکل ناریل جیسی ہے! آم جیسی ہے! اخروٹ جیسی ہے بلکہ انڈوں جیسی بھی ہے! جب کمہار کے ہم سفروں نے باغ میں کھانے کے لیے کچھ پایا تھا تب شیر یہ بھول گیا تھا کہ وہ گوشت خور ہے اور وہ بھیڑ بکری یا انسان کو کھا سکتا ہے! کیونکہ خوف اور ڈر نے شکاری کو شکار کا غمخوار بنا دیا تھا اور یوں سبھی اپنی اپنی من پسند خوراک بھول کر ایک ساتھ باغ پر ٹوٹ پڑے تھے! مگر پھل کاٹتے ہی ان کے سر دھڑ سے الگ ہو گئے تھے! نہ جانے کیوں اور کیسے؟ جو ہوا تھا گویا آنکھ جھپکتے ہی ہو گیا تھا!

چونکہ چیونٹی بھگوان شنکر کی تیسری آنکھ کی طرح دُور دُور تک دیکھ سکتی ہے! اس لیے وہ یہ دیکھ چکی تھی کہ چند درختوں پر جو پھل نظر آ رہے تھے وہ دراصل کوکھ کے مانند تھیلیاں تھیں جن میں ایک نئی قسم کی مخلوق درختوں کی جڑوں سے ویسے ہی نشو ونما پا رہی تھیں جیسے کوکھ میں بچہ ماں کے جسم سے غذا پا لیتا ہے! تھیلیاں گرتے ہی درخت تھرتھرانے لگے تھے اور بجلیاں کڑکنے لگی تھیں! گویا ایک ماں کا حمل گر چکا تھا اور گیروی رنگ کی پوشاک پہنے ایک رشی ان تھیلوں کو دیکھ کر غم کے ساتھ اپنے قہر آلود غصے کا اظہار بھی کر رہا تھا!

چیونٹی نے اس رشی کو پہچان لیا تھا! یہ مہارشی وشوامتر تھا! وہی وشوامتر جس نے اپنی تپسیا سے حاصل کی ہوئی چمتکاری شکتی سے کسی زمانے میں درختوں پر انسانوں کے سر اگا دیئے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ دھڑ بنا کر اپنی ایک الگ دنیا بسا لیتا دیوتاؤں نے اندر لوک سے ایک بے حد خوب صورت رقاصہ مینکا کو دھرتی پر بھیج کر اس کی تپسیا کو بھنگ کر دیا تھا! صدیوں بعد جب اس کو یہ علم ہوا کہ چند شیطانی طاقتیں دُنیا کو ختم کر دینے والی ہیں تب اس نے اپنی شکتی سے یہ جزیرہ ایجاد کیا اور اب وہ اس نئی دنیا میں رہنے والی مخلوق کو جسم دے کر زندگی کو ایک الگ رنگ میں پیش کرنے کا عزم اٹھا چکا تھا، وہ زندگی جو ہمیشہ زندہ رہے! وہ زندگی جو رنگ برنگی نہ ہو بلکہ یک رنگی ہو! ہوا میں بارود کی بدبو نہ ہو بلکہ ایک جیسی خوشبو بھی ہو! نہ کوئی طاقتور ہو اور نہ کوئی کمزور ہو، نہ کوئی راجہ ہو اور نہ کوئی

رنگ ہو! نہ کوئی دوست ہو اور نہ کوئی دشمن ہو! نہ ظالم ہو اور نہ مظلوم ہو!!

اپنے خواب کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر جزیرے میں داخل ہونے والوں کو وشوامتر نے اپنی شکتی سے سزا دی تھی اور غصّے سے دھڑ اور کٹے سَر کو دُور دُور تک پھینک دیئے تھے! کمہار اپنی اندھی بچی کو وشوامتر کے قہر سے بچانے کے لیے واپس لوٹنا چاہتا تھا مگر پھر یہ چاہا کہ کیوں نا بچی کو رِشی کے سپرد کر کے خود ہی اپنی قربانی دے کر مہارِشی کے اندر دہک رہی جوالا مکھی کو شانت کر دے!

سورج غروب ہوا تھا دھندلی دھندلی روپہلی روشنی میں جزیرہ ویسا ہی نظر آیا جیسا چیونٹی نے بتایا تھا! یعنی ریت گھاس میں تبدیل ہوا تو کمہار کو جزیرہ ایک دلکش عجوبہ نظر آیا! ایسے جزیرے کے بارے میں چیونٹی نے اساطیری کتھا، حکایت یا اندرسبھا میں کہی، جن پریوں یا جادوگروں کی طلسمی کہانیوں میں بھی نہیں سنا تھا! اس لیے کمہار کا حیران و پریشان ہونا ایک فطری عمل کا حصہ تھا! وشوامتر اس کے دل کی بات سن چکا تھا اور اس کے دماغ میں آیا ہوا خیال بھی سمجھ پایا تھا! اس لیے وہ اچانک نمودار ہو کر کمہار سے پوچھ بیٹھا تھا! میں اس اندھی بچی کو لے کر کیا کروں؟ اور تمھاری قربانی سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟ تم چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو! اس لیے کہ تم ایک زاہد ہو! جواباً کمہار نے التجا کی کہ اس کے تمام ہم سفروں کو زندہ کر دیا جائے تاکہ وہ سب اس پرامن جزیرے میں رہ سکیں اور ایک نئی پرامن دنیا کو تشکیل دینے کے لیے کام کر سکیں! وشوامتر مان گیا مگر ایک شرط یہ رکھ دی کہ کمہار پہلے تمام مہروں کو اکٹھے رکھے گا اور پھر تمام دھڑکوں کو اکٹھا کر دے گا اور اندھی بچی سر اور دھڑ کو ایک ساتھ چھُو لے گی تو ہر مخلوق کا جسم زندہ ہو جائے! دوسری شرط یہ رکھ دی کہ کمہار اپنی آنکھیں اور ہاتھ اندھی بچی کے سپرد کرنے کے بعد اپنے آپ کو مٹّی میں ملا دے گا!

کمہار فوراً مان گیا تھا مگر جب اس کے ہم سفر زندہ ہو کر اس کے اِرد گرد جمع ہو گئے تھے تب کمہار خوف زدہ ہو گیا تھا! جبکہ وشوامتر فاتحانہ قہقہے لگاتا رہا اور کہتا رہا ’اندھی لڑکی نے وہی کیا جو میں کرنا چاہتا تھا! اب ان درختوں پر میں کیوں پھل اُگا دوں؟‘‘ دماغ ظالم کا اور دل مظلوم کا ہو تو ظلم ہوگا ہی نہیں! ہوا یوں تھا کہ سر اگر شیر ببر کا تھا تو دھڑ ایک بھیڑ کا تھا! سانپ کے جسم پر مور کا سر تھا! باز کے جسم پر کبوتر کا سر تھا! انسان کے جسم پر بندر کا سر تھا اور سبھی ایک دوسرے سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے ایک ہی جان بے شمار جسموں میں موجود تھی! نہ کسی کو کسی سے ڈر لگ رہا تھا نہ کوئی کسی سے نفرت کر رہا تھا! یہ منظر دیکھ کر کمہار نے وشوامتر سے التجا کی تھی کہ اس کو لوٹ کر جانے کی اجازت دے کر واپس آنے دیا جائے تاکہ وہ اپنے ساتھ اور اس کے خواہش مند جانداروں کو مولیش کے سفینے

میں لے کر اس جزیرے پر لا سکے تا کہ کائنات کو نئے رُوپ و رنگ میں زندہ رہنے کا موقع مل سکے!

اس سے پہلے کہ وشوامتر ہاں یا نا کہہ دیتا سحر کی کرنوں میں نہ جزیرے کی ہریالی نظر آئی تھی نہ وہ زیتون کے پتے! اور ایک دُور دُور تک پھیلے ہوئے بیاباں میں نہ وشوامتر نظر آیا اور نہ اس کے ہم سفر! جزیرے میں پھر ریت تھی اور سراب!

کمہار اپنے سفینے میں بیٹھا رات کا انتظار کر رہا تھا مگر تب تک مکھی سفینے کے ایک کونے سے نکل کر اتنی بڑی بن گئی کہ اس نے جب پنکھ پھیلا دیئے تو سفینے کا بادبان گر گیا تھا! پھر بادِ صرصر نے سفینے کو ساحل سے الگ کر دیا تھا! ایک زبردست طوفان اٹھا تھا اور ہواؤں نے سفینے کو خونخوار موجوں کے حوالے کر دیا تھا! اور پھر کمہار اندھی بچی کو سینے سے لگا کر ڈوب گیا تھا! عمیق گہرائیوں میں!

کئی دن بعد جب کمہار کو ہوش آیا تب وہ اندھی بچی کو اپنی گود میں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا! اتنا خوش کہ خوشی سے اُچھل کر مسرت کی محیط کو چھو گئی تھی! چیونٹی تب بھی اس کے ماتھے پر چپک کر بیٹھی تھی اور وہ کمہار کو بتا چکی تھی کہ جب شیطانی مکھی نے سفینے کو گرداب میں دھکیل دیا تھا تب سبز پوش درویش نے ان کو ایک زیتون کے پتّے پر بٹھا کر کنارے پر چھوڑ دیا تھا جبکہ شیطانی مکھی سفینے کو عمیق گہرائیوں میں ڈوبتے دیکھ کر قہقہے لگاتے ہوئے چلی گئی تھی!!

پھر اچانک ایک رات سبز پوش درویش کمہار کے گھر میں نمودار ہوا، اور اس سے کہنے لگا کہ جب تک وہ شیطان کی گرفت میں آئی ہوئی زمین پر رہے گا تب تک وہ اس کو آفتوں کے قہر سے کوئی نہیں بچا سکے گا! ہاں مگر جب بھی وہ دُور سمندر کے کنارے اُسی جگہ جہاں وہ تینوں کو چھوڑ آیا تھا، آواز دے کر بلائے گا وہ آجائے گا اور اسی جزیرے پر لے جائے گا جہاں شیر اور بکری ایک ساتھ رہتے ہیں! جہاں نہ ظلم ہوتے ہیں اور نہ ظالموں کا وجود ہے!

وہ شاید سحر کی عبادت کے بعد سمندر کے کنارے چلا جاتا مگر چیونٹی دیکھ چکی تھی کہ شہر پر قابض ہونے والا خاقان حملے کی تیاری کر چکا ہے! تب وہ یہ جان چکی تھی کہ کمہار اپنے شہر والوں کو شہر چھوڑنے کے لیے التجا کرتا رہا ہے!

اس کے بعد کیا ہوا تھا وہ وِدّیا جانتی تھی! گویا اس کی کہانی اختتام کے نزدیک تھی مگر کہانی ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ کمہار نے اس جگہ کا پتہ نہیں بتایا تھا جہاں کا جغرافیہ بتایا تھا! اور دھماکے نے وہ دھاگہ کاٹ دیا تھا جس کو پکڑ کر وِدّیا کہانی پوری کر پاتی! — بس یہی بات اُس کی سوچ اور سمجھ کو کرید رہی تھی! پھر بھی وہ بوجھل قدموں سے ... چلتی رہی ... کسی منزل پر پہنچنے کی

خاطر! اچانک اس کی نظر لہروں پر آ رہے ایک پتے پر رُک گئی! وہ سمجھ بیٹھی کہ شاید یہ وہی پتہ ہوگا جس کو اس کی نظریں تلاش کر رہی تھیں! جوں جوں لہریں قریب آتی رہیں تو اس کو یوں لگا جیسے یہ وہی زیتون کا چمتکاری پتہ ہوگا جو یقیناً کمہار نے اس کو سمندر پار کرنے کے لیے بھیجا ہوگا! وِدّیا جانتی تھی کہ جب کمہار ان شہر والوں کو قہر سے بچانے کے لیے ایک بیابان میں انتظار کر رہا تھا تب جنھوں نے اُس کو شہر بدر کیا تھا ان کے رحم و کرم پر وِدّیا جیسی ہمدرد کو ایک اُجڑے دیار کی تنہائیوں میں اپنے وجود کو کھود ینے کے لیے قطعاً نہیں چھوڑ دے گا! پل بھر کے لیے وہ اپنے آپ کو کوستی رہی کہ کمہار کی نیت بد کے بارے میں اس کے دماغ میں خیالِ بد کیوں آتے رہے؟ لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو وہ ایک پتہ نہیں تھا بلکہ ایک کورے کاغذ کا ایک ورق تھا! اتفاقاً ان اوراق میں ایک ورق جس پر وِدّیا نے کمہار کے بتائے ہوئے انوکھے جزیرے کی نرالی کہانی قلم بند کر دی تھی اور وہ اوراق دھماکے کی آواز سن کر وِدّیا کی لرز رہی گرفت سے نکل کر بکھر گئے تھے!!

بوجھل قدموں سے سمندر کے کنارے کنارے چلتے چلتے وِدّیا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کمہار بھی کھو گیا ہے! وِدّیا ٹوٹ چکی ہے اور سورج چاند ستاروں کو دیکھتی رہتی ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کو چمتکاری رِشی وِشوامتر سے ملوا دے تا کہ وہ اس کو یہ بتا سکے کہ اپنی الگ دنیا بسا لینے کی بجائے وہ اس دنیا کو جنگ نواز حکمرانوں سے بچا لے اور بم بنانے والوں کی کھوپڑیوں میں یتیم بچوں کے دماغ ڈال دے یا پھر ان کے سینوں میں ان بیواؤں کے دل ڈال دے جن کے شوہر جنگ میں مر گئے ہیں! شاید تب اس کی ادھوری کہانی پوری ہو پاتی!!

OO

عذاب

وہ جو شخص سحر ہونے کے ساتھ ہی تھانے میں گھس کر اپنے آپ کو تھانے دار کے حوالے کر گیا تھا وہ شام ہونے سے پہلے ہی چلا گیا ہوتا اگر تھانے دار اچانک اس پر ایک بجلی کی طرح نہ ٹوٹ پڑا ہوتا! حالانکہ دن بھر تھانے دار اس کو بار بار گھر جانے کے لیے کہہ رہا تھا مگر وہ ہر بار ہر سوال اور ہر بات کا ایک ہی جواب دیتا تھا!

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ جو ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے؟ سنگین رات کے بعد رنگین سحر دیکھنے کے لیے کوئی کسی گاؤں میں نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

یوں تو تھانے دار نے اس کو بھی حوالات میں بند کر دیا ہوتا مگر ایک ذی ہوش وحساس پولیس افسر خود بھی خود سے ایسے ہی سوالات کر کے یوں محسوس کرتا رہا جیسے اس کے اندر ایک پھوڑا ہے جس کو اس شخص کی معنی خیز باتیں چھو کر ایک انوکھے عذاب کی شدت کا احساس دلا کر جواب مانگ رہی ہیں، مگر وہ لاجواب ہے!!

دراصل ایک فرض شناس افسر قتلِ عام روکنے کی خاطر خطروں سے بھی کھیلنا چاہتا ہے مگر دن بھر وہ جس گاؤں میں امن اور شانتی کی لہک دیکھ کر اطمینان سے لوٹ کر جایا کرتا ہے اس گاؤں میں سورج ڈھلتے ہی نہ جانے کیوں شیطان اپنا کام کر کے اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے! شاید اسی لیے وہ ذہنی طور پر متاثر ہو کر گھنٹوں اپنی کرسی کو گھما گھما کر سوچ وسمجھ کے مختلف زاویے دیکھتا رہتا ہے!!

تھانے میں کام کرنے والے ملازمین سے اس کی یہ نرالی کیفیت چھپی ہوئی نہیں ہے جبھی تو ان کو حیرانگی کے علاوہ اس بات کی تشویش بھی ہے کہ ایک ٹھنڈے چشمے کا پانی اچانک اُبل کر اُچھلنے کیوں لگا ہے! انھوں نے پہلی بار تھانے دار کو ہاتھ پاؤں چلا کر کسی کی پٹائی کرتے ہوئے دیکھا ہے! وہ بھی بے رحمی سے کسی کو لہولہان کرتے ہوئے!!

معمول کی طرح تھانے دار کل بھی آس پاس کے تمام گاؤں میں امن کی فضا دیکھ کر اطمینان

سے تھانے پر لوٹ کر آیا تھا لیکن پھر اطلاع ملتے ہی وہ واپس لوٹ کر جب تاریکیوں میں ڈوبے گاؤں میں پہنچ گیا تھا تب تک فسادیوں نے گاؤں کو اُجاڑ دیا تھا!

دروازے کُھلے تھے مگر بے صدا تھے! خونی پنجوں نے گھر گھر کو کرید کرید کر لہولہان کر دیا تھا! یوں لگ رہا تھا جیسا دولہا دلہن اور باراتیوں کو چیڑ پھاڑ کر کے پھینک دیا گیا تھا اور لڑکی والوں کو مسل دیا گیا تھا! حملہ آور اپنی فتح کے نقوش چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ایک اجڑے دیار کے شکست خوردہ لوگ حفاظتی جنگ لڑے بغیر یا تو کٹ گئے تھے یا پھر اکھڑ کر بچھڑ گئے تھے! تب جو زندہ بھی تھے ان کو روشنی کے چھوٹے دائرے نظر آئے تو ہوں گے مگر پولیس والوں کے چہرے نظر نہیں آئے ہوں گے! ظاہر ہے کہ کون کیسے جان پاتا کہ اس کی تلاش کرنے والا مسیحا ہے یا پھر ملک الموت! مرہم لگانے والا ہے یا ان کے زخموں کو کریدنے والا ہے! گاؤں کا چپہ چپہ چھان کر گئی رات تک تھانے دار کو سارے گاؤں میں دو مردوں کے علاوہ ایک عورت مل گئی تھی جن کو اپنے ساتھ لے آیا تھا! مردوں کی نشان دِہی ان کی آواز نے کردی تھی کیونکہ دونوں نشے میں تھے اور ایک کھڈے کو تالاب سمجھ کر مینڈکوں کی طرح ٹرا رہے تھے جبکہ عورت ایک گھاس اور چارے کے گودام میں تب ملی تھی جب تھانے دار کی ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں ایک بچے کا چہرہ نظر آیا تھا! بچے کی ناک اور اس کے منہ پر ایک ہاتھ تھا اور بچہ بے حرکت تھا! قریب سے دیکھا تھا تو پہلے تھانے دار کو ایک عورت کی گود نظر آئی تھی پھر عورت کے عریاں پستان سے نکل رہے دودھ کے چند قطرے دیکھنے کے بعد جب اس نے ایک بیس پچیس سال کا چاند جیسا چہرہ دیکھا تھا تب تھانے دار سکتے ہیں آ کر بڑبڑانے لگا تھا! ''کالے بادلوں کو چیر کر نکلی ہوئی یہ روشنی کی روپہلی کرن ہے یا پھر اماوس کے بعد نکلا ہوا چاند!'' مگر یہ دیکھ کر کہ اس عورت نے اپنے آنچل میں ایک دودھ پیتے بچے کو والائے بلائے سے چُھپانے کی بجائے آنچل ہٹا کر بچے کی سانسوں کو دبوچ ڈالا ہے وہ لرز گیا تھا!

تینوں حوالات میں بند ہیں مگر عورت برف میں رکھی ہوئی ایک لاش کی مانند نظر آ رہی ہے! بے حرکت اور بے زبان! رات بھر یہ عورت کسی بھی سوال کا جواب تو کیا دیتی وہ اپنا نام تک نہیں بتا رہی تھی جبکہ دونوں مرد نشے کی وجہ سے سو گئے تھے یا پھر بے ہوش تھے!

چونکہ تھانے دار کو ہو چکے فسادات کے صدمات سے زیادہ ہونے والے فسادات کے خدشات سے گھبراہٹ ہو رہی تھی اس لیے وہ رات بھر جاگ کر یہ سوچتا رہا کہ اس کا درداب ایک پکے پھوڑے کی درد کی مانند ہے جس کو اس کے احساسات کی جنبش بھی تڑپا دیتی ہے اور جذبات کی

نو کیلی کرید بھی عذاب کی شدت کو اچھال رہی ہے! صبح ہوتے ہی ایک غم میں ڈوبے شخص کو دیکھ کر اس کو اُمید تھی کہ مجروح ہرن اُس کو بتادے گا کہ اس پر کس نے حملہ کیا تھا لیکن اس شخص کی ذہنی کیفیت دیکھ کر یہ اُمید بھی پانی کی بوند کی طرح ریت میں ڈوب گئی تھی!! حالانکہ تھانے دار نے اس کو گھر جانے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ تھانے کے احاطے کے باہر جانے کے لیے تیار ہی نہ تھا بلکہ وہ ضد کر رہا تھا کہ اس کو بھی لاک آپ میں رکھا جائے! بار بار اِرد گرد علاقوں کا معائنہ کر کے جب تھانے دار کو کل رات کے سناٹے اور آج دن کے سناٹے میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا تب وہ تذبذب کا شکار ہو گیا!!

''آخر یہ فسادی دیکھتے ہی دیکھتے کہاں غائب ہو گئے؟ آسمان نے گود میں اُٹھالیا یا زمین نے آنچل میں چھپالیا؟ اگر انھوں نے پناہ دی ہے تو کیا دونوں انسان دشمن نہیں ہیں؟ کیا کائنات بنانے والے کو معلوم ہوگا کہ وہ شیطان کی اولاد کہاں چھپ گئے ہیں؟ بھگوان ہندو مسلمان بلکہ انسان کو زخم پہنچانے والے شیطان پر بجلی کیوں نہیں گرا رہا ہے؟

لحمہ بہ لحمہ اس کا احساس ہی اس کے اندر پکے ہوئے پھوڑے کو چُھو کر اس کے کرب کو بڑھاتا رہا اور وہ تڑپتا رہا!! اگر تھانے کا انچارج نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رو پڑتا مگر شرابیوں کی کھسر کھسر نے اس کے احساسات کا تسلسل توڑ دیا ہے! وہ ایک دوسرے سے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے اور تھانے دار سنتا رہا! ''گویا ہم کو تالاب سے اُٹھا کر اس حوالات میں لایا گیا ہے! کسی رفیوجی کیمپ میں کیوں نہیں چھوڑا گیا؟ یہ سوچنے کی بات ہے؟ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟ حلق سوکھ گیا ہوگا؟ پیاس لگی ہوگی؟ اب تم ہی کہو! میں بوتل کہاں سے لے آؤں! تم شراب پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ اچھا تو یہ بتادو کہ جن کے غم میں تم پیئے جارہے ہو وہ بٹوارے کے ساتھ ہی پاکستان کیوں نہیں چلے گئے تھے؟

''تم بھی تو مسلمانوں کے گاؤں میں رہتے ہو؟ ہندوؤں کے گاؤں میں رہنے کے لیے کیوں نہیں جاتے؟ اس بار تو میں نے بچالیا، دوسری بار؟ اگلی بار شاید...!؟''

''یا تو میں تمھیں بچالوں گا ورنہ دونوں مارے جائیں گے! ہے نا؟ بھگوان نے انسان کو ہندو یا مسلمان بنا دیا جبکہ حیوان کو حیوان ہی کیوں رہنے دیا! سوال غور طلب ہے! ہے نا؟''

''جواب حیوان ہی دے سکتے ہیں! پوچھنا پڑے گا!''

''ارے شرابی؟ حیوان کیا بول سکتے ہیں؟''

''بول کیوں نہیں سکتے؟''

''فسادی بے زبان نہیں ہوتے اس لیے!''

''مگر مظلوم بے زبان ہوتے ہیں! شرطیہ! اس عورت کو دیکھ لو! نہ روتی ہے نہ ہنستی ہے اور نہ بولتی ہے!''

''کیا بولے گی؟ یہی کہ میں نے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنے دودھ پیتے بچے کو مار ڈالا!''

''پھر یوں کہوں نا کہ یہ عورت وہ خوب صورت ناگن ہے جو اپنے بچے کو کھا گئی ہے!''

''ہندو ہے یا مسلمان؟''

''یوں کہو کہ ایک ڈائن ہے!''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بڑبڑا کر کچھ اور کہتے، عورت کی ایک دردناک چیخ نے تھانے دار کے خیالات واحساسات کا سلسلہ توڑ دیا اور شرابیوں کو ڈرا دیا!—!!

اُس وقت تھانے میں موجود لوگوں کے علاوہ چند ڈرے سہمے لوگوں کے ساتھ چند نڈر لوگ بھی تھانے میں داخل ہو کر صبح آئے ہوئے شخص سے باتیں کر رہے تھے! یعنی تھانے دار شرابیوں کی باتیں بھی سن رہا تھا اور ان لوگوں کی سرگوشیانہ باتیں بھی! اور پھر آنکھیں بند کر کے وہ باتیں سُن سُن کر اپنے خیالات، احساسات اور محسوسات کی آہٹیں بھی سن رہا تھا! عورت کی چیخ سن کر وہ جونہی حوالات کا آہنی دروازہ کھول کر عورت کے سامنے آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ کر، عورت کی عریاں پستانوں کو دیکھتا رہا تب تھانے میں سناٹا چھا گیا! باہر سے آئے لوگوں کی نظریں بھی عورت پر جمی رہیں!

دودھ کے قطرے ٹپ ٹپ کر گرتے رہے تو تھانے دار نے ہاتھ بڑھا کر، جب عورت کی چھاتی کو اسی کے پھٹے آنچل سے چھپا دیا تب وہ ایک بار پھر چیخ پڑی! اور پھر بے ساختہ چیختی چلاتی اپنے مردہ بچے کو ڈھونڈتی رہی! پھر ایک برف کی طرح پگھلتی رہی اور وہ تھانے دار کے سوالات کے جوابات یوں دیتی رہی جیسے چھت پر جمع برف پانی بن کر ٹپ ٹپ کر کے زمین پر گر رہی ہو!! اس اٹھارہ سالہ خوب صورت عورت کی کہانی بھی صدمات کی ایک دل ہلا دینے والی وہ کہانی تھی جس نے تھانے دار کے اندر پکے پھوڑے کو زور سے دبا دیا! عورت ہندو ہے مگر اس کا شوہر مسلمان تھا مگر مسلمانوں نے ہی اس کو ہندو سمجھ کر قتل کر دیا تھا جبکہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی خاطر کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی وہ یہ نہیں جانتی تھی! اُس کا تعلق ایک ایسے قبیلے سے ہے جو بنجاروں کی طرح

گاؤں گاؤں جا کر بھجن کیرتن بھی کرتے ہیں اور شادی بیاہ کے رسومات پر لوک گیت گاتے رہتے ہیں اور خوشی خوشی ہندوؤں اور مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہو کر اپنی زندگی کو لطف اندوز بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں! گانا بجانا اور ناچنا ہی ان کا جنونی شوق بھی ہے اور پیشہ بھی! وہ کسی بھی قیمت پر جسم فروشی کا دھندہ نہیں کرتے ہیں مگر ان میں خاص بات یہ ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے دو بھائیوں میں اگر ایک بت پرست ہے تو دوسرا پانچ وقت نماز ادا کرنے والا عابد ہے مگر جب وہ کہیں گانے بجانے کے لیے جاتے ہیں تو میرا بائی کے بھجن بھی گاتے ہیں اور امیر خسرو کی بندشیں بھی! راس لیلا بھی کرتے ہیں اور اپنے رسیلے لوک گیتوں سے محفلوں میں چھا بھی جاتے ہیں! نہایت ادب سے رامائن کی کتھا بھی سناتے ہیں اور کربلا میں ہوئے یزید کے ظلم و تشدد کی داستان بھی سناتے رہتے ہیں!!

یہ عورت بھی اپنے ماں باپ، ساس سسُر اور شوہر کے ساتھ اس علاقے میں آئی تھی! اس کی ماں مسلمان تھی اور باپ ہندو! ساس ہندو تھی اور سسُر مسلمان!! خاندان میں ایک وہی تو تھی جو اپنا چھ مہینے کا بیٹا گود میں اٹھا کر بھاگنے میں کامیاب تو ہوگئی تھی مگر ایک گودام میں پناہ لے کر جب اس نے قدموں کی آہٹ سن لی تھی تب اس نے اپنے بچے کی آواز دبانا چاہی تھی تاکہ گودام کی تلاشی لینے والوں کو اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو! مگر جس بچے کو بچانے کی خاطر اس کے پاؤں کئی دنوں سے چلتے چلتے لہولہان ہوگئے تھے اس بچے کو اس کے ہاتھ نے چند منٹوں کے بعد ہی ابدی نیند سلا دیا تھا!!

یہ جان کر تھانے دار کے اندر پک رہے پھوڑے نے عذاب کی شدت میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پایا! اچانک اُس کی آنکھوں کی لالی نے آنسوؤں کو خشک کر دیا کیونکہ وہ شخص جو تاکید کے باوجود سویرے سے تھانے سے نہ جانے کی ضد پکڑ کر بیٹھا تھا اور دن بھر طوطے کی طرح رٹ لگا کر بڑبڑا رہا تھا یا کبھی چلا کر درد بھرے لہجے میں یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا؟ اچانک سرگوشیانہ مگر اعتماد سے ان لوگوں کو، جو خاص طور پر اسی سے ملنے آئے تھے، یہ بتا رہا تھا کہ اب رہبر بن کر وہ ان کے ساتھ آ سکتا ہے کیونکہ اب اس کے پاس ہر گاؤں میں کہنے کے لیے مواد بھی ہے اور ثبوت بھی ہے! ''سچ صحیح قدم کو ثمر آفریں بناتا ہے، ثبوت حوالات میں بند یہ عورت ہے اور ہم نے سچ بول کر ہندوؤں کو یہ بتانا ہے کہ اس مظلوم عورت کے پتی کو مسلمانوں نے نہیں مارا ہے بلکہ مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ جس ظالم

عورت نے ایک مسلمان کی اولاد کو اس کی سانسیں دبوچ کر شہید کیا ہے وہ حوالات میں بند ہے اور انتقامی عتاب سے بچانے کی کوشش کی جارہی ہے! — پھر ان چنگاریوں سے جو آگ لگ جائے گی اس کو بجھا دینا آسان کام نہیں ہے! یہ جنگل کی آگ ہوگی اور راکھ سے زمین پر ہماری فتوحات کی جو داستان لکھ دے گی! — وہ اَمِٹ ہوگی!!"

اس سے پہلے کہ وہ نظریں بچا کر تھانے سے نکل جاتا، تھانے دار ایک زخمی شیر کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا، پھر جب وہ اس شاطر شخص کو اپنے ساتھیوں سمیت لہولہان کر کے حوالات میں بند کر کے خود ہی کاغذی کارروائی کرنے لگا تو اس کو یوں لگا جیسے اُس نے اپنے ہی قلم کی نوک سے ایک پکے پھوڑے سے پیپ نکال کر عذاب شدید سے راحت پائی ہے!

اُس رات اس کے علاقے میں نہ دنگے ہوئے نہ فسادات اور نہ حساس فرض شناس تھانے دار کو عذاب!!

OO

ھوک

دینو شاہ کے ہونٹ تھرتھرانے لگے! اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر والی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر بغیر پڑھے ایسے پھاڑ دیا جیسے وہ لفافہ نہیں بلکہ اپنا ہی گریبان چاک کر رہا ہو! یہ لفافہ ہر وقت اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا! موقع پاتے ہی وہ دن میں کئی بار نکال کر اس میں رکھے ہوئے خط کو ایسے پڑھتا رہتا تھا جیسے وہ خط کو پہلی بار پڑھ رہا ہو! پھر ہر بار وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر خلاؤں میں گھورنا شروع کرتا تھا! گویا وہ لفافہ کوئی معمّہ تھا اور جس کے لیے اسے کسی واحد حل کی تلاش تھی! ذرا سی آہٹ پا کر یا کسی جھانکتی ہوئی نگاہ کو دیکھ کر وہ جلدی سے لفافہ بند کر کے اُسے جیب میں یا سرہانے کے نیچے یوں چھپا دیتا ہے جیسا اپنا کوئی گناہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو! اور اگلے ہی لمحے وہ حقے کے ہلکے ہلکے کش لگا کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سرچ لائٹ کی طرح دائیں بائیں گھما کر اپنے مکان میں رہنے والے کرایہ داروں کو ایسے دیکھنا شروع کرتا تھا جیسے کوئی جاسوس، کسی اونچی جگہ بیٹھ کر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہو!

ایک مُدت کے بعد آج اس نے اس لفافہ کو پھاڑ کر پھینک دیا اور پھر کاغذ کے بکھرے ہوئے تنکوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہی تنکے اس معمّہ کا واحد حل تھا جس کی اسے پچھلے بیس سال سے تلاش تھی!

دینو شاہ کا شمار شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہے! اس کا اِکلوتا بیٹا امریکہ میں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے ایک عرصہ سے وہیں مقیم ہے! اس کی اِکلوتی بیٹی بھی اپنی ماں کی موت کے بعد بچپن میں اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی اور اور جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ واپس لوٹ آئی تھی لیکن صرف موت کے آغوش میں پناہ لے کر چھپ جانے کے لیے! اس لیے اب وہ تنہا ہی ہے!

اپنے حویلی نما مکان میں اگر اسے کوئی تکلیف تھی تو وہ فقط اکیلے پن کی! لیکن اس اکیلے پن کا علاج اس نے ڈھونڈ لیا تھا! اس نے ایک دو کمرے اپنے استعمال کے لیے رکھ چھوڑے تھے اور باقی تمام کمرے مختلف قسم کے لوگوں کو کرایہ پر اس لیے دے رکھے تھے تاکہ آس پاس چہل پہل

رہے گویا مکان میں کالج کے لڑکے، بوڑھے، بچّے بھی رہتے ہیں لیکن جب اس کے آس پاس نوجوان عورتیں یا کمسن لڑکیاں ہوتی تھیں تو اسے اپنے اکیلے پن کا احساس بالکل ختم ہو جاتا تھا!

دینو شاہ کی رنگین مزاجی سے سارا شہر بخوبی واقف تھا اس کی جوانی میں خاص طور پر بیوی کے مرنے کے بعد اس کے معاشقوں کے قصّے کافی مشہور تھے! وہ خود بھی کبھی کبھی اپنی جوانی کی حکایتیں بڑے مزے سے سنایا کرتا تھا اور یہ قصّے مکان میں رہنے والوں کے ساتھ ساتھ محلے والوں کی بھی تفریح کا سامان بن گئے تھے!

بال سفید ہوتے ہی اس کے فطری تقاضے عمر کے بوجھ تلے دب تو چکے تھے لیکن جب بھی کوئی نوجوان لڑکی یا عورت اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی تو وہ اُسے گھور گھور کر ابھی بھی بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہتا تھا! اس کی یہ حرکتیں بھی دیکھنے والوں کو اشتعال دلانے کی بجائے تفریح کے مواقع فراہم کرتی تھیں شرارتی قسم کی لڑکیاں جب جان بوجھ کر اُسے چڑانے کے لیے اس کے سامنے بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتی تھیں تب وہ اپنی خوبصورتی سے تراش کی ہوئی سفید مونچھوں کو اپنی کمزور انگلیوں سے سنوار کر تکیہ بغل میں دبوچ کر انھیں ایسے دیکھتا رہتا تھا جیسے کوئی نواب اپنے حرم میں کوئی دلکش رقص دیکھ رہا ہو! کبھی کبھار جب وہ اپنے اِرد گرد لوگوں کی کیفیت بھانپ لیتا تو وہ چارپائی سے اُتر کر فرش پر ایسے ٹہلنے لگتا جیسے کوئی شہنشاہ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو کر دُشمن کا مقابلہ کرنے لگا ہو! یہ بھی ایک تفریح کا سامان ہوتا تھا!!

بوڑھے شیر کی طرح جب وہ گرجنے لگتا تو اس کی زبان اس کے مسوڑوں سے پھسل کر ایسے باہر آنے لگتی جیسے کوئی سانپ سپیرے کی پٹاری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو! یہ اس کے غصّے کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا لیکن مکان میں رہنے والے کالج کے لڑکے لڑکیاں صرف اس کو چڑھانے کی خاطر کہتے رہتے ہیں کہ لالہ کو امریکہ میں آسانی سے ایک پچاس برس کی میم مل سکتی ہے! بلکہ اپنے ملک میں تو کنواری لڑکی بھی مل سکتی ہے! پھر لالہ ہاں کہہ دے تو مہورت نکالا جائے! فوراً شادی کروانے کی خاطر!!

دینو شاہ ایسی باتیں سننے کا عادی ہے! کبھی بھڑک کر بولنے والوں کو گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتا رہتا ہے اور کبھی خوش ہو کر اپنے کرایہ داروں کی مدد کرتا رہتا ہے! کبھی وجد میں آ کر بچوں اور لڑکے لڑکیوں کو مٹھائیاں کھلاتا ہے اس لیے وہ تب تک سب عمر کے لوگوں میں بے حد مقبول تھا جب تک اس نے گوبند کو اپنے بغل والا کمرہ رہنے کے لیے دیا تھا! تب ساری عمارت میں زلزلہ

آ گیا! اور گوبند کی وجہ سے روز کے جھگڑے دینوشاہ کے کرایہ داروں کو چونکاتے رہتے تھے! بلکہ تا حال بھی انتشار کے اسباب ہیں!

گوبند کمرے میں اکیلا نہیں رہتا ہے اس کے ساتھ اس کے بچّے بھی ہیں اور خوبصورت بیوی بملا بھی ہے! ان کے بارے میں کرایہ دار ہی نہیں بلکہ محلے کے تقریباً سب ہی لوگ چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں! اور رنگین مزاج دینوشاہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں! حالانکہ مکان میں اور بھی حسین عورتیں رہتی ہیں لیکن بملا کی طرف بڑھتی ہوئی دینوشاہ کی توجہ کسی بھی کرایہ دار سے چھپی ہوئی نہیں ہے! دینوشاہ کی عمارت میں رہنے سے پہلے بملا چند کرایہ داروں اور اڑوس پڑوس کے گھروں میں گھریلو قسم کے چھوٹے بڑے کام کیا کرتی رہتی تھی۔ وہ کب اور کیسے دینوشاہ کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی یہ کوئی نہیں جانتا ہے! مگر یہ سب جانتے ہیں کہ وہ دینوشاہ کے سارے کام کرتی رہتی ہے! ایک بار کمرے میں داخل ہو کر وہ دن ڈھلنے تک وہاں سے نکلتی نہیں ہے! گوبند خود دن بھر مچھلیاں پکڑتا رہتا ہے اور شام کو ریڑھی لگا کر تلی ہوئی مچھلیاں بیچتا رہتا ہے اور گئی رات گھر لوٹتا ہے! بچّے دن بھر اسکول میں رہتے ہیں اور کمرے میں ان کی اکلوتی بیٹی رادھا رہتی ہے! وہ بھی صحن میں میز لگا کر محلے والوں کے دُھلے ہوئے کپڑوں پر استری کرتی رہتی ہے! یوں بملا کو تقریباً سارا دن دینوشاہ کے کمرے میں گزارنے کا موقع مل جاتا ہے! اور یہ حقیقت تمام کرایہ دار بخوبی جانتے ہیں!

بملا کی عمر یوں تو تیس سال سے زیادہ نہیں لیکن گاؤں کی اس صحت مند عورت کا چہرہ و جسم ایسا ہے کہ دینوشاہ کی مرحومہ بیٹی کے پرانے مگر رنگ برنگے کپڑے پہن کر وہ اپنی بیٹی رادھا کی بڑی بہن نظر آ رہی ہے! آدھی رات کو میاں بیوی کے جھگڑوں، کرایہ داروں کی گوبند کو نکالنے کی مانگوں کو، دینوشاہ اور بملا کے قریب کے زاویوں کو بار بار اُجاگر کرنے کے باوجود جب دینوشاہ کی ٹوکا ٹوکی سے روکا جا رہا تھا تب وہ بملا، دینوشاہ اور گوبند، تینوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں!

شروع شروع میں چند امن پسند عمارت میں رہنے والے کرایہ دار، بلکہ اڑوس پڑوس میں رہنے والے عزّت دار لوگ گاہے بگاہے محلّے والے بھی بیچ بچاؤ کے لیے دوڑ پڑتے تھے لیکن اب دینوشاہ کی ضد کی وجہ سے یہ ناگوار شور غل برداشت کرنے کے ویسے ہی عادی ہو گئے جیسے کسی بڑے ریلوے اسٹیشن کے پڑوس میں رہنے والے لوگ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ریل کے انجن کی چیخ اور لگاتار پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے عادی ہو جاتے ہیں!

گوبند کی گالیاں سُن کر بملا بھی چیختی چلاتی رہتی ہے! تینوں بچے گہری نیند سے جاگ کر

روتے روتے پھر سو جانے کے عادی ہو چکے ہیں! مگر اپنے سولہویں سال میں قدم رکھنے والی رادھا کی کیفیت الگ ہے! وہ گہری نیند میں سوئی پڑی رہنے کی دِکھاوٹ کرتے ہوئے اپنے والدین کے جھگڑوں کی وجہ تلاش کر رہی ہے! خاص طور پر تب جب آدھی رات کو میاں بیوی ایک دوسرے سے اُلجھ کر، اپنی سرگوشیانہ گفتگو کو اچانک ایک ڈراؤنے شور میں بدل دیتے تھے! پھر ایک دوسرے کو نوچ نوچ کر جب الگ ہو جایا کرتے تھے تب گوبند بوکھلا کر اپنی چارپائی چھت پر لے جا کر سو جایا کرتا تھا! جبکہ بملا یا تو بچوں کو سُلا کر رات بھر سو جایا کرتی تھی یا پھر کمرے سے نکل جایا کرتی تھی! رادھا یہ جان چکی تھی کہ اس کے باپ کو محلے میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا ہے، اس لیے وہ اس کو نکالنے کے جتن کرتے رہتے تھے! مگر دینوشاہ اُن کے ارادوں کو بے اثر بنا دیا کرتا تھا! حالانکہ وہ گوبند سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے جتنی اُس کے کرایہ دار، یا اڑوس پڑوس میں رہنے والے بدصورت اور بد دماغ کردار سے کرتے ہیں! رادھا یہ بھی جان گئی ہے کہ دینوشاہ اُس کی ماں کا حمایتی ہی نہیں بلکہ اُس کا مددگار بھی ہے! چولہا چلانے کے اخراجات ہر ماہ دیتا رہتا ہے، بدلے میں بملا سے کچھ بھی نہیں لیتا ہے! کمرے کا کرایہ بھی نہیں!!

سردیوں کی ایک رات جب بملا دینوشاہ کے اشارے کے ساتھ ہی ایک پالتو بلّی کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تب تاک میں بیٹھے کرایہ داروں کا شک یقین میں بدل گیا تھا اور وہ چشم دید گواہ بن کر اس بات کی تصدیق کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے کہ دینوشاہ نے بملا کو اپنی رکھیل بنا کر رکھا ہوا ہے!

لیکن ہنگامے صرف آدھی رات کو ہی کیوں ہوتے رہتے ہیں؟ جبکہ بملا دن بھر دینوشاہ کے قرب میں رہتی ہے؟! کیا وقت مقرر ہوتا ہے؟ حقیقت ایک راز ہے یا ایک معمہ؟

رادھا نے اُسی رات گہری نیند کی دِکھاوٹ کرنے کی بجائے اپنی ماں کا پیچھا کیا تھا! بملا دینوشاہ کے کمرے میں داخل ہوئی تھی! دروازہ بند کر کے وہ دینوشاہ سے باتیں کرتی رہی تھی! جبکہ رادھا دروازے سے چپک کر دونوں کی بے باک گفتگو سن رہی تھی!

ایک ایک لفظ اُس کے نابالغ ذہن کو یوں کریدتا ہوا اس کو چونکاتا جا رہا تھا گویا اُس کے سانسوں کو کبھی دبوچتا جا رہا تھا اور کبھی رفتار تیز کرتا جا رہا تھا! پھر جانے یہ اُس کی دانش کا عمل تھا یا الہام کا نتیجہ، وہ شام ہوتے ہی، سر درد کا بہانہ بنا کر اپنے چھوٹے سے کمرے سے نکل کر برآمدے میں سو گئی تھی! اور پھر اُس نے اپنے باپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا! اُس رات کوئی

ہنگامہ نہیں ہوا تھا!

اُس کے بعد ہنگامے ہوئے ہی نہیں تھے!!

اس غیر متوقع مگر خوشگوار تبدیلی نے سارے محلے والوں کو چونکا دیا تھا! اس کے بعد تاریک راتیں خاموشی سے گزرتی گئیں! لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ دینو شاہ نے گوبند کا منہ سکّوں سے بند کر دیا ہوگا! پھر رفتہ رفتہ لوگ بھول ہی گئے کہ گوبند اور بملا کا کبھی جھگڑا ہوا کرتا تھا!

تقریباً چار مہینے کے بعد سارے محلّے میں ایک بار پھر تشویش پھیل گئی تھی!

محلے والے ایک ایک کر کے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جمع ہو رہے تھے اور جب دینو شاہ کو پولیس نے طلب کیا تو اُس پر واقعات کی تفصیل سنتے ہی بجلی گر پڑی! چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور وہ جب منہ لٹکائے ایس. ایچ. او صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تھا تب بملا کا بیان قلمبند ہو رہا تھا!!

بملا کا ہر لفظ سسکیوں و ہچکیوں میں ڈوبا جا رہا تھا اور اس کے بیان کا ایک ایک لفظ جہاں گوبند پر آگ برسائے جا رہا تھا وہاں دینو شاہ کو بھی برقی جھٹکوں کی مانند ہلا رہا تھا! گوبند بملا اور دینو شاہ تینوں ایسے تڑپ رہے تھے جیسے وہ دلدل میں دھنسے جا رہے تھے! جبکہ رادھا کمرے کے ایک کونے میں ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ رہی تھی! اس کے کپڑے گیلے تھے اور اس کے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے! بکھرے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر یوں گر رہے تھے جیسے وہ اس کے حال پر ایک ہمدرد چشم دید گواہ کی طرح حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہائے جا رہے تھے! آس پاس کھڑے لوگ اُسے یوں دیکھ رہے تھے گویا نمائش گاہ میں رکھا ہوا عجوبہ دیکھ رہے ہوں!!

"یہ سب کیا ہے؟" دینو شاہ کی ٹوٹی آواز نے سب کو چونکا دیا! ایک وقفے کے لیے حاضرین اس کے چہرے کو دیکھتے رہے اور خاموشی چھا گئی! جو لوگ کچھ بھی نہیں جانتے تھے وہ بھی مشکوک نظروں سے دینو شاہ کو دیکھنے لگے! اور سوالات کر بیٹھے!

"رادھا کو پولیس نے آج صبح گرفتار کیا ہے شاہ جی؟۔؟؟"

ایس. ایچ. او صاحب نے قلم میز پر رکھ کر کہا "رادھا خودکشی کرنا چاہتی تھی اور اس نے اقبال جرم کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے! کنواری ماں! اس غفلت کے ذمہ دار اس کے والدین ہیں شاہ جی! انھوں نے چند رنگین راتیں بسر کرنے کی خاطر راستے کا کانٹا تو صاف کر دیا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک کمسن معصوم سولہ سالہ لڑکی ... برآمدے میں تنہا سو کر، کسی

بھی جنس زدہ وحشی کی ہوس کا شکار ہوسکتی ہے! رادھا اپنے ماں باپ کی خاطر قربان ہوگئی ہے! اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ماں باپ کے جھگڑے کبھی ختم نہیں ہو پاتے!"

ایس. ایچ. او نے جب اپنی مختصر تقریر ختم کردی تو گوبند کو ایسا لگا جیسے وہ ایک اونچی چوٹی سے گر کر نوکیلے پتھروں سے ٹکراتا ہوا ایک کھائی کی گہرائی میں ڈوبا جارہا ہو!

محلّے والے کہانی کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور وہ دینوشاہ کو مشکوک و نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہے تھے!

"درندہ" کسی نے زیرِ لب کہا اور یہ لفظ سنتے ہی دینوشاہ چیخ پڑا اور زار زار رو کر فرش پر بکھرے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا جو ہوا کے جھونکوں سے اُڑنے لگے تھے!

لوگوں کی مشکوک نظریں جب سوالیہ نشان بن گئیں تب دینوشاہ اپنی توتلی زبان میں کہنے لگا!

"ہاں ہاں! درندہ! آج بیس سال کے بعد میں اپنی مرحومہ بیٹی کی تحریر سمجھ سکا! اس نے بھی یہی لفظ استعمال کیا تھا! وہ تو بھابھی کی غفلت یا بھائی کی لاپرواہی ہوسکتی تھی لیکن بملا تو ماں ہے! پھر یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ میرا بیٹا بھی رنگین راتوں کا سحر دیکھتے دیکھتے اپنی بن ماں کی بہن کو بھول گیا تھا اور وہ یوں پڑی رہی تھی جیسے درندوں کے سامنے شکار! اس کم بخت حبشی نوکر نے بھی میری معصوم بیٹی کو ایسے ہی!"

اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اُس کی زبان رُک گئی اور وہ رادھا کو دیکھنے لگا اُس کے دل سے ایک ہوک اُٹھی اور یوں لگا جیسے اس کی بیٹی کی تحریر ایک تصویر بن کر اسے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے وہی الفاظ دُہرانے لگی ہو! حبشی نوکر درندہ ہے! اسے کچل ڈالو یا پکڑ لو، اس معنی خیز جملے کا مطلب وہ بیس سال کے بعد سمجھ گیا تھا اور وہ اپنے تھرتھراتے ہونٹوں پر مشکل سے قابو پا کر تسلیاں دینے لگا!

جب میری آنکھوں میں تیز بینائی تھی تب چمک دمک نے یوں گھیر لیا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا! اب جبکہ میری بینائی کمزور ہے مجھے سب کچھ نظر آنے لگا ہے میں حبشی کو نہ تو پکڑ سکا اور نہ ہی اسے کچل سکا! لیکن اس شخص کو ضرور تلاش کروں گا جو رادھا کو مسل کر بھاگ ہے!

یہ کہتے ہی دینوشاہ غصّے سے لال ہوگیا!!

بملا نے آنسو پونچھ لیے اور رادھا کو گلے سے لگا کر ملتجی نظروں سے دینوشاہ کو دیکھتی رہی!

دینوشاہ اس کا حقیقی باپ نہ سہی لیکن باپ جیسا سلوک ضرور کرتا ہے! اور اسے اکثر اپنی مرحومہ بیٹی کے نام سے پکار کر اپنے کلیجے کی آگ کو ٹھنڈا کیا کرتا تھا!!

OO

وِشوامتر

جیپ کے ہارن نے وِشوامتر کو چونکا دیا! اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور شانتی اس کی چنگل سے آزاد ہوکر فوراً سرسوتی ماں کے سینے سے لپٹ کر زار زار رونے لگی!

وِشوامتر کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح لال تھیں! اس کا چہرہ جو ایک پُرسکون جھیل کی طرح خاموش رہتا تھا، آج ایک سیلابی دریا کی طرح لمحہ بہ لمحہ کیفیت بدلتا رہا تھا! غصّے سے وہ اپنا دماغی توازن اس حد تک کھو چکا تھا کہ اگر آنند آشرم کے احاطے میں پولیس کی جیپ داخل نہ ہوتی تو شاید اُس نے شانتی کا گلا دبا کر اُس کو ختم کر دیا ہوتا!

کھڑکی سے جھانک کر جب اُس نے جیپ سے اُترتی ہوئی ایک عورت کو دیکھا تو اُس کا قہر آلودہ غصہ یوں ٹھنڈا ہوگیا! جیسے ایک دہکتی ہوئی لال لال سلاخ کو پانی کے ٹب میں ڈال دیا گیا ہو!

رُوپ متی! رُوپ متی! اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے اور خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ یوں دوڑنے لگا گویا ایک ہجوم میں کھوئے ہوئے بچّے کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا ہو!

وہ عورت واقعی رُوپا تھی!

رُوپا اچانک اپنے بیڈ رُوم سے غائب ہوگئی تھی اور وِشوامتر رات بھر اپنی رُوپ متی کو یوں تلاش کرتا رہا! جیسے کوئی رِشی مُنی خدا کو تلاش کر رہا ہو!

"رُوپ متی تم کہاں ہو!" وہ رات بھر دیوانوں کی طرح روتا رہا اور مجنوں کی طرح چلتا رہا!

رُوپ متی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے! زندہ ہے یا مردہ؟ جانے کتنے ہی ایسے سوالات تھے جو رات بھر اُس کے جذبات کو گھسیٹ گھسیٹ کر جنون کی طرف لے جا رہے تھے! جبھی تو اُسے چلتے چلتے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو! اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا رہا! جیسے کوئی اس کے آگے آگے دوڑتا ہوا نکل رہا ہو اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی آہستہ آہستہ چلتا رہا جیسے دلدل سے اپنے پاؤں بچا بچا کر چل رہا ہو! کبھی تو یوں ایک سنسان سڑک پر دوڑتا رہا گویا ایک گھوڑا

سوار بہت ہی تیز رفتار سے اپنے دشمن کا تعاقب کررہا ہو! مگر کون تھا اُس کا دشمن؟-؟؟

زندگی میں پہلی بار دُشمن کا عکس اس کے ذہن میں اُبھر کر آج اُس کو اس قدر نہ ڈرار ہا ہوتا تو وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کیوں کر کرتا؟ رُوپا شاید بہت دُور نکل گئی ہوگی! یا وہ کہیں آس پاس اَبدی نیند سو رہی ہوگی وہ رات بھر یہی سوچتا رہا! جبھی تو بار بار قدموں کی آہٹ جھاڑیوں کے پیچھے سنائی دینے والی سرگوشیاں یا دُور دُور سے سنائی دینے والی صدائیں، وہ جھوٹی تسلّیاں ثابت ہو رہی تھیں، جو اس کے شکستہ دل کو عارضی طور پر بہلاتے ہوئے اس کی اَنا کو ٹھیس پہنچا رہی تھیں! وِشوامتر نے دراصل اپنی اَنا کو اتنی بلندی پر پہنچایا تھا جہاں سے اُسے ساری دُنیا ایک فٹ بال نظر آ رہی تھی! یعنی وہ ٹھوکریں مار کر وہ دُنیا کا وجود ختم کرسکتا ہے!— یہ اس کا ارادہ نہ سہی مگر سوچ ضرور تھی! لیکن آج کے اِس سانحہ نے اس کے وجود کو اس قدر کمزور بنا ڈالا تھا کہ عمر کی اونچی اُونچی فصیلیں بھی ان آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھیں، جو وہ غمِ فراق میں بہائے جا رہا تھا!! ایک ٹوٹے باندھ سے اُچھلتا پانی کوئی روک پاتا ہے کیا؟ ایسا وہ محسوس کر رہا تھا!!

اوروں کے رونے دھونے کو، جذبات کی شدّتِ بیان کرنے والا مفکّر آج زندگی میں پہلی بار رو پڑا تھا! فقط اس لیے کہ وصل کی شب ایک قصۂ فراق بن چکی تھی! یہ رات اُس کی سہاگ رات تھی! اور رُوپا اپنی خواب گاہ سے یوں غائب ہوگئی تھی جیسے آسیب کا وجود!

وِشوامتر شہر کا ایک مانا ہوا دانشور ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تخلیق کار بھی ہے! ایک نامور سنگ تراش ہے جس نے شہر سے دُور پہاڑیوں کی گود میں اپنی ایک الگ دُنیا بسا رکھی ہے! ایک ایسی دُنیا جس میں کسی کا دخل نہیں ہے!!

ایک سفید رنگ کا مکان جس کے در و دیوار بھی سفید ہیں! پردے بھی سفید ہیں! فرنیچر سفید رنگ کا ہے! قالین سفید رنگ کے ہیں! فرش سفید رنگ کا ہے! اور جہاں قدم قدم پر سنگِ مرمر کے مجسمے ہیں! ہر طرح کے وہ مجسمے جنھیں وِشوامتر نے خود تراشا ہے! خود سنوارا ہے! جنھیں وِشوامتر نے نام دیئے ہیں! 'رُوپ متی'، 'پھول متی' وغیرہ وغیرہ! اور وہ ان مجسموں کے ساتھ میں رہتا ہے! ان کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے! ان سے مشورے کرتا رہتا ہے! ان کو ہدایتیں دیتا رہتا ہے! ان کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ ملا کر ناچتا رہتا ہے! اور یوں وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتا رہتا ہے! اوروں کے لیے یہ پاگل پن سہی! گھر کے نوکروں کے لیے یہ جادو ٹونا یا روحانی کرشمات سہی، مگر یہی وِشوامتر کی دُنیا ہے! اُس کی اپنی بنائی ہوئی دُنیا—!! کبھی کبھار اپنی سفید

رنگ کی کار میں وہ شہر چلا بھی جاتا ہے! وہ بھی بقول اس کے اپنی فیملی کے لوگوں کو تلاش کرنے کے ارادوں سے وہ مارا مارا پھرتا رہتا ہے! یعنی پتھر کے اُن ٹکڑوں کو جمع کرنے کی خاطر! جنھیں وہ تراش کر اور پھر نام دے کر کسی نہ کسی نئی تھیوری یا نئے فلسفے کے ساتھ وابستہ کر کے پریس کانفرنسیں دیتا رہتا ہے، حالانکہ اُن فلسفوں سے دُنیا اُوب گئی ہے! مگر تصورات کی اُس مصنوعی دُنیا سے اُس کو کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کسی نے نہیں کی ہے! کیونکہ رشتہ داروں کو، دوستوں کو، ہم عصروں کو، حسین دوشیزاؤں کو، یا پھر منتظر مشاہدین یا ناقدین کو کبھی قربت کا شرف تک نہیں بخشتا ہے! جبھی تو وہ آج ایک تماشا بن چکا ہے! اور دُنیا تماشائی!

ایسے ہی وِشوامترا اپنی زندگی کے پچاس سال گزار چکا ہے! اور اب اس کے سفید لباس کا ساتھ اس کی سفید لمبی داڑھی اور لمبے لمبے سفید بال بھی دے رہے ہیں! مگر یہ رِشی منیوں کی طرح رہنے والا سنگتراش رُوپا کو دیکھتے ہی یوں بدل گیا تھا جیسے بادلوں کے وجود سے موسم!

رُوپا کو وِشوامتر نے پہلی بار آنند آشرم کے دروازے پر تب دیکھا تھا! جب وہ ساتھ بہتی ہوئی ندی سے ایک بڑا پتھر نکال رہا تھا! رُوپا کو دیکھتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی انجانی آرٹ گیلری میں اس نے اپنا ہی تراشا ہوا مجسمہ دیکھ لیا ہو! رُوپا سامنے سے نکل گئی تھی تب وِشوامتر کو پھر جب یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی تخلیق کو اُنگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سکھا رہا ہو!

سیدھی سادھی سفید رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے، اپنے چہرے کے آدھے حصّے کو گھونگھٹ سے ڈھانپ کر وہ واقعی ایسے چل رہی تھی جیسے ایک سنگِ مرمر کا بُت خود بخود چلنے پھرنے لگا تھا!

پہلی بار جب رُوپا نے معنی خیز نظروں سے ایک اجنبی کو دیکھا تھا! تب وہ سہم کر سرسوتی ماں کے کمرے میں چھپ گئی تھی! مگر دوسری ملاقات میں وِشوامتر نے جانے کیسے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا اور وہ تقریباً روز ہی آنند آشرم کے آہنی گیٹ سے جھانک جھانک کر وِشوامتر کو یوں دیکھتی رہی تھی جیسے جنت سے آئی ہوئی اپسرا مینکا مہارشی وِشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی! پھر ایک دن وِشوامتر نے ندی سے وہ پتھر نہیں نکالا تھا اور وہ رُوپا کو رُوپ متی کا نام دے کر اُسے چاہنے لگا تھا!

آنند آشرم کے ایک کمرے میں رہنے والی رُوپا کی بہت ہی پیاری سہیلی شانتی وِشوامتر کے قریب آنے کی کوششیں کرتی رہتی تھی، مگر اُس کے پری چہرہ اور دِل کش جسم کے باوجود وہ اُس کو کیوں قریب آنے نہیں دیتا تھا؟ یہ اُس کے لیے وجہِ تجسّس بھی تھا اور اُس کو افسردہ کرنے کا

معقول مواد بھی ہوا کرتا تھا!

وِشوامتر کے انتخاب نے اوروں کو بھی چونکا دیا تھا! کیونکہ دونوں کا مقابلہ کرنا ایک مضحکہ خیز عمل ہے! شانتی حسین وجمیل ہے! نازنین ہے! جبکہ رُوپا فقط نام کی رُوپا ہے! ایک پتھر جیسے چہرے میں مشکلاً نظر آ رہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اُبھرے ہوئے گال ہیں! موٹے موٹے ہونٹ جو بہت کم ہلتے ہیں اور جب ہلتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے پھاٹک کھولی جا رہی ہو! مگر ہر سوال کا جواب 'ہاں' یا 'نا' میں دیتی رہتی ہے! اتنا ہی نہیں، اُس کو پولیس نے سڑکوں پر کئی بار بھیک مانگتے ہوئے پکڑا تھا اس لیے آنند آشرم میں داخل کروایا گیا تھا! جبکہ شانتی ایک دیوداسی لڑکی تھی جسے سرسوتی ماں نے بچپن سے پالا پوسا تھا! سرسوتی ماں دل ہی دل میں رُوپا سے سخت نفرت کرتی ہے! جبکہ وہ شانتی سے بہت پیار کرتی ہے! گویا وہ گود لی ہوئی بچّی نہیں بلکہ اس کی اپنی بیٹی ہے مگر جب وِشوامتر نے رُوپا کا ہاتھ مانگا تب سرسوتی ماں نے شانتی کا ہاتھ ہی دینا چاہا! سرسوتی ماں کی تجویز سنتے ہی وِشوامتر پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی تھی جیسے ایک مہارِشی شراپ دینے لگا تھا! پھر سرسوتی دیوی تو کیا دُنیا وِشوامتر کے قہر سے لرز کر خاموش ہو گئے تھے!

شادی طے ہو گئی تو رُوپا کی نظریں شرم سے جھک گئی تھیں جبکہ شانتی یوں بھڑک اُٹھی تھی جیسے بجھتے ہوئے شعلوں پر پٹرول کے چھینٹے ڈال دیئے گئے ہوں! اس کی آنکھیں شیرنی کی طرح چمک اُٹھی تھیں پھر لب تھرتھرائے تھے! اُس نے وِشوامتر کے قریب آ کر کچھ کہہ بھی ڈالا تھا! مگر اُس نے پھر کیا کسی نے بھی اس کی دھیمی آواز نہیں سُنی تھی! پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سسکیوں میں ڈوب گئی تھی! دونوں سہیلیوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا! تو شانتی اپنے بال نوچتی، چیختی چلاّتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی!

شادی ہوئی تو تھی مگر شادی کیا تھی؟ بس وِشوامتر کی ضد! اس نے رُوپا کو کار میں بٹھا دیا تھا! اور دونوں اِک طرف چل پڑے تھے! شانتی کرب و کراہ پر قابو پا کر سفید کار کو تب تک دیکھتی رہی — جب تک کار میں بیٹھے سفید پوش دولہا دُلہن نظروں سے اوجھل نہ ہوئے تھے!

گاؤں میں ہنگامہ برپا ہوا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا! غالباً یہ پہلا موقع تھا جب لوگوں نے دولہا دُلہن کو سفید کپڑوں میں دیکھا تھا! اس سے پہلے لوگوں نے وِشوامتر کو پتھروں سے باتیں کرتے دیکھا تھا! جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ ہنس رہے تھے جو نا سمجھ تھے وہ حیران تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مگر وِشوامتر کو لوگوں کی پرواہ نہ تھی! جب فکر نہیں تو ذکر کس بات کا ہوتا تھا؟ شاید

یہی سوچ کر آج بھی وہ اپنے مجسّموں سے معمول کی طرح پیار کرتا رہا جبکہ رُوپا اپنی خواب گاہ میں گئی رات تک وِشوامتر کا انتظار کرتی رہی!!

آج اس کی سہاگ رات تھی! مگر وِشوامتر کے لیے یہ رات مرادوں کی رات تھی! آج ایک عاشق اور معشوق کا ملن نہیں تھا! ایک تخلیق کار اور اس کی تخلیق کا آمنا سامنا تھا! اُس کا تصوّر پتھر کی دیواروں سے آزاد ہو کر چلنے پھرنے لگا تھا! اور وہ اپنی کامیابی پر اتنا ہی خوش تھا! جتنا کروڑوں سال پہلے مہارِشی وِشوامترا اپنے اِرد گرد ایک نئی کائنات کو جنم دے کر مسرور تھا! اپنی کامیابی کا ڈنکا بجاتے ہوئے جب وِشوامتر نے خوابگاہ کا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا!! اس کی رُوپ متی غسل خانے میں بھی نہیں تھی! وہ مکان کے کسی کمرے میں بھی نہیں تھی! بلکہ وہ احاطے کے کسی کونے یا گاؤں کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھی!

یقیناً اُسے کوئی اِغوا کر کے لے گیا تھا! اور ساتھ میں اس کی کار اور تمام پونجی بھی!!

مکان میں گویا ایک بھیانک زلزلہ آ گیا تھا! اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے صدائیں دیتا رہا!

اس کی تپسّیا کسی راکھشش نے بھنگ کر دی تھی! اور زندگی میں پہلی بار ڈر ایک سوالیہ نشان بن کر اس کا تعاقب کرنے لگا تھا! لیکن پھر بھی اپنی اَنا کی اونچی اونچی دیواروں کے سہارے چل کر وہ رُوپا کی تلاش میں نکل پڑا! اور رات بھر چلتا رہا! اس کا غصّہ سیمابی کیفیت اختیار کر چکا تھا، اور چڑھتا ہوا پارہ بدخیالی کو جنم دے رہا تھا! انتقام غصّہ کے شعلوں کو ہوائیں دے رہا تھا اور جب بھی وہ دشمن کے بارے میں سوچا کرتا تھا تب شانتی کا یا پھر سرسوتی کا چہرہ سامنے آجایا کرتا تھا! گویا دونوں چہرے اُس کے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے! اور دونوں کی ڈراؤنی شکلیں ڈائنوں سے ملتی جلتی نظر آ رہی تھیں!!

پھر وہ دونوں کی تلاش میں آنند آشرم پہنچ گیا تھا! دونوں کو ایک ہی کمرہ میں دیکھتے ہی وہ اُن پر یوں ٹوٹ پڑا تھا گویا اس نے ایک اُونچی عمارت کے اندر ٹائم بم رکھتے ہوئے دو مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا! مگر اس سے پہلے ہی کہ سرسوتی ماں کچھ کہتی شانتی کچھ سناتی یا وِشوامتر جواب طلب کرتا، ہارن کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا! اور اگر وِشوامتر رُوپا کو دیکھتے ہی احاطے میں نہ چلا گیا، ہوتا تو شاید کچھ بیان کرنے سے پہلے یا کچھ عیاں ہونے سے پہلے ہی سیلابی دریا ان کو اپنے ساتھ بہا کے چل دیا ہوتا!

''رُوپ متی!''

وِشوامتر کو اپنا پیار بھی ملا تھا اور اپنا کھویا ہوا وِشواس بھی تخلیق کی قربت اور تخلیق کا اعتماد بھی!

مگر تب اچانک زبردست انکشاف ہوا!

''وِشوامتر صاحب! آپ کی رُوپ متی ایک پیشہ ور مجرم ہے جو ایک خطرناک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے! کبھی گھریلو نوکرانی، کبھی دھوبن، کبھی بھنگن، کبھی آیا، کبھی دائی اور کبھی بھکارن بن کر وہ آس پاس کے شہروں میں کتنے ہی گھر لوٹ چکی ہے! آشرم میں پناہ لے کر وہ پچھلے چھ ماہ سے ہماری نظروں سے اوجھل رہنے میں کامیاب تو ہوگئی مگر آج پکڑی گئی ہے! وہ بھی شاید اس لیے کہ کار میں پٹرول نہیں تھا ورنہ......!

انسپکٹر شرما نے رُوپا کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا!

''نہیں ایسا فریب ناممکن ہے! آپ کی آنکھیں دھوکا کھا گئی ہیں!'' وِشوامتر چلاّنے لگا!

''دھوکا تو آپ کھا گئے ہیں رِشی مہارج! فقط اس لیے کہ پتھر کے آئینوں میں عکس دیکھنے کے آپ عادی ہو چکے ہیں، ہم نہیں!! اپنے اِرد گرد خود ہی دُھند پھیلا کر اپنے تصور کے دُھندلے خاکے دیکھ دیکھ کر آپ اصلی چہروں کی پہچان نہیں کر پائے ہیں! ٹھنڈے پتھروں کو چھو کر آپ حقیقت کی گرمی اور قدرت کی تپش کو محسوس کرنے کی عادت بھول گئے ہیں! آپ ایک مصنوعی دُنیا میں رہتے ہیں! ایک ایسی دُنیا میں جو ریت کے محلوں کی طرح ریزہ ریزہ بکھر کر آپ کی آنکھوں کو چبھنے لگی ہے! یا موم کے محل کی طرح پگھل کر آپ کے ہاتھ پاؤں جلا رہی ہے!

اس سے پہلے کہ وِشوامتر انسپکٹر شرما کی تنقید کو چیلنج کرتا! شانتی ایک زخمی بلّی کی طرح رُوپا پر ٹوٹ پڑی! اسی کشمکش میں رُوپا کے سینے کے اُبھار سے نوٹوں کے بنڈل نکلے! پکڑ دھکڑ میں اس کا مصنوعی نسوانی وقار بھی دسہرے کے راون کی طرح زمین پر گر گیا! اور ایک چھوٹے سے قد کے نیپالی کو دیکھ کر حاضرین سکتے میں آئے!

'رُوپا! تم' وِشوامتر کی آنکھیں باہر آنے لگیں تو شانتی نے چیخ کر کہا!

''رُوپا نہیں! رُوپ سنگھ — میرے ہونے والے بچّے کا باپ! مجھ پر ٹھونسا ہوا ایک پاپ جسے مَیں نے چھپانا نہیں چاہا! مگر آپ دیکھ نہ سکے! آپ تو کیا دُنیا بھی اس فریب کو دیکھ نہ سکی!؟''

یہ کہتے ہی وہ ایک زخمی کبوتر کی طرح زمین پر گر گئی اور سرسوتی ماں اپنے بچّے کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!

دوسروں کو گیان دینے والی خود کیسے انجان رہی؟ وہ یہ سوچتی رہی جبکہ رُوپا دانت پیستا ہوا

گالیاں بکتا ہوا، بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا خود ہی پولیس جیپ میں بیٹھ گیا! اُس کے لیے گویا یہ عارضی جنگ بندی تھی!

رات کو جب معمول کے مطابق وِشوامترا اپنے مکان میں داخل ہوا تو اپنے ہی تراشے ہوئے مجسّموں کو دیکھ کر ڈرنے لگا!!

اس نے معمول کی طرح آج بھی باتیں کرنا چاہیں! مگر ہر قدم پر اُسے یوں محسوس ہوا! جیسے وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہو! اور اس کو اپنے قہقہوں کی فاتحانہ گونج کی بجائے آج اُس کو ہر طرف سے پُراسرار ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں!

وہ اپنے آپ سے گھبرانے لگا! غالباً ویسے ہی جیسے زہریلے بموں کے خالق اپنی تخلیق دیکھ کر کبھی کبھار محسوس کرتے ہوں گے! اپنے آپ سے خوفزدہ ہو کر!!

اپنی نرالی کیفیت پر قابو پالینے کی کوشش کرتے ہوئے وِشوامتر، تیشے کو دُور پھینک کر، ہتھوڑے سے ساری رات اپنے ہی تراشے ہوئے مجسّمے توڑتا رہا!

سحر ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی بنائی ہوئی دُنیا مسمار کر چکا تھا! صبح ہوتے ہی اُسے جس شدّت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا تو زندگی میں پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو! اور تصور کے دُھندلے دُھندلے خاکوں کی بجائے اُسے اپنے رشتہ دار، ناطے دار، دوست اور پڑوسی یاد آتے رہے!! پھر اچانک شانتی یاد آئی! غالباً اس لیے کہ اُسے بدلے ہوئے حالات میں شانتی ہی کی ضرورت تھی!!

OO

انجلی کی کہانی

ترنّم اُس انجلی کی باتیں تو نہیں کر رہی تھی جو رام بھگت ہنومان کی ماں تھی! بلکہ اُس انجلی کی باتیں بھی نہیں کر رہی تھی جو مہاتما بدھ سے پیار کرتی تھی! وہ جو بھی کہہ چکی تھی وہ اُس بد بخت انجلی کی ایک سچی کہانی ہے جو وہ اپنے جسم کو نوچنے والوں کو سنانا چاہتی تھی مگر وہ بے صبر ہو کر اس کو ایک گدھ کی طرح چونچ مار کر چلے جاتے تھے!

ترنّم کے ہر جملے میں شکتی ماں کے سوزیدہ نغمے کی دل کو چھو لینے والی آواز سنائی دیا کرتی تھی مگر لمحہ بہ لمحہ اس کا دماغ یوں اُبل پڑتا تھا کہ اُسے ترنّم کے بے حد خوبصورت چہرے کو بھاپ سے جلا کر مسخ کرنے کو جی چاہتا تھا تا کہ وہ ترنّم کے خلاف فلک شگاف نعرے لگانے والوں کے جوش کو ٹھنڈا کر کے وہ نیک کام کر پاتی جس کے لیے اُس کو ایک غیر سرکاری تنظیم نے، خاص طور پر ترنّم کو اُس کی بدکاری اور اُس کے معاشرے کو جنسی آلودگی سے پاک رکھے جانے کے لیے نہایت ادب واحترام کے ساتھ بطور ایک منصفہ بلایا گیا تھا! مگر وہ حیران تھی کہ جس عورت کو نعرے لگانے والے نوجوان اور بزرگ اسکول اور کالج کے لڑکے بھی اپنے جال میں پھنسانے کے چکّر میں ان کو ہاتھ پکڑ کر اپنے کنجر خانے میں لے جانے کے سنگین الزامات لگا رہے تھے، وہ ترنّم کے شیریں لہجے میں سُنے جملے سن کر یوں خاموش ہو گئے تھے گویا ترنّم نے اُن سب کے کھلے منہ میں اُبلے ہوئے گرم آلو ڈال دیے تھے جو نہ ان کو کچھ بولنے دے رہے تھے اور نہ آلوؤں کو حلق کے نیچے اترنے دے رہے تھے! اس کشمکش میں وہ نظریں جھکا کر کھسک کر واپس کیوں لوٹ کر آئے تھے!

کھچا کھچ بھرا ہال جب مکمل طور پر خالی ہو گیا تو منچ پر ترنّم اور شکتی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اس لیے میڈیا والوں کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں ان ہی دو عورتوں پر مرکوز ہیں، ہال خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے! دونوں ایک دوسرے کے سامنے! آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کی کیفیت بھانپنے کی کوشش کر رہی ہیں اور میڈیا والے ان کی بات چیت کرانے کے

لیے بار بار اشارے دے رہے ہیں! مگر بے آواز ریکارڈنگ ہو رہی ہے!

شکتی ماں گیروی رنگ کے کپڑوں، گلے میں رودراکش کی مالا ڈال کر، اپنے لمبے اور چمکیلے بالوں کو کھلے چھوڑ کر اور ماتھے پر سیندور کی بجائے چندن کا تلک لگا کر ایک باوقار سنیاسن لگ رہی ہے جبکہ اپنے سر کو ڈھک کر ایک سفید پوشاک میں اپنے پُرکشش جسم کی بناوٹ، ایک پری چہرے پر پڑ رہے دو گڑھوں، چمکیلے دانتوں والی بغیر میک اپ کے گلابی ہونٹوں اور جھیل جیسی گہری آنکھوں اور چہرے پر ایک کمسن لڑکی کی معصومیت کیمرے کی آنکھ سے جھانکنے والی میڈیا ٹیم کے ہر فرد کو ترنم گویا جنت سے بادلوں کی سیڑھیوں سے اُتر کر، بادلوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر ایک پری خوش قسمتی سے ان کے کیمرے میں قید ہو گئی ہے!

شکتی ماں کو وہ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی اونچے خاندان سے اپنا تعلق توڑ کر ہری دوار میں خود اپنا شرادھ کر کے رشتے ناطے توڑ کر، دنیاداری سے منہ موڑ کر سنیاسن بن گئی ہے! وہ اپنے آشرم میں پوجا پاٹھ کرتی رہتی ہے یا پھر دھارمک (اساطیری) کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے، ہاں مگر، اگر عورتوں کی عزت و آبرو کا تحفظ کرنے والی تنظیم والے اُس کو بطور ایک مہمانِ خصوصی بلاتے ہیں تو وہ کبھی انکار نہیں کرتی ہے! لیکن ایک مخصوص انداز میں! یعنی اُس کی آمد پر اُس کی جے جے کار ہونا لازمی ہے! میڈیا کی کوریج (Coverage) بھی ہونی چاہیے! منچ پر اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہونا چاہیے! پھر وہ اپنے معمول کے مطابق چند بھجن سناتی ہے اس کے بعد کوئی سبق آموز کتھا سنا کر مسئلے مسائل پر غور کرتی ہے، کوئی سنجیدہ معاملہ ہو تو کسی کی وکالت، وضاحت، تجاویز، مفاہمت، کسی کی پکار، فریاد وغیرہ کے پس منظر میں وہ آنکھیں یوں بند کرتی ہے گویا جیوری (Jury) کی بجائے فیصلہ سنانے سے پہلے بھگوان سے منظوری لیتی رہتی ہو! مگر آج ان کی ضروریات پوری نہیں ہوئی تھیں! آمد پر جے جے کار نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہال کے اندر جسم فروش عورت ترنم کے خلاف اشتعال بلکہ اخلاق سے گرے ہوئے نعرے گونج رہے تھے! یہ اس کے لیے ایک زبردست جھٹکا تھا!

شکتی ماں کو دوسرا جھٹکا تب لگا جب اس کے ہال میں داخلے کے وقت میڈیا والوں کی چکا چوندھ کرنے والی روشنیاں اس کے چہرے کی بجائے نعرے لگانے والوں پر مرکوز تھیں! مشکل سے منتظمین نے شکتی ماں کو منچ پر لے جا کر جوں ہی مائک اُس کے سامنے رکھی، ترنم نے منچ پر جاتے ہی مائک چھین کر بولنا شروع کر دیا تھا! ترنم کی آواز میں روانی تھی، گویا وہ نعرے لگانے والوں کو اپنی آواز سرگوشیوں میں سنا رہی تھی! جو اُن کی خاموشی کی وجہ بن کر آگے پیچھے، دائیں بائیں

کھڑے لوگوں کو بھی سنائی دے رہی تھی! کچھ لوگوں کو سائرن کی طرح اور کچھ لوگوں کو مندر کی گھنٹیوں کی طرح! شکتی ماں سمجھ گئی تھی کہ یہی وہ عورت ہے جو جسم فروشی کا دھند کرتی ہے اور یوں ایک بازاری عورت ہی ایک سنیاسن کی قدر نہ کر کے اُس کے سامنے سے مائک چھین سکتی تھی! سریلی رس بھری آواز میں سہی ترنّم جو بھی کہہ چکی تھی وہ شرم وحیا کی اونچی فصیلوں کو پھاند کر کہہ رہی تھی!!

''مجھے میرے سنہری بالوں سے گھسیٹ کر ایک خارش زدہ کتّے کی طرح شہر کے حدود سے باہر پھینک کر، میری لمس سے بچاؤ کرنے والو! مجھے میرے گالوں میں میرے شیطانی گڑھوں میں زنگ آلودہ کیل ٹھونک کر میرے چہرے کو داغی کر کے میری طلسمی خوبصورتی کو ڈراؤنی بنانے والو! میرے جسم کو کالک لگا کر ایک جونک کی طرح مجھ سے لپٹ کر میرا خون چوسنے والو! میری جسم فروشی کا حشر دکھانے والو، میں نے اپنا دروازہ بند کیا تو بھڑک اُٹھے! روز میں تم سے کہتی رہی کہ میں بیس سال کی ماڈل یا کال گرل نہیں ہوں بلکہ چالیس سال کی ایک عورت ہوں جس کا جسم اور چہرہ اُس کے دو پیدائشی دشمن ہیں! اپنی اصلی عمر بتاتی رہی، ہر کالج کے لڑکے کو یہ احساس دلانے کی خاطر کہ اُس کو مجھ میں اپنی ماں کے عکس نظر آجائے اور ہوش میں آکر وہ اُس دس سال کی بچی کو ورغلا کر میرے گھر کو کھنڈر سمجھ کر لایا تھا! میں نے روکا تو اُس نے خرگوش کو چھوڑ کر بکری کو اپنی مردانہ قوت سے دبوچ ڈالا!''

''پھر ایک بزرگ کی گود میں ایک بچی کو دیکھا جو بزرگ کی بے ہودہ حرکتوں سے بے خبر چاکلیٹ کھا رہی تھی! میں نے روکا ٹوکا تو وہ بوڑھا بھیڑیا مجھ پر فدا ہو کر میرے گھر میں گھس آیا—!! اور پھر باقاعدگی سے آتا رہا! میں نے اس کو یہ سمجھانے کی خاطر کہ بچی اس کی پڑپوتی یا پڑنواسی کی عمر کی ہے پھر بھی وہ اُس بچّی کو میرے سے لپٹنے کا انٹری کارڈ (Entry Card) بناتا رہا! چند روز پہلے میں نے اخبار میں ایک دردناک خبر پڑھی تو مجھے انجلی کی کہانی یاد آئی!''

''انجلی کے پاپا ایک فوجی افسر تھے اور اُس کی بیوی ایک کتھک ڈانسر تھی! انجلی کو ممی کے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اپنے پاپا کے ساتھ لپٹ کر ان کے گیت سنتے سنتے سوجانے کی ویسی ہی عادت پڑ گئی تھی جیسے عام طور پر بچوں کو ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر یا انگوٹھا چوستے چوستے سوجانے کی عادت ان کا ایک ایسا عیب بن جاتا ہے جو بڑھتی عمر میں بھی چھوٹ جانے کا نام نہیں لیتا! بدبخت انجلی بھی ایک عیب کی شکار ہو گئی تھی جس کا خمیازہ اُس کو بھگتنا پڑا!؟''

انجلی کے پاپا سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے جب شہید ہو گئے تھے تب وہ پانچ سال کی

تھی! اُس کے پاپا نے چونکہ اپنی مرضی سے شادی کی تھی اس لیے انجلی کی ماں اپنے رشتے داروں سے کٹ کر رہ گئی تھی! انجلی جب بھی کسی لمبے چوڑے گورے اور خود رو آدمی کو دیکھتی تھی تو اُس میں اپنے باپ کا عکس دیکھ کر اُس کے ساتھ لپٹ جاتی تھی اور سو جاتی تھی!؟"

"انجلی کی ماں کو فقط اپنی بیٹی کی خاطر اشتہاروں کے ذریعے ایک ایسے آدمی سے شادی کرنی پڑی جو پیشے سے ہیرے جواہرات کا تاجر تھا، بہت امیر تھا مگر عمر میں انجلی کی ماں سے پندرہ سال بڑا تھا! اس کی طلاق شدہ بیوی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی جبکہ دوسرا بیٹا ہوسٹل میں رہتا تھا!؟"

"انجلی کی عمر تب بارہ سال تھی اور اُس کا سوتیلا بھائی اُس سے چھ سال بڑا تھا! گھر میں ماں اور ایک پیاری سی چھوٹی بہن آئی تو وہ ہوسٹل چھوڑ کر گھر آ گیا! مگر باپ کو بھائی بہن کے اس پیار سے نفرت ہونے لگی کیونکہ اُس کا بیٹا اپنی بہن کو اپنے باپ کی پسند کے مغربی طرز کی پوشاکیں پہننے سے روکا کرتا تھا! سوتیلے بھائی کو ہوسٹل جانا پڑا تو انجلی کے لیے سوتیلے باپ نے ایک مستقل فیشن ڈیزائنر اور میک اپ کرنے والا رکھا اور باپ فخر سے انجلی کو مِس ورلڈ بنانے کے خواب دکھاتا رہا اور اُس کو نیم عریاں لباس پہنا کر کیٹ واک (Catwalk) کراتا تھا! جبکہ بیوی کو اُس نے شراب پینے کی لت لگا دی تھی اس لیے انجلی اپنے باپ کے ساتھ ہی لپٹ کر سویا کرتی تھی!"

"روز صبح سویرے جب ماں بیٹی دونوں کا سر بھاری بھاری رہنے لگا تب ماں سمجھ گئی کہ اس کی تیرہ سال کی بیٹی ایک عورت بن گئی ہے! گویا ہیرے جواہرات کے تاجر کی منجھی ہوئی چٹکی سے نکلا تیر ماں کے قلب میں جا کر جان لیوا ثابت ہوا!!"

"ایک بھیڑیے کے غار سے نکل کر، انجلی اپنے ماما کے گھر گئی اور وہاں وہ ایک نیا جنم لے کر ایک سیدھی سادی لڑکی کی طرح رہنے لگی! ماما کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی کمرے میں اپنے سے چار سال بڑے ماموں زاد بھائی کے ساتھ رہنا پڑا! کہتے ہیں قدرت کے کچھ قوانین ہوتے ہیں جو کہیں لکھے نہیں گئے ہیں مگر عمل میں خود بخود آ جاتے ہیں! انجلی بھائی کی کلائی پر راکھی باندھنے گئی تو اُس نے انجلی کا ہاتھ پکڑ لیا! انجلی سولہ سال کی تھی جب اس کے ماما نے اُس کا چھ مہینے کا حمل گروا کر جلد بازی میں اُس کی ایک ذہنی مریض کے ساتھ شادی کرا دی! اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی انجلی کی شادی کے نام پر بربادی کی شروعات تھی! نہ دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگی اور نہ شہنائیاں بجیں، بس ایک ڈولی آئی جو ایک دولہے کے کمرے میں بٹھا دی گئی جو اپنی

ماں کے ساتھ ایک بچے کی طرح سویا پڑا تھا، گویا جس غنچے کو ایک شاخ سے جدا کرنے کی بجائے موڑ کر اَدھ مرا چھوڑ دیا گیا تھا! وہ سیدھا کرنے سے کھل تو گیا تھا مگر اُس کو کاٹ کر نہ کسی نے گلدان میں سجاوٹ کے لیے رکھا اور نہ کسی نے رنگ اور خوشبو کی قدر کی! ہاں اُسے مسل ضرور دیا! تازگی چھین کر! انجلی کو اُس کے سوتیلے باپ نے کِھلنے سے پہلے گویا آگ میں جھلس دیا تھا! پھر بھی عمر کے تقاضے پورے ہوئے تو انجلی اپنے جسم میں تبدیلیاں محسوس کرتی رہی! خاص طور پر جب وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھا کرتی تھی تب خود بھی اپنے حسن پر فدا ہو جایا کرتی تھی اور پھر عام دیہاتی پوشاک میں بھی اُس کے جسم اور پری چہرے پر اڑوس پڑوس کے نوجوانوں کی نظریں جمی رہتی تھیں! گاؤں کے میلے میں وہ یہ بھول گئی کہ وہ ایک اونچی سوسائٹی سے کئی سال پہلے کٹ چکی ہے، چند دل پھینک نوجوانوں کے ساتھ بے باک ہو کر ناچنا اُس کے لیے تباہ کن ثابت ہوا! اور وہ اجتماعی عصمت دری کی شکار بن گئی!''

''اپنے باپ جیسے سسر کے سینے سے چمٹ کر اُس نے حالِ دل سنایا تو وہ رات بھر اُس کے ساتھ ہی رہا اور تسلی دیتا رہا! مگر نہ جانے کب اور کیسے ایک نیک دل انسان میں وہ شیطان گھس گیا جو ایک سنگین رات کے بعد اُجلی سحر دکھانے کے وعدے کرنے والا اُس کو دن بھر کی تاریکیوں میں دھکیل گیا تھا!''

''پھر روز روز اُجالوں میں بھی تاریک زندگی دیکھ کر وہ گاؤں سے فرار ہو کر شمشان میں جل رہی ایک چتا میں کود گئی مگر دور دھونی (Bonfire) کے سامنے بیٹھے ایک سادھو نے انجلی کو بچالیا! چہرہ اور جسم جھلس گئے اور سنہرے بال بھی جل کر ایک ربڑ کے جلے ٹائر کی طرح بدبودار بن گئے! سر منڈوا کر سادھو کی گہری باتیں سن کر وہ سطحی طور پر یہ سمجھ گئی کہ چندن کی لکڑی ہَوَن کنڈ میں جل کر راکھ ہو جائے تو وہ بھبھوتی (Sacred ash) کہلاتی ہے جو سادھو سنت متبرک سمجھ کر اپنے بدن پر لگاتے ہیں مگر وہی چندن کی لکڑی جب چتا میں جلائی جاتی ہے تب راکھ دریا میں ڈالی جاتی ہے! بابا نے اُس کو دھرم اور کرم کی باتیں سمجھا کر اپنے آپ کو راکھ میں تبدیل کرنے کی بجائے بے لوث خدمت کرنے کا مشورہ دے کر ایک مندر میں روز صفائی کرنے کا کام دلایا جب تک اُس کے چہرے پر جھلسنے کے داغ تھے اور سر پر اَدھ جلے بال تھے مندر میں آنے جانے والے بھگت اس کو قریب سے گزرنے بھی نہیں دیتے تھے! گویا وہ ایک کوڑھ کی مریضہ تھی لیکن جب چہرے کے داغ مٹ گئے اور اس کے سنہرے بال ہوا کے جھونکوں سے بے قابو ہو کر لہرانے لگے تب دیوی

دیوتاؤں کے درشن کرنے دُور دُور سے آئے بھگت ایک بے حد خوبصورت جسم، ایک پری چہرے میں پڑ رہے دو پُر کشش گڑھوں کو یوں دیکھتے رہتے تھے جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھنے کے لیے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں! پھر چند دل پھینک جنس زدہ نوجوانوں نے اُس کو ندی پر نہاتے ہوئے دیکھا تو وہ اُس پر ہمدردی کے کانٹے پھینک کر ایک بے سہارا لڑکی کو ایک اَن دیکھی آگ میں جلاتے رہے! ایک گیلی لکڑی کی طرح یعنی نہ بجھنے دیتے تھے اور نہ جل کر راکھ ہونے دیتے تھے!! پھر انجلی اپنے آپ سے گھبرا کر بابا کے پاس مدد کے لیے گئی! اُس نے دھرم کرم کا حوالہ دے کر ایک مسیحا کی آمد کا یقین دلایا؟'

''بابا کی بات صحیح ثابت ہوئی! امریکہ سے آیا ہوا ایک نوجوان اپنے بورڈنگ اسکول کے چند دوستوں کے ساتھ موج مستی کے ارادے سے گھنے جنگل کے درمیان واقع اس صدیوں پرانے مندر کے پاس طے شدہ منصوبے کے تحت انجلی کے ساتھ موج مستی کرنے آیا تھا مگر انجلی کی بناوٹی خوشیوں کے پیچھے ایک لڑکی کے ارمانوں کی چتا دیکھ کر جب وہ انجلی کو اپنے ساتھ لے گیا تو مندر میں افواہیں پھیل گئیں کہ انجلی کسی کے ساتھ بھاگ گئی! جو انجلی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا تھا اور بعد میں ہوائی جہاز میں کسی نامعلوم جگہ لے گیا! وہ ایک شہید کرنل کا بیٹا تھا اور وہ انجلی کو اپنے آبائی گھر میں لے گیا! ایک بہت بڑے مکان کی نگران بنا کر اُس نے ایک سرحد کے نگہبان کی بیٹی کی عزت و آبرو کی حفاظت کا پورا انتظام اور مرحوم یادوں مثلاً ان کی کتابوں اور سنگیت کی لائبریری کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک معقول رقم بینک میں جمع کرنے کے بعد مسیحا وداع ہوا! گھر کو گرد و غبار نے کھنڈر بنا دیا تھا اور باغ میں گھاس اتنی اونچی تھی کہ گلاب کے پھول پر گرہن لگ گیا تھا؟'

''انجلی نے گھر سنوارا تو اپنا بچپن یاد آیا! ایسا ہی گھر تھا اُن کا! خوب محنت کر کے جب کھنڈر گھر بن گیا تو پھاٹک کھول کر ٹوٹے پھوٹے گیراج کے اندر نوجوانوں کا اپنی معشوقاؤں یا گھر کی نوکرانیوں بلکہ ورغلا کر لائی ہوئی معصوم لڑکیوں کی آبرو تار تار کرنے کی ایسی جگہ بن گئی جہاں آوازیں تو کیا چیخیں بھی سننے والا کوئی بھی نہیں ہوا کرتا تھا! انجلی کو ایک ایسی جگہ اپنی زندگی کے دس سال گزارنے پڑے تھے! اور اُس کی وہاں موجودگی کی وجہ سے پھاٹک بند رہا کرتا تھا اس لیے آوارہ مویشی یا کتّے بھی احاطے کے اندر نہیں آپاتے تھے! مگر ایک روز وہ معمول کی طرح آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی اور اپنے جسم اور چہرے پر رشک کر رہی تھی یعنی نرگسیت کا شکار ہو رہی تھی تب تیس سال کی عمر میں اُس کے تن و من میں ایک سولہ سال کی کنواری لڑکی کی طرح عشق محبت

اور جسمانی ضرورتوں کا شدت سے احساس ہوا مگر پھر اُس عمر میں ہوئی جنسی اذیتوں کے جسمانی درد اور ذہنی کرب کی یاد آتے ہی وہ چیخ پڑی تھی جس کو سن کر پڑوسیوں کا شک یقین میں بدل گیا تھا! ایک بہت بڑے مکان کے اندر تنہا رہنے والی اور تنہائی پسند عورت یا تو پاگل ہے یا پھر ڈائن، اس لیے وہ اُس کی پہل کے باوجود اُس کے ساتھ میل جول بڑھانے میں کتراتے تھے مگر ان لڑکوں، نوجوانوں اور درمیانی عمر بلکہ بوڑھوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا تھا، ان کے لیے وہ ایک ایسی دکان ہے جو لین دین کے بغیر صرف پہلی بار زبردستی من چاہی چیز حاصل کر کے بعد میں دکان کو لوٹ کر لے جانے کی ہمّت اور جرأت سے جانے کے عادی ہو چکے تھے!

اس بدبختی کی شروعات تب ہوئی تھی جب اس نے ایک بچی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز کے بعد اپنے گیرج سے اُس بچی کی چیخ سن لی تھی! اندر گھس کر اس نے ایک بھیانک منظر دیکھا تھا! تقریباً ساٹھ سال کے بڑے میاں ایک چار سال کی لڑکی کے منہ میں چاکلیٹ رکھ کر اس کے ساتھ وحشیانہ حرکتیں کر کے اپنی جنسی خواہشات کو پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے! انجلی نے بچی کو تو بچا لیا تھا مگر تب جب خونخوار درندے نے اپنی بھوک مٹانے کی خاطر اُس کو دبوچ لیا تھا!

اُس روز انجلی نے بہت آنسو بہائے تھے مگر پھر بھی اپنے چکنا چور ہوئے دل کو یہ تسلی دے کر جوڑ لیا تھا کہ اُس نے ایک بچی کی آبرو بچانے کی خاطر اپنی آہوتی دی ہے! پھر ایک دن گھر میں بارہ سال کی کام کرنے والی لڑکی کو سولہ سال کے ایک لڑکے کے چنگل سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوئی تھی مگر خود اس کی ہوس کی جوالامکھی کی شکار ہو کر اور یوں انجلی اپنی آہوتی دے کر غنچوں کو، اَدھ کھلے پھولوں کو، بلکہ شاداب رنگ برنگی پھولوں کی خوشبو اور رنگت بچانے کی خاطر بار بار قربان ہوئی تھی؟'

''میں سب زخم دینے والوں کے احساسات کی آگ کو بجھانے کی خاطر انجلی کی بدبختی کی کہانی سنانا چاہتی تھی مگر کوئی اس کی کہانی سننا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ انجلی کا نام سنتے ہی وہ جنسی بھوک کے جنون کا مظاہرہ کرتے تھے؟'

''تنگ آ کر میں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے اور شرط رکھ دی کہ وہ پہلے انجلی کی کہانی سن کر یہ تو سمجھ لیں کہ شکار شکاری کی پڑپوتی، بیٹی، بہن یا ماں ہو سکتی ہے تو میں قابلِ تعریف عورت سے ایک طوائف بن گئی!'' یہ کہہ کر ترنّم خاموش ہو گئی کیونکہ ہال خالی تھا! ہر طرف خاموشی تھی، مگر شکتی ماں کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات دیکھ کر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ترنّم کا بولا ہوا جملہ

اُس کے ذہن میں بادلوں کی گرج کی طرح گونج رہا تھا! اس کی آنکھوں میں ایک جوالامکھی نظر آ رہی تھی!"

پھر ترنّم نے مائک شکتی ماں کے سامنے رکھ دی تو چند لمحات کے لیے وہ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہیں جبکہ میڈیا والے باری باری ترنّم کو دیکھ کر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے! "عورتیں اپنی عمر بتاتی نہیں اور اگر بتا بھی دیتی ہیں تو اصلی عمر سے بہت کم! یہ عورت بیس سال کی ہوگی! شرط لگانا چاہو تو میں تیار ہوں! چہرہ فوٹو جینک اور جسم سیکسی! ایک ریڈی میڈ ماڈل، مگر داغدار! بد ہوگی مگر بدنام نہیں!"

ترنّم خاموشی سے شکتی ماں کو دیکھ کر جونہی منچ سے اُتر کر ہال کے باہر جانے کے لیے بوجھل قدموں سے چند قدم چل پڑی تو شکتی ماں کی آواز سے اس کے قدم تھم گئے!

"سفید پوشاک پہن کر کوئی جسم فروش عورت جوگن بن جانے کا ڈھونگ نہیں رچا سکتی! تم فریبی ہو! دھرم کو چالاکی سے کیے گئے کرم قبول نہیں! کیا تم اتنا بھی نہیں جانتی کہ سنیاس لینے والا یا لینے والی خود اپنا شرادھ کر کے اپنے ماضی کو بھول کر کسی کو اپنے بارے میں، خاص طور پر اس کے ماضی کے بارے میں کسی کے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی ہے! پھر تم نے جو بھی کہا وہ یہ ایک جرم نہ سہی ایک گناہِ عظیم ہے، جس کی سزا تمھیں ملے گی! ایک سنیاسن جس کے ماضی کے بارے میں کہہ کر تم نے اپنا بچاؤ کرنا چاہا — رعایت مل سکتی ہے اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ میرے ماضی کے بارے میں تمھیں کس نے اطلاعات دی ہیں؟ اور کیوں دی ہیں!"

میڈیا والے اشاروں سے شکتی ماں کو اونچی آواز میں بولنے کی درخواست کر رہے تھے مگر شکتی ماں آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی کرید کرید کر ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی "انجلی کے بارے میں کس نے تمھیں یہ سب بتایا ہے؟" ترنّم شکتی ماں کو بس دیکھتی رہی! ملتجی نگاہوں سے جبکہ وہ جواب کی منتظر تھی! "ترنّم! تم ایک بازاری عورت ہو؟ کون آیا تھا تمھارے پاس؟ انجلی کی کہانی بتانے؟" شکتی ماں گویا ایک کانٹے دار تار سے کریدنے لگی تو ترنّم حلیمی سے بول پڑی!

"جن کو میں اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی وہ سب مجھے دیکھتے ہی ہال چھوڑ کر چلے گئے! انجلی میرا نام ہے! وہ نام جو مجھے میرے پاپا نے دیا تھا! انجلی کو ترنّم کا نام اُن ہی لوگوں نے دیا ہے! منسوب جن سے میری جسم فروشی ہوئی! نعرے لگانے والوں، میرے جسم کو چاہنے والوں کی رسوائی تو نہیں ہوئی البتہ ایک ڈراؤنی خاموشی ہوئی! اچھا ہوا آپ سامنے آ گئیں چندن کی طرح جل رہی بدبخت

انجلی کی کہانی سن تو لی! مگر دو آنسو بہا دینے کی بجائے آنکھوں میں لالی کیوں؟ کیا آپ کا نام بھی انجلی ہے؟ کیا ہماری داستانیں ایک جیسی ہیں؟"

شکتی ماں کے چہرے پر اچانک روحانی نُور نمودار ہوا اور وہ انجلی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پلٹ کر میڈیا والوں سے مخاطب ہو کر اونچی آواز میں بول پڑی!

"ترنّم جیسی عورتوں کو یا لڑکیوں کو سمجھانے کے علاوہ ایک سنیاسن اور کیا کر سکتی ہے!"

یہ کہہ کر شکتی ماں تیز گامی کے ساتھ ہال کے باہر گئی اور میڈیا کی روشنیاں اس کا پیچھا کرتی رہیں!

ہال میں اندھیرا ہے اور ہال کے باہر اُجالا! ہال میں خاموشی ہے اور باہر خوشی کو ظاہر کرنے والا شور! اور شکتی ماں کی جے جے کار کے نعرے! ترنّم کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی ہیں گویا دہلیز پر بیٹھی وہ ان کا انتظار کر رہی ہے جو انجلی کی کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے! مگر انجلی کو سرد ہوا کے جھونکے کی طرح ایک گیت دل کو چھو کر بار بار گزر گیا، یہ گیت اس کے پاپا اس کو سنایا کرتے تھے:

دو سکھیاں بچپن کی
ایک تو اپنے رُوپ کے کارن رُوپ متی کہلائے
دوجی اپنے رُوپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے!

OO

پیاسی سیپ

وہ یونیورسٹی کی قابل ترین پروفیسر ہے! لیکن اس کے اطوار و انداز نرالے ہیں!! جب دیکھو بے رونق چہرہ! بے ترتیب بال! بدن پر ڈھیلے ڈھالے کھادی کے کپڑے! ہاتھ میں وزنی کتابیں لیے، کھوئی کھوئی رہتی ہے! خدا جانے یہ جذبات کی کشمکش ہے یا خیالات کی گھٹن لیکن اس کا حُلیہ دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے سنجیدگی نے اس کے چہرے کے تاثرات کو مفلوج کر کے اسے پتھر کی ایک مورت بنا دیا ہے! اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی رہتی ہے! کلاس روم کے سوا وہ شاید ہی کسی سے بات کرتی ہے! اس کا رہن سہن بھی عام لوگوں سے مختلف ہے! آس پاس کے ماحول رسم و رواج سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے! یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے اور روز مرّہ کی زندگی بھی کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں وہ اپنے تان پورا کو گلے سے لگا کر ساز چھیڑتی ہے پھر ساز کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کر کے گاتی بھی ہے! اس کی آواز میں کتنا سوز ہے! الفاظ میں کتنا درد ہے اس کا طرزِ بیان ہی ایک فریاد ہے! آس پاس کے لوگوں کو اس ساز و آواز کے ساتھ اکثر سسکنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے! وہ لوگ اسے کوئی روحانی عمل سمجھتے ہیں! شاید یہ تڑپ ہی اس کی تپسیا ہے! سسکنا ہی بھگتی ہے! جبھی تو لوگ اسے ڈاکٹر چنچل شرما کی بجائے 'میرا جوگن' کہتے ہیں! کوئی اسے دانشور بھی کہتا ہے تو کوئی مفکّر! لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ ایک خدا دوست پاک باطن خاتون ہے! ایک بلند پایہ کی زاہدہ!

یونیورسٹی میں وہ پچھلے دس سال سے کام کرتی ہے لیکن آج تک کوئی نہیں جانتا وہ کون ہے!؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا کوئی اور بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کسی سے نہ ذکر کرتی ہے اور نہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ جاننے کی فکر ہے! وہ جہاں سے بھی گزرتی ہے تو ایسے نمائش کے لیے ایک چلتا پھرتا تابوت ہو جسے شاید ہی کسی نے اسے کبھی ہنستے یا مسکراتے دیکھا ہو! لیکن آج اس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی ہے! پھیکے ہونٹوں پر تبسم ہے! آنکھوں میں چمک ہے

اور وہ اونچی ہیل کی سینڈل پہن کر مٹک مٹک کر ایسے چل رہی ہے جیسے ایک تتلی، ایک پُر بہار گلستاں میں گلوں کو چوُم چوُم کر خوشی سے جھوم کر اُڑتی پھرتی ہو! شاید اسی لیے آس پاس کی ہر مشکوک نظر اسے آج جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے! ہر دیوار کے پیچھے سرگوشیاں ہو رہی ہیں! لیکن وہ آس پاس کے ماحول سے بے فکر ہلکے سُروں میں گنگناتے ہوئے بہت چاؤ سے اپنے کمرے کو سجا رہی ہے!

یوں تو اس کا کمرہ مختلف کتابوں، رسالوں، کاغذات کے پلندوں سے بھرا پڑا رہتا ہے لیکن آج یہی کمرہ ایک مصور کی آرٹ گیلری کی طرح سجا ہوا ہے! فرش پر دلکش کشمیری قالین، ویلویٹ کے زرق برق کرتے ہوئے صوفے! اعلیٰ ڈیزائن کے خوبصورت پردے کمرے کے ایک کونے میں وینس کا قدِ آدم مجسمہ اور دیوار پر آویزاں ایک پُرکشش کینواس! خدا جانے آج تک یہ سبھی چیزیں اس نے کہاں چھپا رکھی تھیں! سوہنی اور مہیوال کی اس تصویر کو اپنی ساڑی کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے نہ جانے اس کے ہاتھ کیوں کانپنے لگے! جیسے کسی اجنبی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا! حسرت بھری نگاہوں سے تصویر کی گہرائیاں ناپتے ہوئے اچانک اس کے کانوں میں ایک مدھر سُر گونجنے لگا جیسے کوئی پیغام تھا! جو اس کے تھرتھراتے لبوں کو نغمۂ دل چھیڑنے کے لیے اکسانے لگا تھا! اس کا دل دھڑکنے لگا اور دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ ساز بجتے رہے! وہ تصویر کے رنگوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی! کچھ سمجھتی رہی! کچھ محسوس کرتی رہی!

سازوں میں پیار تھا، محبت تھی! رنگوں میں محبوب تھا محبوبہ تھی! اس کے جسم میں گدگدی ہونے لگی! اپنے ٹھنڈے جسم میں کسی اَن دیکھی آگ کی ہلکی ہلکی آنچ کی تپش سے رگ رگ میں حرارت محسوس کرتے ہی اس کی آنکھوں سے نشہ چھلکنے لگا اور وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح صوفے پر دراز ہو کر انگڑائیاں لینے لگی ویسے جیسے ایک نازک غنچہ کھلنے کے لیے بے تاب تھا یا کسی کو چھونے کے لیے بے قرار تھا! اچانک اپنے جسم سے ایک ایک کپڑا اُتارتے ہوئے اسے اپنے مایۂ ناز کردار سے نفرت ہونے لگی! نفرت کے اس احساس کے ساتھ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دلدل سے نکل کر ایک وسیع میدان میں ایک ہرن کی طرح دوڑتی جا رہی ہو! لاوے جیسی شدت لیے وہ اپنی موٹی موٹی کتابوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے اپنے لباس کو فرش پر گرا کر باتھ روم میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عریاں جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی! موتی جیسے پانی کے قطروں کو اپنے بدن پر مچلتے دیکھ کر وہ شاور کے جھرنے کے نیچے مورنی کی طرح ناچتی رہی اور کوئل کی طرح گاتی رہی!

میک اپ سے اسے نفرت تھی کیونکہ یونیورسٹی کی لڑکیاں بھی اس کی موجودگی میں اپنے

ہلکے سے ہلکے! میک اپ کو چھپاتی رہتی ہیں! لیکن آج اس کے اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے کریم پاؤڈر تیل، سینٹ اور لپ اسٹک ہیں! وہ بار بار اپنے بالوں کے اسٹائل، آنکھوں کے کاجل، ماتھے کی بندیا، گالوں کی سُرخی، ہونٹوں کی لالی، کانوں کے آویزے سے دیکھ کر مسرور نظر آ رہی ہے! ایک جدید ڈیزائن کا منی بلاؤز پہن کر جب اس نے ایک خوبصورت سا ہار گلے میں ڈالا تو ذرا سا جھک کر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ہار اس کے نیم عریاں سینے کے اُبھار سے ٹکرا کر ویسے ہی مچل رہا ہو جیسے سنگ مرمر کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا ایک دلکش آبشار، شفان کی سرخ رنگ کی ساڑی پہن کر وہ ساڑی کی پُرکشش گلکاری، انگور کے گچھوں کے مانند جھالر کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگی جیسے ایک دلہن! اچانک اس کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں اور اس کی بند پلکوں کے سامنے سفید گھوڑی پر سوار ہو کر وہی پریوں کا راجا اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ماں اسے بچپن میں کہانیاں سنایا کرتی تھی! کانپتی ہوئی انگلیوں سے پردے کو ہٹاتے ہوئے وہ چور نگاہوں سے دور دور تک پھیلی ہوئی ایک جھیل کو دیکھنے لگی! چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر اس کا دل مچلنے لگا! پانی کی سطح کو چومتی ہوئی کناروں پر پھولوں کی قطاروں کو دیکھ کر اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں! صاف اور شفاف پانی میں کسی عریاں اپسرا کو غوطے لگاتے دیکھ کر اس کا دل مچلنے لگا! اچانک اس کی نظریں یونانی دیوتاؤں جیسے ایک شخص پر رُک گئیں جو ایک کشتی چلا رہا تھا اور کشتی کا رُخ اس طرح تھا جہاں وہ عورت نہا رہی تھی! اس کی سانسیں اور بھی تیز ہونے لگیں! وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے شرماتے ہوئے سوچتی رہی آخر احساسات و جذبات کا گنجینہ لے کر پیار و محبت کی باتیں، راز و نیاز کی باتیں، زندگی و زندہ دلی کی باتیں کہاں سے شروع اور کہاں ختم! اگلے ہی لمحے چپوؤں کی آواز، قدموں کی آہٹ اور پردے کی جنبش کے ساتھ ایک جانی پہچانی آواز سنتے ہی وہ چونک پڑی! سانسوں کی رفتار بے قابو ہو گئی تو اس کا سارا بدن کانپنے لگا! لب تھرتھرانے لگے اور وہ پردہ ہٹاتے ہی پروفیسر آنند ورما کے بدن کے ساتھ ایسے لپٹ گئی جیسے دو بچھڑے دل ایک مدت کے بعد ملے ہوں! کسی کی گرم گرم سانسوں کو اتنا قریب سے محسوس کرتے ہوئے چالیس سال کی عمر میں آج پہلی بار اسے شدت سے ایک عورت ہونے کا احساس ہوا! جیسے وہ ایک انجانی آگ کی گرمی سے موم کی طرح پگھل کر آنند کے قدموں پر گر رہی تھی! شاید پروفیسر آنند اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا!

سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کافی کی گرم گرم چسکیاں لیتے ہوئے وہ پُر معنی نظروں سے اس کے بدلے تیور اور لباس کو یکتا رہا! اس کے عجیب اندازِ بیان کو سمجھنے کی کوششیں کرتا

رہا جبکہ وہ اپنی ہر ادا سے اسے اپنے دل کا زخم دِکھاتی رہی! آنکھوں آنکھوں سے دل کا درد بتاتی رہی اور سرگوشیوں میں اپنا حالِ دل سناتی رہی!

''چنچل تمھیں یہ اکیلا پن ڈس رہا ہے! سادھو سنتوں کی ٹولی سے فرار ہو کر شادی کر لو!''

پروفیسر آنند نے ایک لمحے کی خاموشی کو توڑ کر کہا! شادی کا نام سنتے ہی وہ خوشی سے چیخ پڑی! یوں محسوس ہوا جیسے بینا کے تار خود بخود بج رہے ہوں! سوہنی اور مہینوال بے جان کینواس چھوڑ کر اس کے ساتھ ناچنے لگے ہوں! فضا میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی ہوں اور بینڈ باجے کے ساتھ وہی پریوں کا راجا بارات لے کر آ رہا ہو!

لیکن اچانک ایک دھماکہ ہوا اور زلزلے سے ایک حسین عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی! تار ٹوٹ گئے، ساز خاموش ہو گئے اور زور کی آندھی کے ساتھ وہ ایک تنکے کی طرح اپنے وجود کو نوچنے لگی! اپنے چہرے کو اپنے ہی ناخنوں سے بے دردی سے کھرچنے لگی!

پروفیسر آنند کب اور کس وقت چلا گیا تھا وہ نہیں جانتی! کرب و اضطراب میں ہر لمحہ گزارتے ہوئے آج پھر سلگتی رات کی تنہائی اُسے پھن پھیلائے ناگ کی طرح بار بار ڈستی جا رہی ہے اور وہ دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھے ایک نازک پھول کی طرح جھلس رہی ہے!

دوسرے دن معمول کی طرح کھادی کے کفن کے نیچے اپنے وجود کو دفن کر کے آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں چڑھائے اور ہاتھ میں وہی وزنی کتابیں لیے کلاس روم سے نکلتے ہوئے جب پروفیسر آنند نے اسے معمول کی طرح 'چنچل' کے نام سے پکارا تو اس کے قدم رُک گئے! اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور وہ آہ بھر کر آہستہ سے کہنے لگیں!

''پروفیسر آنند! آپ یونیورسٹی میں نئے نئے آئے ہیں، اس لیے شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ یہاں کا ہر طالب علم، پروفیسر، کلرک، چپراسی، ڈرائیور ہی کیا شہر کا بچہ بچہ مجھے جوگن کہتا ہے! آپ بھی آئندہ...''

اس کی آواز ٹوٹ گئی! آنسو کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جب اس نے ٹوائلٹ کا دروازہ بند کیا تو سامنے لگے ہوئے ایک چھوٹے سے آئینے میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنا سیاہ رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، موٹی، بھدّی ناک، پژمردہ پچکے گال، حبشیوں جیسے بے ترتیب بال دیکھ کر وہ چیخ پڑی!!

OO

دَشرتھ

شیتل نے شیشوں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر برف کے گالوں کے علاوہ اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا! حالانکہ جیپ کے اِرد گرد کھڑے لوگوں میں اس کی بوڑھی ماں بھی ہے!

دَشرتھ ناتھ بوڑھی کو تسلیاں دیئے جا رہا ہے اور گاؤں والے کل یگ کے اس فرشتے کی جے جے کار کر رہے ہیں!

زبردست برف باری اور کڑاکے کی سردی نے اگر گاؤں والوں کے جوش و خروش کو ٹھنڈا ہونے دیا ہوتا تب علی الصباح دَشرتھ ناتھ کے صحن میں گاؤں کے تقریباً تمام زن و مرد ہرگز ہرگز نہ ہوتے! یہ لوگ اپنے محبوب محسن کو معمول کی طرح آج بھی وداع کرنے آئے ہیں اور دَشرتھ ناتھ بھی ایک رحم دل بادشاہ کی طرح ان کے والہانہ محبت سے متاثر ہو کر اپنے خلوص، انسان دوستی، غریب پروری کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے! سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی کسی مریل سی خاتون کو اپنا کمبل دے کر، کسی ننگے بچّے کے جسم کو اپنا قیمتی شال اوڑھا کر! کسی بیمار کو دوائیوں کے لیے روپے دے کر! کسی طالب علم کو کاغذ و قلم دے کر! کسی بے روزگار کو روزگار دے کر! شاید اپنی اپنی مرادوں کو پورا ہوتے دیکھ کر گاؤں والے برف کے گالوں کو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے خدا ایک فرشتے پر پھول برسا رہا ہو!— مگر شیتل کی کیفیت ان سب سے مختلف ہے!!

دُور دُور تک پھیلی ہوئی برف کی چادر، برف سے ڈھکے ہوئے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکان، برف کے بوجھ سے جھکی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں اور برف پوش پہاڑیاں دیکھ کر وہ یوں سکڑتی جا رہی ہے گویا اس کے اِرد گرد سفید سفید جن یا بھوت کھڑے ہوں!!

جیپ اسٹارٹ ہوتے ہی اگر وہ اپنے تھرتھراتے ہونٹوں کو شال سے نہ دَباتی تو شاید ایک درد بھری چیخ ساری وادی میں گونج اُٹھی ہوتی! اُس کی سسکیاں— اگلی سیٹ پر بیٹھے دَشرتھ ناتھ نے جب سن لیں تب اس نے اپنی معنی خیز نگاہوں سے اس کے کولہے کو سہارا دینا چاہا! شیتل لمبے لمبے

سانس لے کر منہ سے نکلتے ہوئے بھاپ کو یوں دیکھتی رہی جیسے اس کے اِرد گرد کہر پھیل رہی ہو!

کہر سے وہ بچپن میں بھی بہت ڈرتی تھی! شاید اس لیے کہ کہر میں وہ کئی بار اپنا راستہ بھول گئی تھی! مگر برف سے اُس کو بہت پیار تھا! جبھی تو وہ اکثر کانگڑی تاپتے ہوئے دہلیز پر بیٹھ کر بڑے اشتیاق سے برف پوش وادیوں کو دیکھتی رہتی تھی! کبھی گرتی ہوئی برف دیکھتی رہتی تھی اور کبھی اپنے مکان یا دوسروں کے چھتوں سے لٹکتے ہوئے لمبے لمبے برف کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ان چھونے کی یوں کوشش کرتی رہتی تھی جیسے کسی پہاڑی پر چڑھ کر آسمان پر لٹکتے ہوئے ستاروں کو پکڑنا چاہتی ہو! مگر ناکام ہو کر وہ غصّے سے، اپنی ماں سے پوچھا کرتی تھی! ''ماں! میں کب بڑی ہوں گی؟'' مگر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ شیشے کے مانند برف کے ان ٹکڑوں کو دیکھ کر یوں محسوس کرتی رہی جیسے وہ چھت سے لٹکتے ہوئے خنجر ہوں جو اُسے لہولہان کرنے کی بار بار دھمکیاں دیئے جا رہے ہوں! جبھی تو وہ اب برف کے تصور سے بھی کانپ اٹھتی ہے! یہ سب کسی وہم یا بد خیال کا عکس نہیں ہے! بلکہ ایک ٹھوس سوچ کا پیش خیمہ ہے!!

برفیلی راتوں میں اکثر، جب شیتل کی نیند کھل جاتی ہے! تب خاموشی کو چیرتی ہوئی سُوں سُوں کی آواز سن کر اُسے کسی کی آمد کا احساس ہوتا ہے! پھر کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر، وہ کھڑکی کی جالیوں پر لگے کاغذ میں، اُنگلی سے چھید کر کے، تاریکیوں میں یوں جھانک کر دیکھتی رہتی ہے! جیسے برآمدے میں یا صحن میں کوئی ٹہل رہا ہو! یا کمرے کے اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہو! یا اُس سے لپٹ جانے کے لیے صدائیں دیئے جا رہا ہو! — مگر؟ اگلے ہی لمحے جب اسے اپنی نادانی کا احساس ہوتا رہتا ہے — تب اُسے یوں محسوس ہوتا ہے — جیسے اُس کے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کی کمزور گرفت سے ایک سہارا نکل گیا ہو اور وہ برف کی گہرائیوں میں دھنس گئی ہو!

جب کبھی شیتل پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب وہ یا تو بلک بلک کر رو کر اپنے بھیگے سرہانے کو دیکھتے رہتی ہے! یا پھر وہ اپنے لب سی کر چرخہ چلاتی رہتی ہے! چوں چوں کی آواز جب اُس کی سسکیوں کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات پر حاوی ہو جاتی ہے تب اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بیل گاڑی میں بیٹھی دُلہن اپنے پیا کے گھر جا رہی ہو! یا پھر وہ اپنے پتی پرمیشور کے گھر سے اپنا پہلا بچہ گود میں لے کر پہلی بار اپنی ماں کے پاس آئی ہو!!

کیسی دُلہن؟ کیسا بچہ؟ یہ خیال جب اس کے احساسات کا سلسلہ توڑ دیتا ہے! تب وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے رامائن کا پاٹھ کرتی رہتی ہے!

کل بھی وہ رامائن ہی پڑھ رہی تھی! جب ایک آوارہ ہوا کا جھونکا اس کے بالوں سے ٹکرا گیا تھا تب اسے ایک خیال نے چونکا دیا تھا! رانی کیکئی نے راجہ دَشرتھ ناتھ کی جان بچا کر منہ مانگا انعام مانگا تھا! شیتل نے بھی دس سال پہلے دَشرتھ کی جان بچالی تھی! تو پھر؟ ایک آرزو نے جب ایک منصوبے کی شکل اختیار کی تب شیتل کا ارادہ ایک ٹھوس عمل کا زرہ بکتر پہن کر دَشرتھ ناتھ کا انتظار کرتا رہا!

کل رات، اپنے محسن کی خدمت کرنا اُس کی ذمہ داری تھی اس لیے معمول کی طرح شیتل نے دَشرتھ ناتھ کے کمرے کی صفائی کرنے کے بعد بیڈ روم میں اگربتیاں جلا دیں! آتش دان میں لکڑی سجا کر یوں آگ جلا دی جیسے لگن منڈپ میں گھی کی آہوتی دی جا رہی ہو! قالین کے نرم و نازک ریشوں کو بُرش سے صاف کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مہربان نے دولہا دُلہن کا سواگت کرنے کی خاطر فرش پر رنگولی سجا دی ہو! اس نے وارڈ روب کا دروازہ کھول کر جب رنگے برنگے کپڑوں کو چُھولیا تو اسے زندگی میں پہلی بار ایک خوبصورت لمس کا احساس ہوا! گویا پیاسے ہونٹ چشمے کو چُھو رہے ہوں! آج یہ چمکیلے زرق برق کپڑے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے! آج پہلی بار اس نے اپنی مرضی سے وہ صندوق کھولا جس میں زیورات تھے! طرح طرح کے سینٹ، پاؤڈر کریم، لپ اسٹک وغیرہ یوں پڑے تھے جیسے زمین کے نیچے دَبے ایک خزانے کے انمول موتی! ایک دیہاتی لڑکی کا ان سے کیا کام ہو سکتا ہے، مگر آج وہ وجد میں آ کر سنگھار بھی کرنا چاہتی تھی اور وہ نرم و نازک پشمینے کا سُوٹ بھی پہننا چاہتی تھی جو اس کے گورے گورے جسم کو چھو لینے کی کوشش یوں کیے جا رہا تھا جیسے ایک بھنورا ایک نازک پھول کو چومنے کی کوشش کیے جا رہا ہو!

سوٹ پہن کر اپنے شانوں پر پھیلے گیسوؤں کی مہک سونگھ کر وہ یوں جھومتی رہی جیسے ہوا کے جھونکوں سے سورج مکھی کا پھول!

پھر شیتل اس محل نما مکان کے مرحوم چوکیدار کی بیٹی ہے! یہ واقعی دَشرتھ ناتھ کا بڑا پن تھا کہ اس نے ایک نیا چوکیدار رکھنے کی بجائے اپنی لاکھوں کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے مرحوم کی بیوہ کا ہی انتخاب کیا تھا! اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو بھلا ان کا چولہا کیسے جلتا! غریبی کے عتاب نے ماں بیٹی کو کب کا کچل ڈالا ہوتا ورنہ......!!

دراصل ضرورت مندوں کی بے لوث خدمت کرنا دَشرتھ ناتھ اپنا اولین فرض سمجھتا ہے! گاؤں کا وہ کون سا گھر ہے جہاں دَشرتھ ناتھ کے احسانوں کا ذکر نہیں ہوتا رہتا ہے! اگر کسی مکان کی چھت پھوس کی بجائے ٹین کی ہے تو دَشرتھ ناتھ کی بدولت! گاؤں میں اگر کسی کے پاس

ولایتی مُرغیاں ہیں تو دَشرتھ ناتھ کی ہی نوازش ہے! اور تو اور گاؤں کی تقریباً ۵۰ فیصد لڑکیوں کا بیاہ بھی دَشرتھ ناتھ نے ہی کروایا ہے!

دَشرتھ ناتھ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہے! مگر پچھلے دس سال سے جنگلات کا یہ بہت بڑا ٹھیکیدار برف پوش وادیوں کی گود میں واقع اس چھوٹے سے گاؤں کو ہی اپنے شہر سے بھی زیادہ چاہتا ہے! یہاں کے لوگوں کو دل و جان سے چاہتا ہے! گاؤں والے بھی اس فرشتے کے قدموں کی آہٹ کو خوشی کا پیغام سمجھتے ہیں، جب بھی دَشرتھ ناتھ گاؤں میں چلا آتا ہے گھر گھر میں چراغاں ہوتا ہے!

دیودار درختوں کے جُھنڈ میں روپوش یہ گاؤں دُور دُور سے یوں نظر آتا ہے جیسے جنت سے اُتری پریاں طرح طرح کے چمکیلے ہیرے پہن کر رقص کر رہی ہوں! اسی دن ان لوگوں کی دیوالی ہوتی ہے!!

دَشرتھ ناتھ جب پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا تب تقریباً ۳۰ میل کا دُشوار گزار پیدل سفر کرنا پڑتا تھا! وہ جنگلات کا ٹھیکے دار ضرور تھا مگر اپنے کاروبار سے زیادہ دلچسپی وہ شکار کھیلنے میں لیا کرتا تھا! دن بھر کندھے پر بندوق رکھ کر اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے تقریباً ۴۰ سال کے شخص کو ایک روز شیتل کے باپ نے، بخار کی شدت سے تڑپتے ہوئے دیکھا تھا!

اس روز بھی زبردست برف باری ہو رہی تھی!!

اس کا بس چلتا تو ایک شہری بابو کو ہرگز ہرگز اپنے گھر نہیں لے آتا! مگر یہ شیتل کی ہی ضد تھی کہ دَشرتھ ناتھ ان کے گھر میں تقریباً ڈیڑھ مارہ رہا تھا!

تب شیتل کی عمر بہ مشکل سولہ سال تھی!

دَشرتھ ناتھ کو نمونیا ہو گیا تھا اور وہ درد سے تڑپ کر کبھی چپکے چپکے آنسو بھی بہا لیا کرتا تھا اور ان آنسوؤں کو فقط شیتل ہی دیکھا کرتی تھی! کبھی دَشرتھ کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اور کبھی بھیگے سرہانے کو چُھو کر!

ایسے حسین لمحات دَشرتھ ناتھ کو یاد ہیں اس لیے وہ گاؤں والوں کو بہت چاہتا ہے! جب بھی وہ شکار پر جاتا ہے تو سارا گاؤں اس کے ساتھ یوں چلتا ہے جیسے ایک شہنشاہ کے ساتھ حفاظتی دستے! کیونکہ دَشرتھ ناتھ اس گاؤں کا ہی نہیں بلکہ سارے پہاڑی علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے! اور یہ گاؤں گویا اس کی راجدھانی ہے! اس کے دیوان خانے میں یوں دربار لگا رہتا ہے جیسے مغلِ اعظم کا ایوان!

''میری بیوی مویشیوں کے ساتھ رہ کر دق ہو گئی سیٹھ جی!''

''میرے مکان کی چھت اُڑ گئی ودا تا!''

''دو دن سے بھوکا ہوں غریب پرور!''

''بس ایک بیلوں کی جوڑی مل جائے سخی داتا!''

دَشرتھ ناتھ واقعی لوگوں کی مُرادیں پوری کرتا رہتا ہے! وہ کسی کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ہے! لیکن شیتل نے کبھی دَشرتھ ناتھ سے کچھ نہیں مانگا تھا اور اگر وہ مانگ لے تو دَشرتھ ناتھ 'نا' کیسے کر سکے گا! شیتل نے اس کی جان بچائی تھی اور دشرتھ اس کا ذکر وہ خود کرتا رہتا ہے!

سفید سفید چادر کو بار بار پلنگ پر بچھاتے ہوئے شیتل کو بار بار ایک میلی کچیلی چادر کے دُھندلے عکس نظر آتے رہے! میلی کچیلی چادر پر لیٹے ایک بیمار کا عکس نظر آتا رہا! پھر اچانک کھانسی کی کھن کھن کی آواز کمرے میں سُنائی دی تو شیتل کو کسی کے قدموں کی آہٹ کا احساس ہوا! مگر اس سے پہلے کہ وہ شرما کر پلنگ پر بیٹھ جاتی، ایک دردناک چیخ نے اُسے چونکا دیا! گویا خون کے پیاسے ایک شیر نے ایک بکری کو دبوچ لیا ہو! یہ خوف اس کے وہم کا عکس تھا! اپنی کیفیت پر قابو پا کر ایک بار پھر سفید چادر کو یوں چُھو لیا جیسے اس نے پہلی بار دَشرتھ ناتھ کے سینے پر دس سال پہلے گرم گرم تیل کی مالش کی تھی! اُس روز وہ ہر سانس لیتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہی اس کی آخری سانس ہے! مگر رفتہ رفتہ تکلیف دِہ سانسوں کی تعداد کم ہوتی گئی! اور وہ ٹھیک ہو گیا تھا!

ایک طرف بھینس اور دوسری طرف چولھا اور بیچ میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا دَشرتھ ناتھ کبھی کبھی اپنی اس حالت پر رو پڑتا تھا! مگر چولھے سے اُٹھتا ہوا دُھواں جب کبھی باہر نکلنے کی بجائے اس کے اِردگرد پھیل جایا کرتا تھا! تب وہ دونوں یوں کھانستے رہتے تھے جیسے دو بڑے موسیقاروں کی جگل بندی! پھر دونوں ہنس پڑا کرتے تھے! اپنی دُکھتی ہوئی آنکھوں کو بھاری پلکوں سے سہلاتے ہوئے جب بھی دَشرتھ ناتھ شیتل کا چہرہ دیکھ لیتا تھا تب اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک شہزادی بھیس بدل کر پرجا کی دیکھ بھال کر رہی ہو!

دَشرتھ ناتھ واپس چلا گیا تو شیتل اکثر کھوئی کھوئی سی دہلیز پر بیٹھی آسمان سے گرتے ہوئے برف کے گالوں کو یوں دیکھتی رہتی تھی جیسے کاغذ کے پُرزے پیغام لے کر آئے ہوں! اور پھر ایک روز پیغام نہیں بلکہ دَشرتھ ناتھ خود چلا آیا تھا! اور وہ گاؤں کے بچّے بچّے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آیا تھا! کپڑے، پھل، آٹا، چاول، چھاتے وغیرہ! اس روز ایک فرشتے کی شناخت ہو گئی تھی! اور پھر دَشرتھ ناتھ تمام گاؤں والوں کا محسن بن گیا تھا!

''مگر دَشرتھ کی جان تو مَیں نے بچائی تھی!'' شیتل قالین کے ریشوں کو کھرچتی رہی اور

بڑبڑاتی رہی! الماری سے ایک لال رنگ کا جوڑا نکال کر جونہی اس نے پہنا تو ایک بھیانک آواز نے اسے چونکا دیا! شاید برف کا ایک بہت بڑا تودہ ڈھلوان سے پھسلتا ہوا گاؤں کی طرف جارہا تھا! کرکر کی آواز سن کر وہ کانپنے لگی لیکن جب سُوں سُوں کی آواز پھر نمایاں طور پر سنائی دی تب شیتل نے اپنے بالوں میں لال رنگ کے ربن باندھ لیے اور ہلکے ہلکے سُروں میں کوئی پہاڑی گیت گنگناتی رہی!

گئی رات جب دَشرتھ ناتھ اپنے کمرے میں چلا آیا تو شیتل کو دیکھ کر یوں چونک پڑا جیسے غلطی سے کسی انجان کمرے میں داخل ہوا ہو!

شیتل دَشرتھ ناتھ کے پلنگ پر بے فکری سے سوئی پڑی تھی! دَشرتھ ناتھ کی گرجدار آواز نے اسے چونکا دیا تو اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہی اس نے نہایت نرم و نازک لہجے میں پوچھا! ''میں نے آپ کی جان بچائی تھی نا؟''

''ہاں!''

''رانی کیکئی نے بھی راجہ دشرتھ کی جان بچائی تھی!'' شیتل کی آواز میں اپنائیت کی چاشنی بھی تھی اور کسی چھپی خواہش کا رس بھی تھا!

''تم بھی مانگ لو کیا چاہیے تمھیں؟'' دَشرتھ شیتل کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ چکا تھا!

''جو مانگ لوں وہ ملے گا؟''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں — یہ کپڑے، یہ زیور، یہ مکان، یہ جنگل، یہ دولت!''

''لیکن میں رانی کیکئی نہیں جو راج پاٹھ مانگ لوں! مجھے گھر چاہیے مکان نہیں! سکون چاہیے شہرت نہیں!''

''ٹھیک ہے! میں تمھاری شادی ایک ایسے شخص سے کروادوں گا! جسے میں مالا مال کرکے راج کمار بنادوں گا! مسرتوں سے بھری زندگی کی جھیل میں تم ایک بطخ کی طرح تیرتی نظر آؤ گی!''

''مجھے راجکمار قبول نہیں! میرے ہونے والے بچّے کو آپ اپنا جانشین نہ سہی اپنا بیٹا تو کہہ دیں!''

یہ سن کر دَشرتھ نے شیتل کو دھکیل کر جب غصّے سے سگریٹ پاؤں کے نیچے مسل دیا! تب شیتل کو یوں محسوس ہوا جیسے قالین پر ایک اَدھ جلی لاش پڑی ہے! دَشرتھ ناتھ کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئی تھیں!

''میں راجہ دَشرتھ نہیں جو کیکئی کے کہنے پر اپنے گھر کو آگ لگا دوں!''

پھر دَشرتھ ناتھ نے شیتل کو وہی لباس پہننے کے لیے کہا جو اس نے ایک رات پہلے پہنا تھا!

معمول کی طرح رات کے تیسرے پہر جب شیتل دَشرتھ کے پلنگ سے نیچے اُتر کر قالین پر لیٹ گئی تب اسے دَشرتھ یوں نظر آیا جیسے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے!

شیتل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں سے جھانک کر اندر دیکھنے والی کئی دیہاتی لڑکیاں چلّا چلّا کر کہہ رہی ہوں! ''شیتل تم ایک عورت ہو! رانی کیکئی بھی عورت تھی! دَشرتھ سے اپنا حق چھین کے لو! بغاوت کا نعرہ لگاؤ!''

اُس نے کھڑکی کھولی تو باہر زبردست برف باری ہو رہی تھی! سردی کی ایک چُبھتی ہوئی لہر نے دَشرتھ ناتھ کی نیند خراب کی وہ غصّے سے بڑبڑانے لگا! مگر شیتل سسک سسک کر پوچھتی رہی!

''میں نے آپ کی زندگی بچائی تھی! آپ کیوں میرے بچّے کو مار ڈالنا چاہتے ہو؟''

''میں راجہ دَشرتھ نہیں جو بھرت کو پیدا ہونے دوں گا! کل تمھیں میرے ساتھ شہر جانا ہوگا! اس بار پھر!''

''نہیں اِس بار نہیں! اِس بار نہیں!''

شیتل بولتی رہی، سسکتی رہی، رات بھر دشرتھ کے خرّاٹے کمرے میں گونجتے رہے! اور شیتل کی صداؤں کو دبوچتے رہے!

جیپ بہت آگے نکل چکی ہے اور برف کی چادر پر پہیّوں کے نشان دیکھ کر گاؤں کے سرپنچ نے شیتل کی ماں کو تسلّیاں دیتے ہوئے پوچھا! ''بوڑھی اماں! شیتل کو کب سے انتڑیوں کی بیماری لگی ہے؟''

بوڑھی نے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے فوراً کہا! ''پچھلے نو سال سے بیٹے!''

دشرتھ کے محل نُما مکان اور اُس کے ساتھ جڑے اُس کے گھی بنانے والے کارخانے میں کام کرنے والی گاؤں کی کنواری لڑکیوں اور جوان عورتوں میں چند تماشائیوں نے جب شیتل کی ماں کی آواز سُن لی تو وہ سکتے میں آ گئی!

سبھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں غصّے کی لالی اُبھرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بے آواز، مگر تھرتھراتے ہونٹوں کو دیکھتی رہیں!!

OO

پیاسی آنکھیں

”کون ہے یہ لڑکی؟ کون ہے یہ لڑکی؟“

ترلوک پنڈت بڑبڑاتے ہوئے اور آس پاس کھڑے لوگوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے اِردگرد اس کے چاہنے والے نہیں ہیں بلکہ وہ خود چھاپہ مار پولیس کے دستے کے چنگل میں پھنسا ہوا ایک مشکوک کردار ہے!

یوں تو اس کے اِردگرد ہر وقت حسین وجمیل، شوخ وچنچل ہندوستانی یا غیر ملکی لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں، موجود رہتی ہیں! لیکن آج وہ ان کی موجودگی سے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ سے بھی گھبرا رہا ہے! اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آگے پیچھے دائیں بائیں یوں چل رہا ہے جیسے ملائم قالین پر نہیں بلکہ انگاروں پر چلتے چلتے اُچھل رہا ہو! اس کے چہرے کی کیفیت بھی نرالی ہے اور اُس کو کسی نے اس حالت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے!!

ایک مریل سی نابالغ لڑکی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی یوں رو رہی ہے جیسے بین کر رہو! جبکہ ایک خوبصورت عورت برآمدے میں الگ تھلگ کھڑی ہو کر ساڑی کے پلّو کو منہ میں دبا کر اَدھ کھلی کھڑکی سے ترلوک پنڈت کو دیکھ رہی ہے جبکہ آس پاس کھڑے تماش بینوں کی نظریں سسک رہی لڑکی پر جمی ہوئی ہیں!

”کون ہے یہ لڑکی؟“ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر جب ترلوک پنڈت زور سے چیخ پڑا، تب اس کی آواز اس ہال نُما کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج اُٹھی اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی! تھوڑی دیر بعد جب خاموشی کو چیرتی ہوئی اس عورت کے قدموں کی آہٹ نے سب کو چونکا دیا! تب یوں محسوس ہونے لگا جیسے خاموشی کے بعد ایک زبردست طوفان آنے والا ہو!

ہال میں موجود تمام لوگ خاموش ہیں مگر تشویش ہر ایک کے ذہن پر قابض ہے!

”نہیں، نہیں! ترلوک پنڈت ایک قابلِ ستائش فرد ہے!“

''ہاں! یہ ہماری نادانی ہے جو غلط سوچ کو اپنے عمل میں شامل کررہے ہیں!''

''مگر رنگ رُوپ دیکھ کر تورِشی منی بھی پھسل جاتے ہیں؟-!!''

''قصور مینکا کا تھا، وشوامتر کا نہیں! اور نہیں تو کیا؟!''

''مگر یہ لڑکی نابالغ ہے!-؟؟''

''ناسمجھ ہے! پگلی ہے! دیوانی ہے!''

''مگر یہ عورت کون ہے؟''

طرح طرح کے سوالات نے حاضرین کے غور وفکر کو طاقتور دشمن کی طرح گھیر لیا ہے اور وہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے! کیوں آئی ہے؟

ہر چہرے پر ایک سوالیہ نشان دیکھ کر ترلوک پنڈت کی حالت بالکل ویسی ہے جیسے ستار کی ایک تار اچانک ٹوٹ کر لٹک گئی ہو!

یہ کمسن لڑکی آشا ہے اور یہ عورت پدماوتی! ان کے بارے میں چند لوگ فقط اتنا جانتے ہیں کہ دونوں تقریباً دو ماہ پہلے کسی پہاڑی علاقے سے آئی ہیں! اس کے علاوہ کوئی جانتا بھی تو کیسے؟

ترلوک پنڈت کے آشرم میں اس کے چاہنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے! آشرم میں کون آیا، کسی کو فکر نہیں! کون گیا اس کا کہیں ذکر نہیں! آنے والے کی کیفیت یوں ہوتی ہے جیسے وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے آیا ہو! جبکہ جانے والا یوں نظر آتا ہے جیسے ایک پیاسا کسی ٹھنڈے چشمے کا میٹھا پانی پی کر جا رہا ہو!

ترلوک پنڈت کے پاس واقعی سنگیت کا ایک ایسا چشمہ ہے جس سے ہزاروں سنگیت پریمی اپنی پیاس بجھاتے رہتے ہیں! ان کے بجائے ہوئے ستار میں ایسی انوکھی کشش ہے جو رفتہ رفتہ دل کو کھینچ کر مسرت وسکون کے حدود میں لے آتی ہے اور من کی تاریکیاں اُجالوں میں بدل جاتی ہیں!

چھ مہینے پہلے ایک خود اندھیرے غار میں رہنے والے اس غیر معروف موسیقار کو خدا نے ایک مختصر عرصے میں عزّت وشہرت کا وہ عروج بخشا ہے جو قابلِ رشک بھی ہے اور ناقابلِ یقین بھی! اس کی زندگی ایک ایسی کہانی ہے جس کو سُن کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے اُس کا کردار کسی سحر نگار کی تخلیق ہے یا پھر کسی جادوگر کا حسین کرشمہ ہے!!

ترلوک پنڈت کا کنسرٹ سننے کے لیے جانے کہاں سے لوگ چلے آتے ہیں! ان لوگوں میں آشا بھی ہے! اور پدماوتی بھی! مگر دونوں کی کیفیت اوروں سے مختلف ہے! دونوں کو موسیقی

سے زبردست لگاؤ ہے مگر جب سامعین ساز کی آواز سن کر مست ہو جاتے ہیں تب آشا ان کے سرور کا فائدہ اٹھا کر پنڈت جی کے قریب جانے کی یوں کوشش کرتی رہتی ہے جیسے سیماب کا ایک قطرہ کھلونے کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا! ایک سُوراخ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے! اور جب اسے پنڈت جی کی قربت کا شرف حاصل ہوتا ہے تب وہ سنگیت کے جادوگر کی انگلیاں دیکھنے کی بجائے اس کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر یوں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے جیسے ایک گہری جھیل میں اپنا کھویا ہوا کھلونا تلاش کر رہی ہو! ایک نادان بچّی کی طرح!! جبکہ پدماوتی دُور کسی کونے میں بیٹھی کبھی آشا کو اور کبھی ترلوک پنڈت کو یوں دیکھتی رہتی ہے گویا ان کو نقل وحرکت پر کڑی نگاہ رکھنا ہی اس کا مقصد ہے!

آشا ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہے کہ کب کنسرٹ ختم ہو جائے، لوگ چلے جائیں اور وہ پنڈت جی کے قریب یوں بیٹھی رہے جیسے شوالے کے سامنے بھگت! مگر جب کنسرٹ ختم ہو جاتا ہے تب وہ پردے کو یوں دیکھتی رہتی ہے جیسے پنڈت جی چاند کی طرح عارضی طور پر بادلوں کے پیچھے چُھپ گئے ہوں!

بادل چھٹ جائیں گے! اور چاند پھر سامنے ہوگا! یہ سوچ کر وہ پردے کو ٹکٹکی لگا کر تب تک دیکھتی رہتی ہے جب تک اسٹیج پر چلنے والا کوئی سازندہ، لائٹ مین یا آشرم کا کوئی آدمی اس کو اپنی احمقانہ حرکت کا احساس نہیں دلاتا ہے! اس وقت جب وہ پلٹ کر ہال کے دروازے کو دیکھنا چاہتی تو ہال کے کسی کونے میں پدماوتی یوں موجود ہوتی ہے جیسے کسی مجرم کا تعاقب کرنے والا جاسوس! یوں بار بار ہوتا رہتا ہے اور ہر بار پدماوتی اور آشا دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں جھکا دیتی ہیں! اور دروازے کا رُخ کر دیتی ہیں! فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پدماوتی نیم دوڑ لگا کر یوں باہر نکل آتی ہے گویا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو! جبکہ آشا دو قدم چل کر پلٹ کر پردے کو دیکھ لیتی ہے! پردے کی جنبش دیکھ کر رُک جاتی ہے اور پھر آہ بھر کر یوں چل پڑتی ہے جیسے قید سے فرار ہوا قیدی ایک بار پھر قید خانے کی طرف جانے لگا ہو!

آشا جسے چشمہ سمجھ بیٹھی ہے! پدما اسے سراب کہہ کر بھی جانے کیوں اسے قریب سے دیکھنا چاہتی ہے! شاید اسی لیے وہ بھی دُور دُور سے یا آس پاس کہیں چھپ کر بیٹھی ہوئی ترلوک پنڈت کو اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے!!

بتیس برس کی عمر میں پدماوتی کا جسم جتنا پُرکشش ہے آشا کی شکل وصورت اتنی ہی بے کشش

ہے! ڈھیلے ڈھالے لباس میں سولہ برس کی عمر میں آشا کا جسم یوں نظر آتا ہے جیسے غبارے میں تھوڑی ہوا نکال دی گئی ہو! زرد چہرہ، بے ترتیب بال اور اس پر طرّہ یہ کہ آنکھوں کے دائرے بھی لالی سے ڈھکے ہوئے! کل کی آشا اور آج کی آشا میں کتنا فرق ہے! وہ ہونٹ جو آج ایک سوکھے گلاب کے مانند ہیں کل وہ اتنے ہی شاداب تھے جتنے برسات کے موسم میں ہرے بھرے پھول! کل وہ اتنی شوخ و چنچل تھی جتنے بہار کے موسم میں پھولوں کے شگوفے! صبح سے شام تک وہ بس ناچتی گاتی رہا کرتی تھی! باپ کے بجائے ہوئے ساز پر بیٹی کی آواز ان کے گھر میں ہر وقت گونجتی رہتی تھی! جب آشا ایک ننھی سی بچّی تھی تب سے وہ اپنے باپ کے سینے سے چمٹ کر یا گانا سنا کرتی تھی یا سنایا کرتی تھی! مگر آج اس کے ہونٹ منجمد ہو کر رہ گئے ہیں! اور کانوں میں گویا روئی ڈالی ہوئی بیٹھی ہے!

آشا کا باپ ایک مشہور و معروف سنگیت کار تھا! مگر وہ شہرت کو ایسی خوشبو سمجھتا تھا جو ہوا کے ساتھ پھیل کر کچھ دیر بعد ہوا میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے! رُتبے کو بھی وہ ایک ایسا نشہ سمجھتا تھا جو فن کار کو اپنا غلام بنا دیتا ہے! اور سمجھتا تھا کہ جو خود غلام ہو وہ دوسرے پر کیسے راج کر سکتا ہے! ایسی باتیں سنا سنا کر وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنی شہرت میں شریک بنانے کی بجائے اپنی منطق کے حوالوں سے اکثر رشتوں اور ناطوں کا احساس دلاتا رہتا ہے! باپ اور بیٹی کا ایک اٹوٹ جذباتی رشتہ ہوتا ہے جبکہ ایک سنگیت کار اور سنگیت کا ایک ناطہ ہوتا ہے! گویا رشتوں اور ناموں کی کیفیت جُدا جُدا ہے! ایک سہارا ہے تو دوسرا ساتھی! پھر ایک دن سہارا ٹوٹ گیا تھا اور ساتھی بھی روٹھ گیا تھا! سُر خاموش ہو گئے تھے، ٹھمری مرثیہ بن گئی تھی! اور دادرا نوحہ خوانی!! تب پدما سسکتی رہتی اور اس کی اِکلوتی بیٹی آشا یوں ہچکیاں لیتی رہی جیسے ایک طبلہ بے ساز ہو کر تھپ، تھپ کر بج رہا ہو! ماں اور بیٹی دونوں اپنے آبائی وطن لوٹ آئے تھا! تو ماں نے جدائی کے بھاری وزن کو مجبوری کے بوجھ کے نیچے دفن کرنے کی کوشش کی مگر بیٹی نا سمجھ تھی اس لیے وہ اکثر اَدھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر بادل کے ٹکڑوں کو دیکھتی تھی جن میں وہ اکثر اپنے والد کو دیکھتی رہتی تھی! کبھی وائلن بجاتے ہوئے! کبھی ریاض کرتے ہوئے اور کبھی اپنی بچّی کو سینے سے لگاتے ہوئے آشا کی خواہشات کا دِیا جب ٹمٹمانے لگا تب پدماوتی نے اپنے خونِ جگر سے باتی جلانے کی کوشش کی مگر آشا کی کیفیت ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی مانند ہوا کرتی تھی! پدماوتی نے بھی ایک سوئے ہوئے فنکار کو جگانے کی کوشش کی تھی! مگر ہر بار یوں محسوس ہوا تھا جیسے فنکار بڑی گہری نیند سو رہا ہے!!

محلے کے چند دل پھینک لڑکوں نے جب ایک اجنبی لڑکی کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی تب بھی ایک غیور ماں خاموش رہی! فقط یہ سوچ کر شاید عشق کی تپش سے وہ برف پگھل جائے جس کے نیچے آشا کے جذبات احساسات وخیالات دَب گئے ہیں! مگر برف کی ہر تہہ ایک گلیشر بن چکی تھی اور لوگ سمجھ بیٹھے تھے کہ آشا پاگل ہوگئی ہے!

آشا واقعی پاگل ہوگئی تھی!!

اس روز آشا کے پاپا کا تین ماہ کا شرادھ تھا! پدماوتی نے مرحوم کی آتما کی شانتی کے لیے بہت سارے پنڈتوں اور پنڈوں کو گھر بلایا تھا! وہ لوگ منتر پڑھ رہے تھے اور اچانک جانے کیا سوچ کر آشا نے ایک بھجن گایا تھا! ایک طویل عرصے کے بعد اس کی درد بھری آواز سن کر پدماوتی تو کیا پنڈے بھی یوں رو پڑے تھے جیسے سیلاب کا پانی بے قابو ہو کر سب کچھ بہا کے لے جا رہا تھا!!

سیلاب کا پانی بہہ چکا تھا اور آشا یوں بے ہوش پڑی رہی جیسے ملبے کے نیچے آخری سانسیں لیتا ہوا کوئی بدنصیب!

پھر کئی روز بعد بستر پر کرٹیں بدلتے ہوئے آشا نے ایک جریدے میں چھپے ہوئے ایک مضمون کو دیکھ کر چونک پڑی تھی!

یہ جریدہ شہر سے لایا گیا تھا! ڈاکٹر اپنی غفلت کی وجہ سے وہاں چھوڑ گیا تھا! مگر جو اثر ڈاکٹر کی دوائیاں نہ کر سکی تھیں وہ کرشمہ اس مضمون نے کر کے دکھایا تھا! ایک طویل عرصے کے بعد خود ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ میں جریدہ لیے وہ دہلیز پر یوں بیٹھی رہی گویا پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کر رہی تھی! اور بار بار مضمون پڑھ رہی تھی! یہ مضمون ترلوک پنڈت پر خاص طور سے لکھا گیا تھا! اور آشا بار بار پنڈت جی کے فن کے بارے میں کچھ پڑھنے کی بجائے ان کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر یوں خلاؤں میں گھورنے لگی تھی گویا ایک نامکمل تحریر کو پورا کرنے کی خاطر خانہ پُری کرنے کی کوشش کر رہی تھی! اور چند روز بعد ماں کو بیٹی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال کر ترلوک پنڈت کے آشرم جانا پڑا تھا!

طے یہ ہوا تھا کہ آشا ترلوک پنڈت کو ایک بار دیکھ کر فوراً واپس پوٹ کر آئے گی، مگر پنڈت جی کو دیکھتے ہی ماں کا ارادہ بھی بدل گیا تھا اور بیٹی کی ضد خدشات پر حاوی ہو کر دونوں کے عمل کا حصہ بن گئی ہے! دونوں ترلوک پنڈت کے قُرب میں رہنا چاہتی ہیں!

ماں اور بیٹی دونوں جب ترلوک پنڈت کی آنکھوں میں جھانک کر وہ دیکھنے کی کوشش کرتی رہی

ہیں! تب یوں محسوس ہوتا رہا ہے جیسے وہ دونوں ایک دُھندلے آئینے میں ماضی کے عکس دیکھ رہی ہوں!

پہلے پہل ترلوک پنڈت آشا کو اپنا فین سمجھ کر بس مسکراتا رہا مگر آشا کی معنی خیز نگاہوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی رفتہ رفتہ آشا میں خاصی دلچسپی لینے لگا!

آخر تجسّس کھُل گیا! پنڈت جی آشا کو اپنے ساتھ بٹھا کر جب بھی ریاض کرتا رہتا تھا تب آشا کی انگلیاں اکثر تان پورے سے یوں پھسل جایا کرتی تھیں جیسے ایک گلیشیر پر چڑھتا ہوا کوئی اناڑی اچانک پھسل کر کسی کھائی میں گرتا جا رہا ہو! بار بار!!

لیکن پھر بھی آشا کو ہر بار یوں محسوس ہوتا رہتا تھا جیسے اس کا پسندیدہ شخص اس کے سامنے بیٹھا تو ہے مگر بیچ میں ایک شیشے کی موٹی دیوار ہے! اور دیوار کو ہٹانا ہی اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہے!

کاش یہ دیوار شیشے کی نہیں بلکہ برف کی ہوتی! شاید چاہت کی تپش یا خلوص کی آنچ سے پگھل جاتی! اور آج یہ دیوار ہٹ گئی تھی!!

ترلوک پنڈت کے ہال نما کمرے میں ہر وقت سازندے موجود رہتے ہیں! پنڈت جی کے مدّاح بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں! دُور دراز علاقوں سے آئے ہوئے موسیقار آس پاس موجود رہتے ہیں! مگر آج صبح سویرے جب آشا نے دروازہ کھولا تھا تو پنڈت جی سازوں کے بغیر ہی ریاض کر رہے تھے!

کیونکہ آشا کو اِسی دن کا شدّت سے انتظار تھا اس لیے اور وہ پنڈت جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کے سُر سے سُر ملا کر گاتی رہی! ساز اور آواز کی جگل بندی ہال میں گونجنے لگی، تو برآمدے میں لوگ جمع ہوتے گئے!

اچانک ترلوک پنڈت نے اپنے دونوں بازو یوں پھیلا دیئے جیسے مجنوں لیلیٰ کو آواز دے رہا تھا! آشا بھی اچھل کر اس کے سینے سے پلٹ کر یوں رو پڑی تھی جیسے ایک کمزور باندھ کی ایک دیوار ٹوٹ گئی تھی اور بے قابو پانی بہتا جا رہا تھا!

جبکہ زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ سے لپٹ کر ۷۰ سال ترلوک پنڈت کو یوں محسوس ہوا جیسے آبشاروں کا اُچھلتا ہوا پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا جل ترنگ بجا رہا ہو!

کمرے کے ہر گوشے سے ساز بجنے لگے مگر آشا کی کیفیت نرالی تھی!

نظریں اٹھا کر جب اس نے پنڈت جی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہ گھبرا گئی! کیونکہ اس نے ٹھنڈک کی بجائے ایک جھلس دینے والی آنچ محسوس کی! جب ترلوک پنڈت کے تھرتھراتے ہونٹوں نے آشا کے ہونٹوں کا بوسہ لینا چاہا تب آشا چیخ پڑی تھی اور اپنے بولے ہوئے ''پاپا'' کی گونج سُن کر وہ ترلوک پنڈت کے جسم سے الگ ہو کر یوں بے ساختہ رو پڑی جیسے ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد آوارہ بادل کسی جنگل میں بے بس ہو کر پھٹ کر برس پڑے ہوں!

''پاپا'' کا لفظ سن کر ترلوک پنڈت یوں ڈگمگانے لگا جیسے وہ موجوں سے ٹکراتی ہوئی کشتی کے بادبان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر وہ ایک خندق میں ہاتھ پاؤں مار کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا! اس کے کانوں میں لفظ 'پاپا' کے ساتھ ساتھ بادلوں کے پھٹ جانے کی آواز گونجتی رہی اور وہ بڑبڑاتا رہا!

''کون ہے لڑکی؟ کون ہے یہ لڑکی؟''

پدماوتی کے آنسو اس کے گالوں کو چھو کر اس کے سینے میں پناہ لیتے رہے! اور اس کے ہونٹ یوں تھرتھراتے رہے جیسے تیز ہوا کے جھونکوں سے درخت کے پتے!!

ترلوک پنڈت کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر پدماوتی کچھ کہتے ہوئے رُک گئی مگر پھر ایک آہ بھر کر وہ نظریں پھیر کر یوں بول پڑی جیسے ہر لفظ گلے کو لہولہان کرتا ہوا باہر آ رہا تھا!

''یہ معصوم لڑکی اس عظیم سنگیت کار کی بیٹی ہے! جس نے مرتے وقت اپنی خوبصورت آنکھیں دے کر تمھاری دُنیا روشن کر دی ہے! ترلوک پنڈت!''

''تو کیا؟ تو کیا؟ یہ لڑکی! یہ لڑکی مرحوم پرکاش پنڈت کی بیٹی ہے؟—!!—؟؟''

ترلوک پنڈت بڑبڑانے لگا اور پھر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ یوں رو پڑا جیسے وہ ان اُجالوں پر مرثیہ پڑھ رہا ہو جو تقریباً چھ ماہ پہلے پرکاش پنڈت اسے دے چکا تھا!

آس پاس کھڑے گھر کے نوکر پنڈت جی کے شاگرد، مداح، ملاقاتی ماں، بیٹی کو دیکھتے رہے اور وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف یوں چل رہے ہیں جیسے وہ شمشان گھاٹ سے سے اُٹھ کر اپنے اُجڑے گھر کی طرف جا رہے ہوں......!!

ماں بیٹی دونوں پر ایک جیسی کیفیت طاری ہو چکی ہے!

OO

کرب

ایک ایسے قتل کیس جس کے بارے میں صحافیوں اور افسروں کے علاوہ عوام بھی پوچھ تاچھ کرنے لگی ہے! اس کی تحقیقات جہاں ڈاکٹر ریحانہ کے حوصلہ شکن رویئے کی وجہ سے تھم سی گئی تھی وہ مشکوک کردار غنی کے ادھورے بیانات کی وجہ سے اُلجھ بھی گئی ہے!

تحقیقات کو مکمل کرنے کے لیے مقتولہ سلمیٰ کے شوہر سلیم کا بیان اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ ایف آئی آر دینے والا وہی تو ہے لیکن جب بھی انسپکٹر خان ڈاکٹر ریحانہ سے سلیم کے بیان کی ضرورت اور اہمیت کی بات کرتا ہے تب وہ انٹنسیو کیئر (ICU) میں پڑے مریض کی تشویش ناک حالت کا حوالہ دے کر بھڑک اٹھتی ہے! جبکہ غنی پولیس کی حراست میں ہوتے ہوئے بھی اپنا بیان دیتے دیتے بار بار پلٹیاں مارتا ہے، کبھی نہایت سنجیدگی سے کیس سے تعلق رکھنے والے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے، کہیں سے کہیں پہنچ کر، کبھی بے ساختہ رو پڑتا ہے اور باتوں کا سلسلہ توڑ دیتا ہے اور کبھی بلاوجہ قہقہے لگاتے ہوئے اپنی بے تکی و بے ہودہ باتوں کا سلسلہ سختی سے ٹوکنے کے باوجود جاری رکھتا ہے! ہاں بار بار پوچھتا رہتا ہے "کیا سلیم کے بچنے کی کوئی اُمید ہے؟" اور جب انسپکٹر خان غنی کے اس سوال کے بارے میں سوچتا رہتا ہے کہ کیا غنی سلیم کی زندگی چاہتا ہے یا موت؟ یعنی کیا وہ زندہ رہ کر غنی کے گلے میں پھندہ ڈالنے کے لیے بیان دے گا یا پھر مر کر غنی کے گلے میں دن بدن تنگ ہو رہے پولیس کے شک سے پھندے کو نکال دے گا؟؟

کیس کی شروعات دس دن پہلے تب ہوئی تھی جب سلیم نے پولیس کو اپنا نام و پتہ بتا کر فقط اتنا بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی سلمیٰ! اور جملہ پورا کرنے سے پہلے وہ خاموش ہو گیا تھا! کیونکہ سلیم کی آواز میں لرزش تھی اس لیے انسپکٹر خان اپنی ٹیم لے کر فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا تھا! یہ دیکھ کر مکان کے اندر داخل ہونے والا لوہے کا حفاظتی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا بلکہ مکان میں داخل ہونے والا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا اس لیے کئی بار کال بیل دبا کر کوئی جواب نہ سن کر ان کو

تشویش ناک حالات میں دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی!

ایک عالی شان بنگلے کی پہلی منزل کا ہر کمرہ خالی خالی تھا، مگر دوسری منزل کے ایک بیڈروم میں فرش پر منہ کے بل گرا ہوا ایک شخص تھا جس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا ریسیور تھا! نہایت احتیاط سے جب انسپکٹر خان نے Redial کا بٹن دیا تب یہ ثابت ہوگیا کہ اسی شخص نے اسی فون سے پولیس کو واردات کے بارے میں اطلاع دی تھی! پلنگ پر ایک خوبصورت عورت لیٹی تھی جو دراصل میں ابدی نیند سو رہی تھی!! میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اس شخص کا ایک مقتولہ کے ساتھ فوٹو، اگر میز پر پڑا نہ ہوتا تو کوئی بھی یقین نہیں کرتا کہ وہی اس محل نما گھر کا مالک ہے، یعنی وہی اطلاع دینے والا سلیم بیگ ہے، جو نیم بے ہوشی میں انسپکٹر خان کو غنی سمجھ کر کچھ پوچھ رہا تھا مگر اس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ الفاظ کو دبوچ کر روک رہی تھی! سلیم کی یہ حالت اور دروازے و پھاٹک کا کھلا ہونا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ گھر میں کوئی اور بھی تھا جو پولیس کے آنے سے پہلے جا چکا تھا، وہ کون تھا؟ تحقیقات کے لیے یہ ایک اہم نقطہ تھا! کیونکہ شروعات سے ہی غنی شک کے دائرے میں نظر آ رہا تھا تبھی تو اس کو حراست میں لیا گیا تھا! ابتدائی تحقیقات سے یہ جانکاری حاصل ہو چکی تھی کہ کسی دُور دراز پہاڑی علاقے سے آیا ہوا محمد سلیم بیگم آٹھ مہینے پہلے خریدے ہوئے اس عالیشان بنگلے میں اپنی بے حد خوبصورت بیوی سلمٰی کے ساتھ ایک نہایت خوشحال زندگی گزار رہا ہے مگر ان کے پڑوس میں رہنے والے پرنسپل کول اور اس کی بیوی کی اطلاع کے مطابق اس گھر کی خوشیوں پر تقریباً تین مہینوں سے دکھ کا گرہن لگا ہوا تھا!!

یوں تو میاں بیوی کا اڑوس پڑوس والوں سے کچھ زیادہ میل جول نہیں تھا مگر پری چہرہ سلمٰی کو دیکھنے کے لیے آس پاس کے لوگ تاک جھانک کرتے رہتے ہیں! مگر سلمٰی پرنسپل کول میں اپنے باپ کے عکس دیکھ کر اکثر ان کے گھر میں آتی جاتی رہتی تھی! پہلی بار جب سلیم اور سلمٰی نے اس گھر میں قدم رکھا تھا تب ان کی بیٹی آشا کی شادی تھی! شادی کے دس دن بعد آشا امریکہ چلی گئی تھی اور سلمٰی نے اس گھر میں ان کی اکلوتی بیٹی کی جگہ لی تھی، چونکہ سلیم کو ادب اور موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا اس لیے وہ بھی خیالاتی و جذباتی طور پر اس پُرسکون گھر کے بلند ذوق و دانشور جوڑے سے بھی لگاؤ تھا! جب سلیم اپنے کام کاج کے لیے نکل پڑتا تھا تب سلمٰی پرنسپل کول سے لکھنا پڑھنا اور ان کی موسیقار بیوی سے راگ رانگیاں سیکھنے میں دلچسپی لیتی رہتی تھی! کب وہ اپنے ناراض باپ کو خط لکھ

پائے گی یہ سلمیٰ کا ارمان تھا! دراصل سلمیٰ نے اپنے باپ، جو ایک معمولی فارسٹ گارڈ ہے، کی مرضی کے خلاف علاقے کے امیر ترین جنگلوں کے ٹھیکیدار اور بے تاج بادشاہ کے داماد سلیم کے ساتھ شادی کی ہے اور چونکہ سلیم نے بھی باغی بن کر دوسری شادی کر لی ہے اس لیے اس نے غنی کے علاوہ کسی کو نہ شادی سے پہلے اپنے ارادوں کے بارے میں ذکر کیا تھا اور نہ شادی کے بعد اپنا پتہ دیا تھا! یعنی وہ اپنے گھر والوں سے الگ تھلگ ہو گیا تھا! سلمیٰ کا باپ اور سلیم کا پورا خاندان دونوں کی شادی سے سخت بے زار ہیں!!

غنی سلیم کا ہم عمر ہے، بچپن کا دوست اور جوانی کا ہم راز ساتھی، حقیقتاً غنی دس سال کی عمر سے سلیم کے گھر والوں اور خاص طور پر سلیم کی پہلی بیوی ثریا بیگم کا فرماں بردار اور قابلِ اعتماد نوکر ہے، سلیم بھی غنی پر آنکھیں بند کر کے بھی بھروسہ کرتا ہے مگر سلمیٰ غنی سے بدبو کی طرح نفرت کرتی تھی!! اس کو غنی کا بار بار گھر میں آنا جانا اچھا نہیں لگتا تھا! وہ بھی اس لیے کہ وہ جانے کون سا حق جتاتے ہوئے اس کے ساتھ نوک جھونک سے لے کر روک ٹوک کرتا رہتا تھا! دونوں میں جھگڑا ہو جاتا تھا اور اکثر سلیم غنی کو روکنے یا ٹوکنے کی بجائے اس کی طرف داری کر کے سلمیٰ کو رُلا دیا کرتا تھا! سلمیٰ روٹھ کر پرنسپل کول کے گھر جایا کرتی تھی! دوسرے دن سلیم اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو جیسے تیسے منا کر لے جایا کرتا تھا اور پھر دونوں سیر سپاٹوں کے لیے جا کر اپنے والہانہ پیار کی ہلکی ہلکی آنچ سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے! لیکن بقول مسز کول پچھلے دو تین مہینوں سے سلیم روکھا روکھا بدلا بدلا نظر آ رہا تھا اور غنی کے ساتھ صبح سویرے گھر سے نکل کر دن بھر جانے کیوں اور کہاں جایا کرتا تھا! چونکہ سلمیٰ الگ تھلگ رہ جاتی تھی اس لیے مایوسیوں و خدشات کے دلدل میں دھنس دھنس کر اس نے اُن کے گھر میں بھی آنا جانا چھوڑ دیا تھا! ایک کوئل کی طرح چہکتی اور پھولوں کی طرح مہکتی سلمیٰ ایک شاخ سے جدا ہوئی ٹہنی کے پتوں کی طرح مرجھا گئی تھ!

موت کی آغوش میں سو جانے سے ایک دن پہلے جب مسز کول ان کی بیٹی کے امریکہ سے سلمیٰ کے لیے بھیجے ہوئے تحائف اُس کو دینے گئی تھی تب سلمیٰ اپنے بیڈروم میں اکیلی بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی جبکہ سلیم اور غنی دوسرے کمرے میں ایک دوسرے سے چپک کر سرگوشیانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے!

وہ سلمیٰ کی لاش دیکھ کر جب چیخ پڑی تھی تب پوچھتا چھ سے جانکاری ملی تھی! سلمیٰ نے دبے

الفاظ میں مسز کول کو یہ بتا دیا تھا کہ تین مہینے پہلے جب میاں بیوی کسی اور ڈاکٹر سے ملنے گئے تھے تب ان کی ڈاکٹر ریحانہ سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی تھی! پہلے دونوں ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح دیکھتے رہے لیکن جونہی دونوں دوسرے کمرے میں چیک اپ کیے گئے تھے اور وہاں دونوں نے گھنٹہ بھر گزارا تھا دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار گر چکی تھی! اس دن ڈاکٹر ریحانہ نے سلیم کو دوسرے دن پھر بلایا تھا اور چند دن بعد سلیم غنی اور ڈاکٹر ریحانہ دہلی چلے گئے تھے! گھر واپس لوٹے تھے تو حسبِ معمول سلمیٰ کا غنی سے جھگڑا ہوا تھا! سلیم نے اس دن پہلی بار غنی کو نہ صرف روکا تھا بلکہ بوکھلا کر اس کو پہلے پیٹا تھا اور بعد میں دونوں بے ساختہ رو پڑے تھے اور گئی رات تک روتے رہے تھے! تب سے سلیم دن بدن بدلا بدلا، روکھا روکھا اور تنہا تنہا نظر آتا رہا!

بقول پرنسپل کول ان کے گھر اکثر آ کر کلاسیکل سنگیت سننے والا سلیم شاید کسی زبردست ذہنی تناؤ کا شکار تھا! اس کا اشارہ سلیم کی پہلی بیوی ثریا کی طرف تھا کیونکہ سلیم نے ایک بار ان کو یہ بتا دیا تھا کہ ثریا اس سے عمر میں دس سال بڑی ہے! اور اپنی بیوہ بھابھی اور چچیری بہن سے اس نے اپنے چاچا کے دباؤ میں آ کر شادی کی تھی! یہ بھی بتایا تھا کہ ثریا ایک مغرور، سخت دل، جابر اور بد دماغ عورت ہے، جو اپنی ضد پوری کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتی ہے! ایک مثال دیتے ہوئے اس نے ایک واقعہ سنایا تھا — جب ان کے سب سے اچھے گھوڑے سے وہ اپنی ہی غلطی کی وجہ سے گر گئی تھی تب اس نے اپنے فرماں بردار نوکر غنی کے گھوڑے کو گولی مار کر مار ڈالنے کا حکم دیا تھا!

انسپکٹر خان کی اپنی ذاتی نگرانی میں کی گئی تحقیق کی روشنی میں ثریا ۳۸ سال کی عمر میں بھی ۱۸ سالہ سلمیٰ سے بھی زیادہ باوقار اور خوبصورت ہے! مگر ضدی ہے اور وہ اپنی ضد کو پورا کرنے کی خاطر ایک کوبرا کی طرح جب اپنے شکار کے پیچھے پڑ جاتی ہے تب ڈنک مار کر ہی دم لیتی ہے! اس کے بیان اور طرزِ کلام سے انسپکٹر خان کو یوں لگا تھا کہ ثریا انتقام کو انجام تک پہنچانے کی خاطر سلمیٰ کی لاش کو بھی اپنے عتاب کا شکار اس لیے بنانا چاہتی تھی کیونکہ اُس کو یقین ہے کہ سلمیٰ اور اس کے باپ نے مل کر سلیم کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر سلیم کو اپنے جال میں پھانس لیا تھا! جب ثریا کو یہ معلوم ہوا تھا کہ اس بار سلیم ایک پھول کو مسلنے کی بجائے پھول کی مہک سے پیار کرنے لگا ہے تب اس نے ہنگامی حالات میں سلمیٰ کے باپ کو بے حد ذلیل کر کے یہ فرمان سنایا تھا کہ فوری طور پر سلمیٰ کی شادی گھر کے مالک کی بجائے گھر کے نوکر غنی سے کر دی جائے اور دونوں کو سلیم سے دُور رکھا جائے! مگر

حقیقتاً جو ہوا تھا وہ اس کے برعکس تھا! یعنی جب سلیم سلمیٰ کو لے کر فرار ہو گیا تھا تب غنی نے بادلِ نخواستہ معمول کی طرح سلیم کا ساتھ دیا تھا! حالانکہ ثریا کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا صدمہ اس کے لیے سلمیٰ کے لیے نفرت کا زہر بن گیا تھا! ظاہر ہے غنی تاک میں بیٹھا شکاری تھا اور معصوم سلمیٰ ایک شکار!!

سلمیٰ کو اس بات کا ملال تھا کہ اس کا شوہر ایک بداخلاق نوکر کی بدتمیزی کیوں برداشت کر رہا ہے؟ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ I.C.U کی نگرانی کرنے والے نہایت سنجیدہ اور سلجھے ہوئے سپاہی غلام قادر نے جب سلیم کو پہچان لیا تھا تب اس کو دو سال پہلے کا ایک قصّہ یاد آیا تھا! ہوا یوں تھا کہ ایک پولیس پارٹی نے چرس کی اسمگلنگ کے سلسلے میں ایک ہاؤس بوٹ میں رہنے والی ایک خوبصورت بدیشی لڑکی کو گرفتار کرنے کی خاطر جب ریڈ کیا تھا تب انھوں نے سلیم کو اس لڑکی کے ساتھ نیم برہنہ حالت میں پکڑ لیا تھا! بعد میں سلیم اپنے سسر کے رسوخ کی وجہ سے اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ ایک اسمگلر نہیں بلکہ ایک اوباش امیرزادہ ہے!!! اور غنی اس کا ہم راز ہم نوا ہے!!

انسپکٹر خان کو اس بات کے لیے تعجب تھا کہ سلیم کے کردار کے بارے میں کیس سے جڑے لوگوں یا شک کے دائرے میں نظر آ رہے لوگوں کی متضاد رائے ہے یعنی ایک اگر اس کے کردار کو چاندنی کا اُجلا پن سمجھ رہا ہے تو دوسرا اس کے وجود کو ایک ڈراؤنی رات کی تاریکی بتا رہا ہے! بقول پرنسپل کول سلیم ایک خوش مزاج، پڑھا لکھا، مہذب اور فنونِ لطیفہ سے جنون کی حد تک پیار کرنے والا ایک ایسا شوہر ہے جو شاہجہاں اور ممتاز محل کے والہانہ محبت کی داستان دُہراتا ہے! پرنسپل کول اور اُس کی بیوی یہ ہرگز ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سلیم نے خود یا غنی سے سلمیٰ کو قتل کروایا ہے لیکن وہ اس بات سے انکار نہیں کر رہے ہیں کہ پچھلے دو تین مہینوں سے نئے نئے طرز کی خوبصورت پوشاکیں پہننے والا تر و تازہ رہنے والا، رومانی نغمے گنگنانے والا شخص اپنے میلے کچیلے لباس، لمبے بال اور لمبی داڑھی میں یوں نظر آنے لگا تھا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو! وہ عجیب حرکتیں بھی کیا کرتا تھا! یعنی کبھی گھنٹوں جھیل کے کنارے پر بیٹھ کر آتی جاتی لہروں کو دیکھ کر بڑبڑایا کرتا تھا! کبھی سادھو سنتوں کے پاس جایا کرتا تھا، کبھی نجومیوں کے پاس جایا کرتا تھا اور کبھی ادویات بیچنے والوں کی دوکانوں میں گھس کر ان سے بے تکے سوالات پوچھتا رہتا تھا! بلکہ اس منحوس دن بھی اس کو پرنسپل کول نے ایک کیمسٹ کی دُکان کے سامنے ایک بت کی طرح کھڑا پا کر

زبردستی گھر لایا تھا! اور یوں سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بدلی بدلی کیفیت آپ کی ترجمانی کر رہی تھی یا ایک مکار کی بناوٹ عیاں کر رہی تھی!

ڈاکٹر ریحانہ نے انسپکٹر خان کو ضمناً یہ بتا دیا تھا کہ اس نے سلیم کو بہت ہی قریب سے اُن دِنوں دیکھا تھا جب وہ اس کے گاؤں کی ڈسپنسری کی انچارج تھی! بقول اس کے سلیم ایک بھٹکا ہوا نوجوان تھا جو اپنی بیوی ثریا کی اذیت ناک حرکتوں کی وجہ سے بہک کر، خوبصورت لڑکیوں کا سہارا لے کر، اپنی اَن دیکھی اور بے شکل کی منزل تلاش میں ایک دانشور اور حساس انسان کا وجود کھو بیٹھا تھا! دراصل سلیم بقول ڈاکٹر ریحانہ ایک جنونی اس لیے بن گیا تھا کیونکہ اس کو ہر چہرے میں ایک ایسی عورت نظر آتی تھی جو اُس کے خیالوں کی ملکہ تھی! وہ بدکم اور بدنام زیادہ تھا! اس کی ہر کارکردگی میں ارادہ کم اور بوکھلاہٹ زیادہ ہوا کرتی تھی! ایک غنی ہی تھا جو اس کی کیفیت بھانپ سکتا تھا مگر وہ گھر کا نوکر بھی تھا اس لیے وہ جہاں ثریا کا ہر حکم بجالانے والا غلام تھا وہاں وہ سلیم کا فرمانبردار دوست بھی تھا! غنی یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ سلیم ڈاکٹر ریحانہ کو لالچ کی بیڑیاں ڈال کر یا شادی کا جھانسہ دے کر اپنی ہوس کا نشانہ نہیں بنا رہا ہے بلکہ ایک پڑھی لکھی خاتون کے ساتھ چند لمحے گذار کر اپنی اس گھٹن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہتا تھا! وہ گھٹن جو اس کو اپنے دل کے کرب اور ثریا کے قرب کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھی! لیکن تب جوں ہی ثریا کو ان دونوں کی گہری دوستی کے بارے میں جانکاری ملی تھی وہ ایک خونخوار وحشی درندے کی طرح ڈاکٹر ریحانہ پر ٹوٹ پڑی تھی، ایک تو اُس کو گاؤں والوں کے سامنے اس کو بے عزت کیا تھا اور پھر اپنے باپ کے رسوخ سے اس کو تبدیل بھی کروادیا تھا!

تحقیقات کے حوالے سے انسپکٹر خان کو یہ جانکاری ملی تھی کہ اُس حادثے کے بعد سلیم نے گھر جانا چھوڑ دیا تھا! وہ دن بھر جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا اور راتیں اپنے جنگل والی ہٹ میں گزارا کرتا تھا! دراصل اس کا سسر ان جنگلات کا ٹھیکیدار ہے! حالانکہ وہ اپنے داماد و بھتیجے کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو رویا کرتا تھا مگر وہ اپنی اکلوتی اولاد کی ضد کے سامنے بے بس ہوا کرتا تھا! پھر ایک برفیلے طوفان میں ایک شام سلیم کو غنی سے بچھڑ کر ایک فارسٹ ہٹ میں پناہ لینی پڑی تھی! اور وہاں سلمیٰ کو پہلی نظر میں دیکھ کر اُس کو یوں لگا تھا کہ وہ چراغ جو اُس کی تاریک زندگی کو روشن کر سکتا ہے وہ اس کے سامنے ہے، سامنے ہے! سلمیٰ کے باپ کو مٹکا بجانے میں مہارت

حاصل تھی جبکہ سلمیٰ کے گائے ہوئے لوک گیتوں میں پیار کا رس تھا! آواز میں محبت کی مٹھاس تھی اور اُس کی اداؤں میں بھولے پن اور اپنائیت کا احساس تھا! مٹکا بجانے کے سیکھنے کی آڑ میں وہ روز سلمیٰ کے باپ سے ملتا رہا اور چونکہ بن ماں کی بیٹی کو مہمان نوازی کے لیے بار بار سامنے آنا پڑتا تھا اس لیے مٹکے کی تھاپ پر دونوں کا دل ایک ساتھ دھڑکتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ دل کی باتیں زبان پر آ گئی تھیں! زندگی میں پہلی بار سلیم کو ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگانے کے بجائے اُس کو اپنی شریکِ حیات بنانے کا خیال آیا تھا! دِقت یہ تھی کہ سلمیٰ اس سے تقریباً دس سال چھوٹی تھی مگر دونوں کے والہانہ پیار نے ایسے اور کئی موضوعات پر سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا! ثریا کو جب دونوں کی ہونے والی شادی کے بارے میں جانکاری ملی تھی تب اس نے فارسٹ گارڈ کو اپنے گھر بلا کر نہ صرف ڈرایا اور دھمکایا تھا بلکہ خود اپنے ہاتھوں میں گھوڑے کا چابک لے کر اس کو خوب پیٹا تھا! ثریا کو اطلاع دینے والا غنی ہی تھا اس لیے ثریا نے اس کو معاف کر دیا تھا!

غنی بھی ایک انوکھا کردار ہے، ایسا کردار جو ایک بیان دے کر خود مشکوک کرداروں کے دائرے سے اچھل کر باہر نکل جاتا ہے اور پھر دوسرا بیان دے کر شک کے دائرے میں تنہا نظر آتا ہے! جبھی تو انسپکٹر خان کو غنی کے متضاد بیانات میں گُمراہ کُن زاویے نظر آ رہے تھے! غنی کی کہانی بھی ایک عجیب داستان ہے! اس کا باپ ٹھیکیدار کا باورچی تھا، وہ جب مر گیا تھا تب وہ ایک سال کا تھا! ماں مر گئی تو وہ نو سال کا تھا! اس کے بعد ٹھیکیدار کے داماد یعنی ثریا کے پہلے شوہر اور سلیم کے بڑے بھائی ناصر نے اس کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی! گاؤں کے چند شر پسند لوگ جب غنی کو مرحوم ناصر بیگ کی ناجائز اولاد بتا کر اُکساتے رہتے ہیں تب وہ گھر کے ایک فرمانبردار نوکر سے ایک باغی بن جاتا ہے اور اوٹ پٹانگ بلکہ خطرناک حرکتیں بھی کرتا ہے! مگر ثریا کا سامنا کرنے سے پہلے ہی وہ اپنی محسن کے سامنے ہتھیار ڈال کر وہی کرتا رہتا ہے جو ثریا چاہتی ہو! گھر کے سبھی بلکہ افراد نوکر چاکر بھی جانتے ہیں کہ ثریا کے حکم پر غنی کسی کی بھی جان لے سکتا ہے! دراصل ثریا غنی سے تقریباً دس سال عمر میں بڑی ہے اور اس نے ہمیشہ اس کو اور سلیم دونوں کو بڑی بہن اور ماں کا پیار دیا ہے! حالانکہ وہ دونوں کی لڑکپن میں خوب پٹائی بھی کرتی تھی بلکہ دبوچ لیتی تھی! مگر ایک حادثے میں جب ناصر کی موت ہوئی تھی تب ٹھیکیدار نے اپنی لاکھوں کی جائداد کی حفاظت کے لیے ثریا کی شادی سلیم سے کروادی تھی جبکہ وہ بھی ثریا سے دس سال چھوٹا تھا! سلیم کی عمر تب مشکل اُنیس برس تھی اور وہ شہر میں

قانون کی پڑھائی کر رہا تھا!

سلیم کے لیے یہ شادی ایک المناک حادثے سے کم نہ تھی! اس کے بعد ہی ایک سیدھا سادہ انسان مر گیا تھا اور ایک عیاش اور اوباش پیدا ہو گیا تھا، شاید غنی اس کے سوزِ نہاں کو سمجھ رہا تھا اس لیے ہر قدم پر اس کا ساتھ تو دیتا تھا مگر ثریا سے بے وفائی نہیں کرتا تھا! جو سلیم کرتا رہتا تھا وہ ثریا کو حرف بحرف سُنا دیا کرتا تھا!

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ سلمیٰ کو نیند کی گولیوں نے ابدی نیند سلا دیا ہے! مگر وہ کون ہے، جس نے ایک معصوم کلی کو کھلنے سے پہلے مرجھا دیا ہے؟

غنی کو پولیس نے اپنے گاؤں میں ثریا کے کمرے سے کھوج کر نکالا تھا اور اس نے یہ قبول کیا تھا کہ اس منحوس رات وہ سلیم کے کہنے پر ہی وہاں رُک گیا تھا اور سلیم کے ہی ایک اہم کام کے سلسلے میں وہ وہاں سے سحر کے وقت اس لیے نکل پڑا تھا کیونکہ وہ پہلی بس میں گاؤں جانا چاہتا تھا! کیا اس کے جانے کے بعد کوئی گھر میں گھس کر پھر کھسک گیا ہوگا یا گھر میں سلمیٰ، سلیم اور غنی کے علاوہ گھر میں کوئی اور بھی تھا جو اپنا کام کر کے آسانی سے نکل چکا ہو؟ اگر ایسا ہوتا تو قتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ گھر میں نہ کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل یا ہٹ گئی تھی اور نہ بغیر تالے کے کپ بورڈ میں پڑی رقم یا رکھے زیورات کو چُرایا گیا تھا، یعنی قاتل فقط سلمیٰ کو ختم کرنے آیا تھا اور وہ یہ کام کر گیا تھا! اگر غنی کے بیان پر یقین کیا جائے تو سلیم بذاتِ خود شک کے دائرے میں نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے!!

اپنی ہی بنائی ہوئی تحقیقی رپورٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے تحریروں سے اُبھرتی ہوئی تصویریں اور ان تصویروں میں چُھپے قاتل کے چہرے کے دُھندلے دُھندلے نقوش اس کے سامنے دھویں کی لکیروں کی طرح نظر بھی آتے رہے اور غائب بھی ہوتے رہے! شروع شروع میں من چاہی روانی سے چل رہی تحقیقات اچانک تھم سی گئی ہے! ایک تو اس لیے کہ سلیم کا بیان قلم بند یا ٹیپ رکارڈ نہیں ہو پا رہا ہے اور اس لیے بھی کہ سلمیٰ کا باپ جو حادثے سے چند دن پہلے اپنی بیٹی کا خط پا کر اس کی تلاش میں شہر آیا ہوا ہے وہ غنی کے بتائے ہوئے سراغ یعنی کسی بھی مسجد یا زیارت گاہ میں مل نہیں رہا ہے! حالانکہ غنی نے وثوق سے بتایا تھا کہ سلمیٰ لکھ پڑھ نہیں سکتی ہے مگر پرنسل کول نے سلمیٰ کی قابلیت اور صلاحیتوں کے بارے میں قصیدے باندھ کر یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے صرف دو مہینے میں اُردو میں چند آسان جملے لکھنے سیکھے تھے! باپ کی مرضی بلکہ معلومات دیئے بغیر بھی ایک

بہت ہی غریب کی بیٹی نے ایک بہت ہی امیر آدمی کے ساتھ بھاگ کر تقریباً آٹھ ماہ بعد اپنے باپ کو خط میں کیا لکھا ہوگا یہ جاننے کے لیے انسپکٹر خان بے چین ہے! وہ خط کے بارے میں سوچ رہا تھا جب ٹیلی فوج کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا! سلیم کے کمرے کے باہر ڈیوٹی دینے والے سپاہی نے یہ اطلاع دی کہ سلیم کچھ بڑ بڑا رہا تھا اور ڈاکٹر ریحانہ غور سے اس کے الفاظ کو سن کر دُہرا دُہرا کر صحیح لفظ کی تصدیق کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے تک سلیم کی باتیں سن رہی تھی! اور پھر سلیم چُپ ہو گیا ہے! جبکہ ڈاکٹر ریحانہ بے ساختہ رو پڑی ہے! یہ ایک اہم اطلاع تھی اور انسپکٹر ایک گیند کی طرح اُچھل پڑا ہے!

اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر ہسپتال چلا جاتا کسی دوسرے تھانے کا سپاہی سلمٰی کے باپ کو کمرے میں لے آیا ہے! پوچھ تاچھ کی بجائے اس نے سلمٰی کے خط کو پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن ٹوٹی پھوٹی زبان میں لکھے آدھے ادھورے جملوں کا مفہوم نہ سمجھ کر وہ ہسپتال کے لیے نکل پڑا، لیکن راستے میں وہ پرنسپل کول سے بھی ملا ہے! کول صاحب سلمٰی کی لکھائی اور جملوں کی بناوٹ سے آشنا ہے اس لیے اس نے خط فوراً پڑھ کر انسپکٹر خان کو خط کا مفہوم یوں سمجھایا کہ سلمٰی کو تین مہینوں میں احساسِ نظرِ ثانی کے ساتھ ساتھ یقین ہو گیا ہے کہ سلیم اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے! وہ دن کو جانے کہاں جاتا ہے لیکن شام کو گھر لوٹ کر تو آتا ہے مگر نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے! نیند کی چند گولیاں کھانے سے پہلے وہ دیوار پر آویزاں کلینڈر کو یوں دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ کسی ڈراؤنے چہرے کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر دبی آواز میں بڑبڑاتا رہتا ہے! مجھے طلاق دے کر میری دوسری شادی کروانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے؟ اور اس کے عوض اپنی ساری جائیداد میرے نام کرنے کا وعدہ کر رہا ہے؟ مجھے لگ رہا ہے وہ مجھ سے اوب گیا ہے اور کسی اور کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے! آج کل وہ مجھے غنی سے شادی کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے! ابا میں سلیم کے بغیر زندہ رہ نہیں سکتی! مجھے اپنے پاس بلوا لو ورنہ میں سلیم کے آغوش میں نیند کی گولیوں کی پوری شیشی کھا کر، ایک گہری نیند میں سکون لینے کے لیے مجبور ہو جاؤں گی کیونکہ میں سلیم سے جدا ہونے کا منظر نہیں دیکھ پاؤں گی! میں سلیم سے بہت پیار کرتی ہوں!

خط کا مفہوم سمجھ کر انسپکٹر خان خط کی سطور کو دیکھتا رہا! خط کو فائل میں رکھ کر انسپکٹر خان کا شک یقین میں بدل گیا ہے کہ ڈاکٹر ریحانہ نے ایک منصوبے کے تحت سلیم کو اپنی حفاظت میں اس لیے

رکھا ہے! کیونکہ وہ جان گئی ہے سلیم جو خود بھی نیند کی گولیاں کھاتا رہتا ہے، بوکھلاہٹ میں سلمیٰ کو بہت زیادہ گولیاں کھلا کر اس کو ابدی نیند سلا گیا ہے! ظاہر ہے کہ ریحانہ کا کردار مشکوک نظر آنے لگا ہے، غصّے، تشویش اور تجسّس کے ملے جلے تاثرات لے کر جب وہ ہسپتال پہنچا تب ڈاکٹر ریحانہ اپنے کمرے میں سلیم کی میڈیکل فائل مکمل کرتے ہوئے سسک سسک کر اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی!

اس سے پہلے کہ انسپکٹر خان سوالات کی بوچھار کر کے پہلی بار اس پر شک کی انگلی اٹھاتا ڈاکٹر ریحانہ نے اپنے جذبات پر قابو پا کر سلیم کی آخری خواہش کو پورا کرنے کی خاطر یہ کہا کہ ثریا اور اس کے باپ کو فوراً بلایا جائے اور غنی کو بھی پولیس کی حراست سے آزاد کر کے ہسپتال لایا جائے!

انسپکٹر کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر ریحانہ نے دَبے دَبے الفاظ میں اس کو بتا دیا کہ سلیم نے ہمیشہ کے لیے اپنے ہونٹ سی لینے سے پہلے یہ پُوچھا تھا کہ کیا غنی گاؤں سے لوٹ آیا ہے؟

دراصل انسپکٹر خان کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ سُلیم نے ریحانہ سے لرزتے ہوئے بہت کم الفاظ میں بہت کچھ کہا تھا اور یہ چند جملے ایک دردناک داستان بیان کر چکے ہیں! بقول سلیم اس نے ہی سحر کے وقت غنی کو گاؤں بھیجا تھا تاکہ وہ ثریا اور اس کے سسر کو شہر سے آئے تاکہ وہ سلمیٰ کو ان کے سپرد کر سکے! غنی کے جانے کے بعد اس نے نیند کی گولیاں کھا کر اپنے آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا کیونکہ وہ سلمیٰ کا کرب اپنے درد سے زیادہ اذیت ناک محسوس کر رہا تھا، اس نے نیند کی گولیوں کو بوتل سے نکال کر اپنے سرہانے کے نیچے چھپا رکھا تھا مگر سلمیٰ سلیم کی حرکتوں کا نہایت باریک بینی اور اضطراب میں جائزہ لیتی رہتی تھی اس لیے اس نے اپنے شوہر کی کیفیت بھانپ کر ساری کی ساری گولیاں چپکے چپکے کھالی تھیں! پھر جب غنی کے جانے کے بعد جب سلیم نے سرہانا ہٹاتے ہی بوتل میں نیند کی ایک گولی بھی نہیں دیکھی تھی تب سلمیٰ کو ابدی نیند سوتے ہوئے پایا تھا! اس نے فون کیا تھا مگر جذبات کی شدت اور بیماری کے آخری حملے کی زد میں آکر وہ گر گیا تھا! اس کے بعد اس کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوا؟ بلکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اپنے کمرے کے فرش پر پڑی ہے اور سلمیٰ کی پلنگ پر پڑی ہے! یعنی وہ ICU میں ہے اور اس کو یہ معلوم نہیں ہے۔ یہ کہہ کر کہ ایک اُچھلتا، پتھروں کو چھو کر مسرت سے شور کرنے والا ایک جھرنا ایک پُرسکون جھیل کے آغوش میں چلا گیا تھا مگر بدبختی کی انتہا دیکھیے جھیل بھی سُوکھ گئی اور جھرنا بھی! ڈاکٹر ریحانہ کی باتوں پر انسپکٹر خان شاید

یقین نہیں کرتا اگر وہ سلیم کے ذہنی تناؤ کی وجہ نہیں جان پاتا!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایڈس AIDS کی بیماری ایڈس کے بیمار کو چھونے سے بھی ہوتی ہے تب غنی کو سلیم نے اپنی بیماری کی علامات کے بارے میں کہا تھا! پھر سلیم جب ڈاکٹر ریحانہ کے ساتھ دہلی میڈیکل چیک اپ کے لیے گیا تھا تب اس نے موت کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی اسی لیے وہ اپنے آپ سے ڈر رہا تھا! سلیم سلمیٰ سے اتنا ہی پیار کرتا تھا جتنا سلمیٰ اپنے شوہر سے کر رہی تھی! سلیم اپنی بیوی کو بیماری دے کر اُس کی زندگی کے سفر کو اچانک ختم ہونے کے تصور سے خوفزدہ تھا! جبکہ سلمیٰ سلیم کے ذہنی تناؤ کو خود سے جوڑ کر اپنے آپ سے گھبرا کر فرار ہونا چاہتی تھی! اس سے پہلے کہ سلیم اُس کو غنی کے حوالے کر دیتا! سلمیٰ اور سلیم دونوں ذہنی و جسمانی کرب سے آزاد ہو چکے ہیں! مگر انسپکٹر خان غنی کے کرب کے بارے میں سوچ رہا ہے! تحقیقات کے دوران وہ غنی کو پاگل، جھوٹا، مکّار، عیّار، بدمعاش اور سلمیٰ کا قاتل کیوں سمجھ رہا تھا......؟

اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ غنی کے کرب کو محسوس کرتے کرتے کراہنے لگا!
ڈاکٹر ریحانہ کی طرح!

OO

وراثت

اِس سانحے کا واحد چشم دید گواہ رام دین ہے! وہ بھی اس لیے کہ وہ اُس گیسٹ ہاؤس کا چوکیدار ہے جہاں مرحوم سیاح نریش کمار پچھلے ایک مہینے سے رہتا تھا اور آخری بار بھی اُس کو وہاں دیکھا گیا تھا!

رام دین کے بیان کے مطابق، تقریباً تیس برس کا خوبرو نوجوان اپنے قیام کے دوران اپنے کمرے میں رہا کرتا تھا! اور اکثر شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے یا تو لکھتا رہتا تھا یا پھر بڑبڑاتا رہتا تھا! رام دین کے علاوہ نہ کوئی کمرے میں داخل ہوتا تھا اور نہ وہ کسی سے ملنے کی خاطر کمرے میں باہر آجایا کرتا تھا! مگر اُس روز جب وہ دیوی ماں کو، گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر دیکھنے آیا تھا وہ اُن کے قہقہوں کا تعاقب کرتے ہوئے، اچانک چوکیدار کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا! اور پھر ایک گہری کھائی میں اُس کی لاش مِل گئی تھی!

رام دین سیاح کی موت کو، دیوی ماں کے قہقہوں کا قہرمان کر یہ اپنی عقیدت کے بل بوتے پر شہر والوں کو دیوی ماں کے ہنسنے یا رونے کی وجہ سے ہوچکے بے شمار واقعات کے حوالے دے کر یہ اُمید پال رہا ہے کہ اگر لاش کو پوسٹ مارٹ کے لیے بھیجنے کی بجائے اپنے کمرے میں رکھا جائے تو شاید دیوی ماں اُس کو دیکھ کر رو پڑے اور سیاح ایک گیند کی طرح اُچھل پڑے یعنی زندہ ہوجائے!

تحقیق کرنے والا پولیس انسپکٹر اٹل بہاری دیوی ماں کے کرشمات کے بارے میں شہر والوں سے بیشتر کہانیاں سُن لینے کے باوجود یہ جان لینے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ المیہ دراصل کیا ہے؟ ایک حادثہ؟ خودکشی یا قتل؟؟

یہ دیکھ سُن کر کہ شہر کے بیشتر لوگ بھی، اُس کی تحقیقی رپورٹ پر یقین کرنے کی بجائے رام دین کی اُمید کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں اس لیے اس کے عمل میں خدشات کی رُکاوٹیں آرہی ہیں! کروٹیں بدل بدل کر حالات ایسے بنتے جارہے ہیں کہ وہ خود اعتمادی کی ٹھوس سیڑھی سے اُتر کر

اعتقاد کے دھاگوں کو پکڑنے لگتا ہے! اور جب بھی اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب وہ اپنی ہی مکمل کی گئی تحقیقاتی رپورٹ کی ورق گردانی کرتا رہتا ہے، بلکہ اپنی لکھی ہوئی سطور کے درمیان نظر آ رہے دھندلے خاکوں کو جھانک جھانک کر، دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کبھی تجسس کی تاریک غار میں داخل ہو جاتا ہے اور کبھی تذبذب کے گرداب میں پھنس جاتا ہے......!

کل تک وہ شہر سے دور فارسٹ ہاؤس میں رہنے والے نوجوان سیاح کی دردناک موت کو ایک بھیانک حادثہ سمجھ رہا تھا مگر آج صبح اس کے گھر آئے ہوئے ایک سنیاسی کی باتیں سُن کر اور گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار رام دین کے چہرے پر سنسنی خیز تاثرات دیکھ کر وہ اپنے ہی اخبارات ٹی.وی پر مرحوم سیاح کے وارثوں کو لاش لے جانے کے فیصلے سے خود خوفزدہ ہو رہا ہے! وہ اس لیے کہ بدل چکے حالات کے باوجود اسپتال والوں کی اطلاع کے مطابق، لاش لینے والے، درجن بھر گاڑیاں لے کر، چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے علی الصباح پہنچ بھی گئے ہیں!

اپنی تحقیقاتی فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے جب بھی اُس کاغذ کے ورق کو دیکھ لیتا ہے جو مرحوم کے کمرے سے بہت سارے کرنسی کے نوٹوں کے ساتھ برآمد ہوا تھا، تب اس کو یوں محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے تحریر پہلے اُبھر کر تصویریں بن کر سامنے آ جاتی ہے! پھر ہر تصویر یوں بولتی رہتی ہے جیسے وہ ملزم کی فریاد وکیل کی دلیل اور جج کا فیصلہ تینوں کی ترجمانی کر رہی ہو! جب وہ یہ ورق الٹ دیتا ہے تب اس کے کانوں میں رام دین کی باتیں گونج اُٹھتی ہیں: ''تھانے دار صاحب یہ ایک حادثہ نہیں ہے! کچھ اور ہے! جو کہانی دیوی ماں کے قہقہوں سے شروع ہوئی تھی آج دیوی ماں کے بہائے آنسوؤں سے ختم ہو جائے گی!''

بقول رام دین دیوی ماں رات بھر گیسٹ ہاؤس کے اِرد گرد چکر لگاتے ہوئے یوں رو رہی تھی جیسے نوحہ خوانی کر رہی ہو! اس لیے اس کو یقین تھا کہ سیاح مر کر بھی زندہ ہو جائے گا! بے چارے کو یہ غلط فہمی تھی کہ آدھ مرے سیاح کو آپریشن کے لیے اسپتال لایا گیا تھا اور وہ اچھے نتیجے کی اُمید پر بے حد خوش نظر آ رہا تھا! جبکہ سنیاسی کو معلوم تھا کہ مرحوم نریش کمار دھرتی ماں کی گود سے اُٹھ کر بھگوان کی گود میں بیٹھ چکا ہے اور وہ بھی اپنی مرضی سے! یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کیونکہ سنیاسی بھی ایک عجیب کردار ہے! شکل صورت سے وہ بمشکل پچاس برس کا لگ رہا ہے مگر وہ باتیں یوں کرتا ہے جیسے وہ کسی دھارمک فلم کا سو سال سے تپسیا کرنے والا ایک رِشی ہو! ہاں مگر ایک تو اس کی آنکھیں ایک سُوکھی جھیل کی مانند نظر آ رہی ہے اور وہ جب بھی بولتا ہے تب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

سامنے بیٹھے آدمی کی آواز نہیں ہے! بلکہ ایک گہرے کنویں میں ڈبکیاں لگانے والے ایک مدد کے طلب گار کی آواز ہے!! مگر انوکھی بات یہ ہے کہ وہ انسپکٹر اٹل بہاری کے، بغیر پوچھے گئے اُن سوالات کے جوابات دے رہا ہے جو وہ پوچھ تو نہیں رہا ہے ہاں مگر اس کے شک کے دائرے میں اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں!...... بار بار......!!

انسپکٹر اٹل بہاری کی لمبی پولیس سروس میں یہ پہلا کیس ہے جو سلجھتے سلجھتے اس قدر اُلجھ گیا ہے کہ اس کو اپنی ہی لکھی ہوئی تحقیقی رپورٹ کی بار بار ورق گردانی کرنی پڑ رہی ہے کیونکہ ہر بار اس کو اپنی ہی لکھی ہوئی سطور کے درمیان چند سوالیہ نشان نظر آ رہے ہیں! حالانکہ ہر سوال کا جواب تحقیقی رپورٹ میں مل تو رہا ہے مگر جواب بذاتِ خود ایک سوال بن کر اس کے اعتماد کو ہلا کر رکھ دیتا ہے! اور یوں اعتقاد اس کے عمل پر حاوی ہوتا جا رہا ہے!!

دراصل یہ کیفیت لوگوں کے اندھے اعتقاد کی وجہ سے اس پر طاری ہو جاتی ہے مگر جانے کیوں اس کو اندھیرے میں کچھ دکھائی دے رہا ہے! جو بھی اس پرانے شہر کے انوکھے لوگ اس کیس کے بارے میں کہہ رہے ہیں کیا وہ اکیسویں صدی میں ممکن ہے؟ اگر ایک اجنبی نوجوان سیاح کی دردناک موت ایک بھیانک حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے تو کیا یہ قتل یا خودکشی کا ایک المیہ ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں رات بھر سوچتے سوچتے اس کو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی دیواروں سے جھانک کر اس کی کیفیت بھانپ کر کبھی ہنس رہا ہو اور کبھی رو رہا ہو! اپنے ہوش و حواس پر قابو پا کر جب بھی وہ امکانات کے بارے میں ازسرِ نو سوچتا رہتا ہے تو ہر بار یہی خیال آتا ہے کہ اگر یہ قتل کا کیس ہوتا تو قاتل مقتول کے جیب سے پچاس پچاس ہزار روپے کے دونوں بنڈل لے گیا ہوتا اور پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس طرف اشارہ کرتی! خودکشی کا کیس ہوتا تو، وہ شخص، جو بقول چوکیدار رام دین، اپنی ہر بات کو پہلے لکھنے اور پھر بولنے کا عادی ہوا کرتا تھا! وہ اپنے ارادوں کا اشارہ تو دیتا! خودکشی کا نوٹ جیب میں رکھ دیتا، نہ کہ ایک کاغذ کا ورق جس پر لکھی تحریر ایک تصویر کی عکاسی تو کرسکتی ہے لیکن وہ تصویر کیا تصور کا عکس ہوسکتا ہے؟ ایک سراغ کی نشاندہی نہیں ہوسکتی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ تو ثابت ہوچکا ہے کہ مرحوم سیاح نریش کمار نے بہت زیادہ شراب پی لی تھی اس لیے برف سے ڈھکی، جنگل کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے پھسل کر گہری کھائی میں گر کر، موت کے امکانات حقیقت کے زیادہ قریب نظر آ رہے تھے مگر رام دین کے بیان نے نہ صرف شہر کے بیشتر گھروں میں ایک سنسنی پھیلا دی ہے بلکہ انسپکٹر اٹل بہاری کی

سوچ و سمجھ میں انتشار پیدا کر دیا ہے!

رام دین بلک بلک کر، چلاّ چلاّ کر کہتا رہتا ہے: اس شہر میں رہنے والو! کوئی مانے یا نہ مانے تم تو میری بات کا یقین کر لو! یہ سچ ہے کہ وہ صبح سے گئی رات تک شراب پیتا رہتا تھا مگر وہ تقریباً تیس دن سے گیسٹ ہاؤس میں رہ کر نہ کبھی بہک گیا تھا اور نہ کبھی بھڑک کر بھٹک گیا تھا بلکہ وہ کثرتِ مئے نوشی کے بعد کبھی وہ ڈگمگا کر نہیں چلا کرتا تھا! اس کی گُفتار یا لکھنے میں بھی لرزش نہیں ہوا کرتی تھی! پھسل کر گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! جو ہوا کسی غیبی طاقت کی وجہ سے ہوا ہے! میں نے خود دیوی ماں کے زوردار قہقہے سُن لیے تھے! اور نہیں تو کیا؟؟

رام دین چونکہ پی کر دیوانہ بن جاتا ہے اس لیے انسپکٹر اٹل اس کے بیان کو شاید دیوانگی کا رنگ دے کر قلم بند ہی نہیں کر رہا ہے مگر شہر کے بیشتر لوگ اس کی ایک ایک بات کو سنجیدگی سے سن کر اپنے دل و دماغ میں بٹھا کر، عقیدی سوچ سے منطقی سوچ کو رَد کرتے ہوئے مرحوم نریش کو دیوی ماں کے قہر، یعنی اُس کے قہقہوں کے غیبی زہر کا وہ اثر سمجھ رہے ہیں جو اکثر ایسی آفتوں کو عیاں کر رہے ہیں! شہر میں وقتاً فوقتاً ہو چکی ایسی بے شمار مثالیں سوچ کو یقین میں بدل رہی ہیں! اور یوں ایک شیشے کی طرح صاف پولیس کیس بدل بدل ایک معمّہ بن گیا ہے!

فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے رات تو کٹ گئی تھی مگر صبح سویرے جبکہ وہ تمام قیاس آرائیوں و اندیشوں اور خدشات کو اپنی یعنی ایک قابل پولیس افسر کی حقیقت پر مبنی تحقیقات رپورٹ سے دُور رکھ کر لاش کی سپردگی کے لیے اسپتال جانے والا تھا تب رام دین کی خوشی اور ایک اجنبی سنیاسی کے انکشاف نے انسپکٹر اٹل کو ایک بار پھر فائل کی ورق گردانی پر مجبور کر دیا ہے! ایک سوال اُبھر کر جو اُس کے ذہن پر ہتھوڑے مارتا جا رہا ہے کہ لاش وارثوں کے سپرد کی جائے یا پھر کیس کی ازسرِ نو تحقیق کی جائے! وہ بھی یہ جاننے کے لیے کہ یہ خودکشی ہے یا قتل؟

کیا یہ دیوی ماں کا قہر بھی ہو سکتا ہے......؟ انسپکٹر اٹل تذبذب کے دباؤ میں کچھ طے نہیں کر پا رہا ہے!

رام دین کے قلم بند کیے گئے بیان کے مطابق جس دن یہ منحوس واردات ہوئی نریش رات بھر جاگتا رہا اور پیتا رہا! کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور کب کھل گئی تھی یہ رام دین کو معلوم نہ تھا! کیا پہلے بھی کبھی نریش کمار نے دیوی ماں کو دیکھا تھا!؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا مگر صبح سویرے جب اس نے کسی کے چلاّنے کی آواز سن لی تھی تب اس نے دیوی ماں کو گیسٹ ہاؤس کے دروازے کے ساتھ

چیک کر چیختے چلاتے دیکھا تھا! اپنے مخصوص انداز میں وہ عجیب حرکتیں کرتی ہوئی سِسک رہی تھی! وہ برف باری سے بھیگ گئی تھی اور اس کا نیم عریاں بدن ٹھٹھر رہا تھا! اس منظر کو دیوی ماں کے درشن سمجھنے والا چوکیدار دیوی ماں کے بلک بلک کر رونے کو ایک اچھا شگون سمجھ کر بے حد خوش تھا جبکہ نریش کمار نے دیوی ماں کے ٹھٹھر رہے بدن کو نہ صرف اپنے قیمتی توشہ کے شال سے ڈھک لیا تھا بلکہ اس کو اپنے سینے سے لگا کر، اپنے کمرے کے اندر لے گیا تھا! پھر آتش دان کی سہانی آنچ محسوس کرتے ہوئے وہ پہلے مسکرائی تھی پھر قہقہے لگاتے ہوئے کمرے سے نکلتے ہی، تب وہ قلم پھینک کر اور کاغذ کا ورق جیب میں رکھ کر، دیوی ماں کے پیچھے دوڑتا رہا!

کمرے کے اندر اور پھر گیسٹ ہاؤس کے باہر کے مناظر رام دین دیکھ چکا تھا! شروعات میں دیوی ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ بے حد خوش تھا، لیکن بعد میں اُس کے قہقہوں کی ڈراؤنی گونج سے وہ خوفزدہ ہو کر لرز رہا تھا!

دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے اُس کو یوں لگا تھا گویا کسی غیبی طاقت نے نریش کمار کو ایک بچے کی طرح اُچھالا تھا، مگر بچہ نہ اُچھالنے والے کی بانہوں میں گِرا تھا اور نہ زمین پر گر پڑا تھا!

رام دین نے نریش کو بہت ڈھونڈا تھا مگر جب وہ کہیں نہیں ملا تھا تب جا کر اس نے پولیس والوں کو اس کے پُر اسرار طریقے سے غائب ہونے کی اطلاع دی تھی! اور جب انسپکٹر اٹل بہاری نے نریش کی لاش ایک گہری کھائی سے نکالی تھی تب رام دین یہ سمجھا تھا کہ وہ نیک دل سیاح جو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر انگریزی شراب پلایا کرتا تھا وہ دیوی ماں کے خفا ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہوگا! اور وہ چاہتا تھا کہ سیاح کو تب تک گیسٹ ہاؤس میں رکھا جائے جب تک دیوی ماں آس پاس کہیں نظر نہ آئے! اس کو یقین ہے کہ دیوی ماں معمول کی طرح جب چیختی چلاتی اور آنسو بہاتی ہوئی قریب آ جائے گی تب ایک کرشمہ ہوگا اور سیاح کو ہوش آ جائے گا!!

انسپکٹر اٹل بہاری اپنی تحقیق مکمل کر چکا ہے اس لیے وہ دیوی ماں کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سننا چاہتا ہے! اس لیے جب سنیاسی نے دیوی کے بارے میں کرید کی تو وہ بوکھلا گیا! شاید اس لیے کہ فقط اس عورت کی وجہ سے وہ بھی گاہے بگاہے ڈگمگا کر اپنا اعتماد کھو کر اعتقاد کے چشمے سے سارے کیس کو ایک نئے رنگ میں دیکھ کر اُس کے دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں منطقی، سوچ ہونے والے کرشمے میں رکاوٹ تو نہیں ڈال رہی ہے؟ غالباً اپنے ذہنی اضطراب پر قابو پانے کی خاطر اس نے دیوی ماں کی آ... کہانی... شہر کے انہی کچھ لوگوں کی کہانی یوں سنا دی جیسے

یہ احساس دلا کر پوچھ رہا ہو کہ کیا حکایتیں بھی سچی ہوتی ہیں؟! اور بار بار یہ بھی کہتا رہا کہ نہ جانے کیسے لوگ ہیں جو ایک نیم عریاں، میلی کچیلی، شکل وصورت سے بے حد حسین، سڑکوں پر، جنگل میں، ندی کنارے یا گھروں میں بلا روک ٹوک نمودار ہونے والی اور پھر اچانک نظروں سے اوجھل ہونے والی عورت کی عزّت بھی کرتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں! مانتے ہیں کہ وہ رو پڑے تو مرجھائے ہوئے چہرے بھی کِھل اُٹھتے ہیں اور جب وہ ہنس پڑے تو کِھلے پھول بھی جُھلستے ہوئے نظر آتے ہیں!

دراصل پچھلے کئی برسوں سے، دیوی ماں کے بے شمار کرشمات کے حوالوں سے جانے مانے اس پہاڑی شہر کی ایک دلچسپ کہانی ہے! کہانی کا حوالہ تواریخی تو نہیں ہے مگر عام لوگوں کی سُنی سنائی کہانی ہے! یوں کہا جاتا ہے کہ یہ خوبصورت چھوٹا شہر کسی زمانے میں ایک بہت بڑی جھیل ہوا کرتا تھا جس کے کناروں پر بے شمار کوڑھی رہا کرتے تھے! کہتے ہیں اس وقت دُور دُور تک آس پاس کوئی بستی، گاؤں یا شہر نہیں تھا! سیکڑوں کوس دُور ایک شہر میں ایک خدا دوست فقیر رہا کرتا تھا! وہ جہاں بھی عبادت کرنے جایا کرتا تھا لوگ اس کو سنگ سار کیا کرتے تھے! وجہ یہ کہ اس فنافی اللہ کے جسم پر پھوڑے تھے! پھوڑوں سے پیک نکلتی رہتی تھی اور پیک سے بدبو آیا کرتی تھی! لوگ اس کو بھگاتے رہتے تھے اور وہ ایک دن یہاں پہنچ گیا تھا! اس نے اپنے لوہے کے چمٹے سے پہاڑ میں ایک سُرنگ بنا ڈالی تھی! جھیل کا پانی بہہ کر نکل گیا تھا اور فقیر کی کرامات سے کوڑھی ٹھیک ہو گئے تھے!

یہاں کے باشندے چاہے وہ امیر ہوں یا غریب ہوں، پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ ہوں، مرد ہوں یا عورتیں ہوں، بچّے، بوڑھے اور جوان ہوں بیشتر کو یہ اعتقاد ہے کہ وہ فقیر آج بھی شہر میں موجود ہے اور رنگ رُوپ بدل کر نمودار ہوتا رہتا ہے! لوگوں کے اسی عقیدے کے مطابق دیوی ماں بھی اسی مسیحا کا ایک رُوپ ہے! دیوی ماں روتی ہے تو جو بھی اِردگرد جمع ہو جاتا ہے اُن کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں! مگر جب وہ ہنستی ہے تب قہر ٹوٹ پڑتا ہے! جبھی تو شہر کے بیشتر لوگ نوجوان سیاح نریش کمار کی دردناک موت کو دیوی ماں کے قہر سے پیدا ہوئی ایک ناگہانی آفت سمجھتے ہیں!...... بقول اُن کے، قہر اس لیے ٹوٹ پڑا کیونکہ نادان نوجوان کی بے قابو جوانی نے دیوی ماں کی بے حرمتی کی تھی! رام دین اپنے آپ کو کوس رہا ہے کیونکہ اُس نے نازیبا مناظر خود دیکھ لیے ہیں!

انسپکٹر اٹل بہاری کو جب دوسری ریاست سے آئے ہوئے لاش لینے والوں سے یہ پتا چلا کہ مرحوم نریش کمار ایک کروڑ پتی کا اِکلوتا بیٹا اور واحد وارث تھا! تب اس نے کاغذ کے ورق پر لکھی تحریر کو ایک بار پھر پڑھ لیا ہے! مگر اس بار اس کو لگا جیسے مرحوم نے اپنی زندگی کی تصویر عیاں بھی کی

ہے اور بیان بھی! ایک ایسی تصویر زندگی جس کے بارے میں انسپکٹر اٹل نے سوچا بھی نہ تھا بلکہ اس کو اپنی تحقیقی رپورٹ اس کاغذ کے بغیر یوں لگ رہی تھی جیسے چہرے کے بغیر کسی کی تصویر......!

کیس کروٹیں بدل بدل کر انسپکٹر اٹل بہاری کے دل میں ہلچل اور دماغ میں تناؤ پیدا کر رہا ہے!

سنیاسی کی ایک بات نے اس کو ذہنی طور پر بھی ہلا کر رکھ دیا ہے! تب جب وہ غور سے سنیاسی کے چہرے کے مفلوج تاثرات اور پتھر جیسی آنکھیں دیکھ کر اس کی دَبی دَبی آواز سُن رہا تھا تو کئی بار اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے جو سامنے نظر آ رہا ہے وہ تو نہیں بلکہ کوئی اور بول رہا ہے! بولنے کا انداز بھی ایسا کہ گویا ایک گہرے کنوئیں میں گِرا ہوا آدمی ڈوبتے ڈوبتے کچھ بول رہا ہو!

انسپکٹر اٹل بہاری اپنی تحقیقاتی فائل کھول، جیپ میں بیٹھے بیٹھے اسپتال جاتے جاتے سنیاسی کی باتیں یاد کرتا رہا اور بار بار کاغذ کا ورق پڑھتا رہا!

مرحوم نریش شاعر تھا یا نہیں یہ وہ نہیں جان پایا تھا مگر تحریر کی شکل ایک نثریہ نظم کی تھی:

رام دین!
تم ماں کی بات کرتے ہو
وہ ماں تو دیوی ماں ہے!
میری ماں بھی
دیوی ماں کی طرح
ٹھٹھر جایا کرتی تھی
اس کے تن پر بھی
کپڑے نہیں تھے نا!
وہ اگر دروپدی ہوتی نا
تو بھگوان کرشن خود
دھرتی پر جنم لے کر
اس کو بھری بزم میں
ننگا نہیں ہونے دیتا!
میری ماں
ایک چپراسی کی ماں تھی نا؟

مگر ایک کروڑ پتی کی
پاگل بیوی تو تھی نا؟!
اب کیوں دیکھ رہا ہے مجھے؟
میرے چہرے کو مت دیکھو
ایک کروڑ پتی کا ہم شکل ہوں!
میرے دل میں جھانک کر دیکھو
میری دل میں جھانک کر دیکھو
میری ماں کا عکس دیکھو
دیوی ماں کی ہم شکل ہے!!

اسپتال کے احاطے میں جو لوگ جمع تھے رام دین ان کو بتا رہا تھا کہ کیونکہ اس نے دیوی ماں کو گیسٹ ہاؤس میں روتے ہوئے دیکھا ہے اس لیے اُن کو یقین دلا رہا ہے کہ اگر نریش کمار کی لاش کو روک لی جائے تو وہ ہوش میں آ جائے! وہ اپنے آہنی یقین کو دیوی ماں کے آنسوؤں سے جوڑ رہا ہے!

اور اب سنیاسی بھی اس کی باتیں غور سے سُن رہا ہے جبکہ اس کے ساتھ آئے لوگ جب لاش کو ایک پیٹی میں لے جانے کا انتظام کرنے میں مشغول ہیں! تب ایک درمیانی عمر کے آدمی نے مشکلاً اپنے آنسوؤں کو روک کر انسپکٹر اٹل بہاری کو یہ اطلاع دی کہ نریش کی ماں کو بھی یہی بیماری تھی یعنی وہی لاعلاج ذہنی بیماری جو بیمار کو اپنے بس میں کر کے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے!

اس بیماری یعنی سی زوفرینہ (Schezophrenia) کے بارے میں انسپکٹر اٹل نے سنا تھا مگر اس کو بیمار کی کہانی نے زیادہ چونکا دیا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کی دھن میں دیکھی ایک تصویر سمجھنے لگا!

نریش کمار کے کروڑ پتی دادا کے بدصورت اِکلوتے بیٹے نے بیس سال کی عمر میں ایک آدی واسیوں کی بستی میں ایک سولہ سال کی پری چہرہ لڑکی کو دیکھتے ہی ویسے ہی شادی کی تھی جیسے راجہ دُشنت نے ون پری شکنتلا سے شادی کی تھی! لیکن وہ انگوٹھی دے کر دُشنت کی طرح اپنی حاملہ بیوی کو جنگلوں میں چھوڑ دینے کی بجائے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے تو گیا تھا مگر ہمیشہ ڈری ڈری سہمی سہمی بیوی کو جب شوہر نے اپنے نوکر کے ساتھ لپٹتے دیکھا تھا! تب بھڑک کر شوہر نے اپنی حاملہ بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا! بالکل ویسے ہی جیسے بھگوان رام نے سیتا کو اپنے محل سے نکال دیا تھا!

پھر برسوں بعد جب بیوی کی پاکیزگی کے بارے میں جانکاری ملی تھی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی!

ایک ذہنی مریضہ نریش کمار کو جنم دے کر دَر دَر کی ٹھوکریں کھا کر، عارضی طور پر صحت یاب ہوتی رہی مگر نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتی رہی! بیٹا جوان ہوتے ہی ایک دفتر میں چپراسی تھا! اور وہی اپنی ماں کا واحد سہارا تھا! بیٹا بیس برس کا تھا جبکہ ماں فقط سینتیس برس کی تھی! پھر اُسی آشرم میں جہاں نریش پیدا ہوا تھا، بیماری کے اثر میں چھت سے کُود کر بھاگ گئی تھی اور پھر کھو گئی تھی!۔!!

ماں کی کھوج میں اُس کو باپ مل گیا تھا، وہ اس لیے کہ وہ شکل وصورت سے اپنے باپ پر گیا تھا! باپ نے بیٹے کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے بعد خون کے تمام درکار ٹیسٹ کروا کر اُس کو اپنا لیا تھا! اور وہ یوں ایک کروڑ پتی کا اکلوتا وارث بن کر ماں کی تلاش کرتا رہا!

یہ کہانی سُنا کر جب اُس نے دُور سے قریب آ رہی دیوی ماں کو دیکھ لیا تب وہ گویا نوحہ خوانی کر رہی تھی! ایک سنیاسی ہونے کے باوجود وہ رو رہا تھا جبکہ رام دین کے علاوہ، اسپتال کے احاطے میں موجود بیشتر لوگ دیوی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوش تھے! گویا بقول رام دین حاضرین ایک چمتکار کے منتظر تھے!

مگر دیوی ماں نے جونہی نریش کا چہرہ دیکھا وہ مسکرا کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور پھر قہقہے لگاتی رہی!

یہ دیکھ کر گویا ایک بم پھٹ گیا! رام دین کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر لوگ بھی دوڑ کر بھاگ گئے!

انسپکٹر اٹل بہاری سراسیمگی کے عالم میں ڈوب گیا تو سنیاسی نے اس کو یہ کہہ کر چونکا دیا کہ مرحوم نریش کو اپنے باپ سے جہاں دولت وراثت میں مل چکی تھی وہاں اُس کو بیماری اپنی ماں سے وراثت میں مل گئی تھی!

گویا ایک باپ جو بیٹے کی لاعلاج بیماری کے بارے میں بہت پہلے جان چکا تھا اور ایک سنیاسی بن کر کئی برسوں سے سکون کی تلاش کر رہا تھا بیٹے کی لاش دیکھ کر بے ساختہ رو پڑا! لاش کو کار میں رکھ کر جب دیوی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو تسلیاں دینے کی خاطر اُس کو اپنے سینے سے بار بار لگاتا رہا تب دُور سے یہ منظر دیکھ رہا واحد تماشائی اور گواہ بڑبڑاتا رہا! جانے دیوی ماں کے قہقہے کس کی بربادی کے فیصلے سناتے جا رہے ہیں!۔۔!! جبکہ انسپکٹر اٹل بہاری کا شک یقین میں بدل گیا کہ ایک سی زوفرینہ (Schezophrenia) کے بیمار نے خودکشی کی تھی!!

OO

لالہ رُخ

جب ہم مشرق میں رہنے والے سو رہے تھے تب مغرب میں واقع کسی ٹیلی ویژن چینل نے ایک صدمہ خیز خبر دنیا کے ناظرین کو دکھا دی تھی! میں نے صبح سویرے خبر دیکھ لی!

بوسٹن امریکہ سے دہلی کے لیے اڑان لے چکا مسافروں سے بھرا ایک طیارہ زمینی رابطے سے کٹ جانے کی وجہ سے کھو چکا ہے یا پھر تباہ ہو چکا ہے!

ایک آفت انگیز حادثے کے بارے میں خدشات کا بوجھ اتنا بھاری ہو چکا ہے کہ ہر ذی ہوش انسان کی سانسیں دَبی جا رہی ہیں! حالانکہ کھوجی طیارے اور ہیلی کاپٹرز اپنی کوششوں اور ناکامیابیوں کے بارے میں مسلسل اطلاعات دے رہے تھے! مگر جب وہ یہ اطلاع بھی دیتے رہتے تھے کہ تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے جہاز خاموشی میں ڈوب گیا ہے تب مجھے وہ منظر آنکھوں کے سامنے بار بار آتا رہا جو میں نے چند روز پہلے ایک گہری کھائی میں، ایک بم کے دھماکے سے اُڑا دی گئی، بس کا منظر اپنی چینل کے لیے شوٹ (Shoot) کیا تھا!

دل تڑپ اٹھا تو بیس سال بعد لالہ رُخ کی یاد آئی! وہ اس لیے کہ وہ دکھ کو بھی، اپنی گفتار سے، مواد سے، محبت کے احساسات سے اور انسانی رشتوں کی مدد سے یوں محسوس کرنے میں مدد کیا کرتی تھی گویا نوکیلے پتے بھی پھولوں کا لمس نہ سہی، خوشبو بکھیر کر سکھ کے تصور کو اُبھارنے کا مشورہ ضرور دیا کرتے تھے! اس لیے ایک پیاسے کو تشنگی کا احساس تو ہونا ہی تھا نا؟؟

اچانک اپنے اِردگرد موجود لوگوں کی باتیں سن کر میں اپنے آپ سے گھبرانے لگا تھا! ٹی وی چینلوں پر حادثے کے شکار لوگوں کے نام تو آ نہیں رہے تھے مگر اچانک کچھ لوگوں نے منظم طریقے سے وادی میں یہ خبر پھیلا دی کہ جہاز میں مایۂ ناز صوفیانہ موسیقی پر عبور پا چکی وادی کی گلوکارہ عارفہ بھی سفر کر رہی تھی! عارفہ کا نام سن کر یاد آیا کہ وہی تو ہم سب کی پیاری لالہ رُخ ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے حالات کو کروٹ لیتے دیکھ کر لرز اٹھا تھا کیونکہ جو ہوا تھا وہ قیامت خیز تھا!

سوچا تھا کیا اور کیا ہوتے دیکھتا رہا!!

لالہ رُخ کی سلامتی کے لیے دعا کرنے کو جی چاہتا تھا مگر اپنی خواہش کو یوں اکھڑتے ہوئے دیکھا تھا گویا بادل پھٹ کر اپنے اُبل رہے پانی سے میرے پاؤں سے زمین کرید کرید کر نکال رہے تھے! سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایک افسوس ناک اظہار میں احتجاج کی تپش کیوں تھی؟ ایسا تاثر دیا گیا تھا کہ امریکہ میں بیس برس گزارنے کے بعد لالہ رُخ اپنی ہم شکل جڑواں بیٹیوں کے ساتھ اپنے مادرِ وطن آنا چاہتی تھی مگر ایک سازش کے تحت اس کو اِغوا کر دیا گیا ہے یا قتل کیا گیا ہے!

اور ایک بین الاقوامی سازش کے تحت 'عارفہ' نام کی ایک آواز کو 'لالہ رُخ' کا لقب دے کر ان کے خیالات کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی گستاخی کی گئی ہے! سیاسی سماجی اور تواریخی حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر!

جواز یوں پیش کیا گیا تھا کہ ان کی عارفہ کی ہم شکل جڑواں بیٹیاں ہیں جن میں ایک نے ہندو سے شادی کی ہے اور دوسری ایک مسلمان کی زوجہ ہے!

ایک بیٹی کا نواسہ ہے اور دوسری بیٹی کی نواسی ہے! اور کسی ہمدرد سے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ہندو نواسہ، ایک گہری سازش کے تحت اپنی نانی کو ایک ہندو جوگن ظاہر کرتے ہوئے ایک زاہدہ سے اس کا تشخص چھین لینے کا منصوبہ بنا چکا ہے! یعنی اپنے رنگ میں رنگ کر، اس کا جسم آگ کے سپرد کرنا چاہتا ہے، جو ایک عظیم گناہ ہے بلکہ ایک سنگین ترین جرم بھی ہے!

خبر میں برق کی لچک تھی یا سچائی کی تجلّی، لالہ رُخ وادی کے عوام کے لیے وہ ست رنگی چادر ہے جو یک رنگی بن کر اپنی خوشبو کے تاثر سے اپنی پہچان کروا دیتی ہے!

بقول لالہ رُخ:

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے
من چمن بن جائے تو سمجھ سے خوشبو آئے!

گویا اُس کی گونج رہی آواز کے ساتھ ایک بہت پہلے گزر چکا منظر، کالے بادلوں کو چیر کر، ایک دریچے سے اندر آ رہی روشنی کا لبادہ پہن کر سامنے آ گیا ہو—!

ہماری لالہ رُخ ایک سفید رنگ کا پیرہن پہن کر دریا میں ڈبکی لگا کر جوں ہی جھیل سے کھلے ہوئے کمل کے پھول کی طرح نظر آ گئی تھی تب وہ خود کو گھور گھور کر دیکھ رہی نگاہوں کے جال میں پا کر، اپنی ہی نظریں جھکا کر بڑبڑائی رہی تھی

پارسائی کا دعویٰ کرنے والوں کو دیکھو!

وہ جو ہوا کرتے تھے خوشبو، روح کے شیدائی!

بن گئے ہیں بدبودار جسموں کے سودائی!

وہ منظر اچانک دھند میں نظر آنے والے شناسا چہرہ اپنی ہی خواہشات کا عکس ثابت ہوا! اور اب میں خود پر گزر چکے واقعات کو جوڑ کر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب عارفہ کے بارے میں عام لوگ فکرمند تھے تب چند تاجروں نے حالات کا سودا طے کرلیا تھا — ! میری آنکھوں کے سامنے چھا چکا اندھیرا میرے ہوش چھین کر مجھے بے بس بنا چکا تھا! گویا مجھے ایک اسٹریچر پر چڑھا کر پھر ایک Ventilator پر رکھ کر کب لوکل جہاز سے اُتار کر بین الاقوامی جہاز میں بٹھا کر ایک اجنبی ہوائی اڈّے پر اُتارا گیا کہ مجھے معلوم نہیں!

حیران ہوں کہ میرے ساتھ میرے کیمرے کے بغیر کوئی بھی ایسی دستاویز نہیں جو میرے ہوائی سفر کو آسان بنا دیتی — پھر بھی میں سفر کر رہا ہوں!

جو بھی ہوا وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ یوں لگ رہا تھا گویا ہوا میں اُڑتے دیکھ کر یوں محسوس کرتا رہا گویا طلسمی دنیا کی سیر کر رہا ہوں! فرق یہ کہ میں ایک جن کے کندھوں پر سوار ہو کر بادلوں کے اوپر اُڑ نہیں رہا تھا بلکہ ایک طیارے میں سفر کر رہا ہوں!

خیر میں اپنے ہم سفروں کی باتیں سن کر یہ جان گیا تھا کہ میں سرکاری کھوجی ٹیم کے چھ عدد ہیلی کاپٹروں میں ایک رضاکار کھوجی ٹیم کا واحد کیمرہ مین ہوں جو ایک مقصد کے لیے ہوائی حادثے میں شکار ہو چکے بدبخت انسانوں کی مدد کرنے کی خاطر اپنے سر پر کفن باندھ کر کارِ نیک کرنے کے عزم، بلندی کو چھو لینے کی خواہش کو اپنے دِل میں، رگوں میں خون کی طرح، حفاظت کے ساتھ رکھ لینے کے عادی ہو چکے ہیں! ظاہر ہے کہ میں ہوش میں آتے ہی اپنے ہم سفروں سے متاثر ہوا! ان کی خواہش جان کر!

میرے ہم سفر، چونکہ وادی کی زبان بول نہیں سکتے تھے اس لیے عارفہ کے ایک مقبول نغمے کا ترجمہ گنگنا رہے تھے — من روح کی آواز ہے — بلکہ من ہی روح ہے — روح کی قدر کرو — مگر اس کو کھلاتے کھاتے — اتنا مت کھلا دو کہ تمھارے اندر — چھپ کر بیٹھا — شیطان باہر آ کر — ایک درندہ بن کر — دبوچ لے تم میں بیٹھے انسان کو!

ترجم سن کر وہ نغمہ یاد آیا جو ہماری لالہ رخ عوام کے پرزور اصرار پر وہاں گایا کرتی تھی جہاں

ہندو، مسلمان کے ہر جسم میں انسان موجود ہوتے تھے:

دل سے دِلوں کو ملا دے!

انسان کو انسانوں سے ملا دے!

کیونکہ — سب کا محرم تو!!

تو ہی تو! دُنیا بنانے والے!!

غیروں کو بھی اپنوں سے ملا دے!

لالہ رُخ کے اس مقبولِ عام نغمے کو وہ توڑ موڑ کر گا رہے تھے! محبت کے گیت کو وہ ایک جنگی ترانے کی طرز پر گا کر، نغمے کا مفہوم یوں بدل رہے تھے گویا صدیوں پہلے حملہ آور، اپنی لشکر کے قدموں کی آہٹ سے ہم آہنگ ہو کر بینڈ باجے بجا کر، امن پسند لوگوں کو ڈرا کر، یا دَبا کر، اپنی فتوحات کا ڈنکا بجا کر اُن کو اطلاع دے رہا ہو کہ سامنے سے ہٹ کر ہمارے پیچھے پیچھے چل کر شامل ہو جاؤ! یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!!

لالہ رُخ کے نغموں کو ایک نئی لے اور رنگ میں سن کر جانے کیوں ان کے فلسفوں میں آلودگی کا احساس ہونے لگا —! گویا ایک ہوائی گرداب کی وجہ سے اپنے آپ کو سمجھا نہیں پایا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں —! بلکہ کیا کرنے جا رہا ہوں؟

پہلی بار لالہ رُخ کے فلسفوں کو ترک کر کے اپنے عقیدوں سے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنے کو جی چاہا تو اپنے دادا سے رَٹے ہوئے تمام وید منتروں کو یہ سمجھ کر اور سوچ کر کہ جونہی بچاؤ کی خاطر پوجا مکمل کر دوں تب نظریں اٹھا کر آسمان کو گھورتا رہوں! ایک کرشمہ دیکھنے کی خاطر — مگر جیسا چاہا تھا ویسا ہوا نہیں تھا! یعنی اعتقاد لرزتا ہوا نظر آیا تھا! جیسے میں دھارمک فلموں میں دیکھا کرتا تھا! منتروں کے جاپ کے فوراً بعد نہ آسمان میں کوئی اُجلا بادلوں کا ٹکڑا نظر آیا اور نہ کہیں بھی کسی آسمان کے گوشے میں بادل کے ٹکڑوں پر، باوقار ملبوسات پہن کر کوئی دیوی دیوتا نظر آیا! ظاہر ہو چکا تھا کہ مجھے بچانے کی خاطر کوئی بھی مسیحا نظر نہیں آیا تھا —!!

ایک بار پھر اپنی لالہ رُخ کے نغموں کی گونج مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی تو دل نے گواہی دی کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے اور اپنے مخصوص انداز میں گنگنا رہی ہے! —؟ —!!

خدا کے بندوں کو دیکھ کر — خدا سے مُنکر ہو رہی ہے دنیا

بُرے ہوں جس خدا کے بندے کبھی وہ اچھا خدا نہیں

گدھ کو لمبی عمر عطا کی اُس نے — اونچی پرواز کے لیے پَر بھی دیے اُس کو
تیز نگاہی کا عطیہ بھی دیا جس کو — مگر نادان کی نظریں
زمین پر پڑی لاشوں پر — جمی رہتی ہیں — اکثر
زمین پر اُتر کر — لالچ بن کر — بدبودار بے جان جسموں کو
کھاتا رہتا ہے انجام سے بے خبر ہو کر — بوجھ اٹھا کر اُڑ نہیں پاتا ہے مضبوط پَر ہو کر زمین پر پڑا رہتا ہے احمق — چینٹیوں کی خوراک بن کر —!
عقلمندوں کو سمجھانے کی خاطر — نادانوں کو دِکھانے کی خاطر!!

دراصل لالہ رُخ کی باتیں یا نغمے سوچ اور سمجھ کے دائروں سے نکل کر خوشبو کی طرح چار سو پھیل کر سانسوں میں سما کر ایک تاثر قائم کر دیتے ہیں! خوشبو میں تاثیرِ مسیحائی ہے اور مسیحائی دراصل پاکیزگی ہے! پاکیزگی میں قدرت کی خوشنودگی ہے! اور خوشنودگی ہی زندگی ہے! ہاں دھان کے پودوں کے ساتھ ایک ہم شکل گھاس بھی اُگتی رہتی ہے، اس شیطانی گھاس کو ایک سمجھ دار کاشتکار شیطانی گھاس سمجھ کر اکھاڑ نہیں دے گا تو دھان کی فصل کیسے ہوگی! گویا شفقت محنت کا میٹھا پھل ہے! غفلت تباہ کن ہو سکتی ہے؟ کہیں مجھ سے کوئی غفلت تو نہیں ہو رہی ہے؟؟

رِشی منیوں کی وادی میں شیطانی اگر مناسب گھاس کو اُگنے نہ دیں تو وہی رحمت کہلائے گی! یعنی ہم جو صدیوں سے کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں تو بہتر! تب ہی تو جنت کا تصور قائم رہے گا! دائم رہے گا! ہاں مگر ہم سے پوچھو کہ جنت کا وجود کیا ہے؟ تو سن لو ایک گونگا شہد کھا کر کیسے بتا سکے گا کہ مٹھاس کیا ہوتی ہے؟ راز کو راز ہی رہنے دو تو بہتر! راز کو راز ہی رہنے دو تو بہتر

میں ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اپنے اجنبی ہم سفروں کے ارادوں کو میں بھانپ چکا ہوں! اگر میں ان کی باتیں غور سے نہ سن لیتا تو میرا ان کے ساتھ ہونا ایک معمہ بن کر رہ گیا ہوتا! وہ ایک وادی کے ہی انسان سے، اس کی ہی مادری زمین پر اُس کی مادری زبان میں اپنی بات دُنیا کو بتا سکیں!! لالہ رُخ کی خاطر وہ اربوں ڈالر داؤ پر لگا چکے ہیں مگر اُس کی سلامتی کے لیے دعائیں کرنے کی بجائے وہ اس کو دفن کر دینے کے منصوبے کیوں بنا رہے ہیں؟ کیوں؟ — کیوں؟؟

لیکن میں جو بھی بیان کر دوں گا یا عیاں کر دوں گا اُس میں نہ تو جھوٹ کی ملاوٹ ہوگی اور نہ بناوٹ کی سجاوٹ ہوگی! یعنی ہماری لالہ رُخ جو ہماری روح کی نمائندگی کرتی آئی ہے وہ اب بھی کرے گی! یعنی میری کہانی میں واقعات کی سچائی ہوگی — جو تواریخ کے حوالوں کی زبان ہوگی! بنائے

گئے حالات کی سیاست نہیں ہوگی! اور نہ تاجروں کے دُکانوں پر دستیاب سامان کی کہانی ہوگی!

کوئی مجھ سے پوچھ لے کہ ہماری لالہ رُخ کون ہے؟ میں بتادوں گا!

کون ہیں یہ لوگ جو ہماری وادی کے تہذیب، تمدن، سوچ اور سمجھ کو اپنے رنگوں میں رنگ کر وادی میں دو قومی نظریات کو اُچھال کر، نت نئے منصوبے بناتے جارہے ہیں! کبھی قبائیلوں کی وادی میں پہنچ کر، کبھی فوجیوں اور کبھی گھس پیٹھیوں کے بل بوتے پر منصوبے بناتے جارہے ہیں اور ہر بار اپنی اپنی تجارت کو منظرِ عام پر لاکر — ہماری لالہ رُخ کو دفن کرنے کے منصوبے بنا کر — اپنی اپنی تجارت کو منظرِ عام پر لاکر — ہماری — کو دفن کرنے کے منصوبے بنا کر — عوام کو غلام بنا کر — یہاں کے منتخب حکمرانوں کو ہٹا کر — ہماری دفاعی فوج کو جنگی قیدی بنا کر — اپنے خوابوں کی تعبیر بھی دیکھ کر — جشن کی تیاریاں کررہے ہیں؟ — جو بھی ہیں، نادان ہیں! وہ نہیں جانتے ہیں کہ وادی کے لوگ لالہ رُخ کو بچپن سے جانتے ہیں!

مجھے آج بھی وہ صبح یاد ہے! شاید اس لیے کہ وہ صبح انوکھی تھی!

جب ہندستان کا بٹوارہ ہوا تھا تب میں سات سال کا تھا! میرے بڑے بھائی نے دیوار پر آویزاں نقشہ اُتار کر میرے دادا مرحوم سے پوچھا تھا کہ اب بھارت ماتا کس کو کہیں — ایک کٹ چکے نقشے کے کس حصے کو؟ اور وہ جواب دیئے بغیر دریا کے کنارے یوں نظر آئے تھے گویا پوجا کررہے ہوں! دراصل وہ رو رہے تھے! جانے کیوں؟ ہمارا گھر دریا کے دائیں کنارے پر تھا جواب ایک مکان ہے! اُف! اُف!

ہمارے گھر کے ساتھ ایک پتھروں سے بنا ہوا ایک پچاس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں محلے کے بچے کھیلا کرتے تھے! ساتھ میں ایک شیو جی کا مندر تھا جہاں صبح اور شام کو گویا میلہ لگا رہتا تھا جبکہ دن کو مندر کا پجاری بھی نظر نہیں آیا کرتا تھا!

چونکہ دریا میں پانی کی سطح نشیبی ہوا کرتی تھی اِس لیے نہانے والوں کے لیے پتھروں سے بنائی گئیں کئی سیڑھیاں تھیں! چونکہ اُن دِنوں گھروں میں غسل خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے نہانے والے، اپنی باری کے انتظار میں سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے یوں نظر آیا کرتے تھے گویا روم کے دانشور اپنے غلاموں کے عبرت ناک کھیلوں کا تماشہ دیکھ دیکھ کر سیاسی کھیل کھیلا کرتے تھے! چہروں پر مصنوعی تاثرات لاکر، کبھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرکے اور کبھی معنی خیز مسکراہٹیں بکھیر کر، اپنے ہی لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے لیا کرتے تھے مگر ہمارے محلے والے بلکہ اڑوس پڑوس کے محلوں

سے آئے ہوئے ہندو اور مسلمان چند اختلافات کے باوجود بات بات پر قہقہے لگاتے ہوئے نہایت نرم لہجے میں باتیں کیا کرتے رہتے تھے! یعنی اپنی وراثت میں ملی امن پسندی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے! وادی میں جنم لینے والے رشیوں اور منیوں کی طرح! اپنے خیالات اور جذبات کے اظہارات کے لیے دکھاوٹ اور بناوٹ کی ضرورت محسوس کیے بغیر! یعنی جو دل میں ہو وہی دماغ میں ہے!!

ہمارے محلے میں ایک ہی مسلمان کا گھر تھا اور حسن نانوائی کا مکان ہمارے مکان سے جڑا ہوا تھا! اور اتفاقاً حسن چاچا روز اپنے تنور سے نکالی گئی پہلی روٹی مجھے کھلایا کرتا تھا حالانکہ اُن دِنوں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے سے جذباتی اور خیالاتی ہم آہنگی کے باوجود ایک دوسرے کے گھروں میں کھایا پیا نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے موضوعات کو جن پر بحث کرنے سے برف سے بھی حرارت ہونے کے خدشات، اندیشے یا دوریاں پیدا ہوسکتی تھیں ان کو مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا تھا! یعنی لوگ ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے تھے اور بے پناہ محبت بھی!

حسن چاچا مجھ سے جنون کی حد تک پیار کرتے تھے! میں ان کی چھ بیٹیوں کا بھائی جیسا تھا! ان دِنوں بھی مذہبی موضوعات پر دریا کے کناروں پر مسلمانوں کے محلوں اور ہندوؤں کے محلوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنے والے، سیاسی گرج کے ساتھ نظر آیا کرتے تھے مگر بنائے گئے حالات سے واقعات دونوں فرقوں کی وراثت میں حاصل کی ہوئی دانشمندی کی روایت سے عام لوگوں کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے تھے! وجہ یہ تھی کہ لوگ مذہب پرست تھے فرقہ پرست نہیں!

اس روز بھی جب دونوں کناروں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والا قدیم پل، اس پار رہنے والے ہندوؤں اور اُس پار رہنے والے مسلمانوں کے مندر اور مسجد کی ملکیت کا تنازع بن گیا تھا! امن پسند لوگوں نے ایک کروچ کو ناسور بن جانے سے پہلے مرہم لگا کر، زخم کے داغ کو بھی مٹا دیا تھا!

یہی ہماری وادی کی روایت ہوا کرتی تھی بلکہ اب بھی ہے! میں معمول کی طرح تب کپڑے اُتار کر پانی میں ڈبکی لگا چکا تھا جب میں نے دریا کی سست رفتار میں ایک ٹوکری میں ایک نوزائیدہ بچی کو دیکھ کر شور مچایا تھا اور گھاٹ پر موجود بھی لوگوں کو چونکا دیا تھا!

تب ایک سبز اور کیسری رنگ کے کپڑے میں ملبوس بچی کو میرے دادا مرحوم نے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ کمل کا پھول جھیل سے اکھاڑ کر کس نے بہہ رہے پانی میں ڈال دیا ہے؟ کمل کے پھول پر دنیا بنانے والے برہما بیٹھ کر دنیا کی خبر لیتے ہیں! جبکہ حسن چاچا نے ایک لینڈلی کی طرح اُچھل کر

کپڑے اُتارے بغیر دریا میں کود کر ٹوکری کو پانی سے نکال کر، غور سے دیکھ کر، بچی کے لالہ پھول کے مانند رخسار دیکھا کر چونک کر کہا تھا — ارے یہ لالہ رُخ کہاں سے آ گئی ہے؟

اگلے ہی لمحے گھاٹ پر ہو رہی لوگوں کی باتوں کو ایک عجیب قسم کی کیفیت نے دبوچ ڈالا تھا! پھر جب لوگوں کے لرز رہے ہونٹوں پر سرگوشیوں کو جنم دیا تھا تو ہم خیال لوگ ایک دوسرے کو یا تو سناتے رہے یا سمجھاتے رہے! گویا دانشوروں کی بحث ہو رہی تھی!

بچہ ہوتا تو سمجھتے کہ کل یگ میں واسودیو کی گرفت سے بھگوان کرشن نکل کر بہہ گیا ہے! کسی نے بچی کو کسی عیاش جوڑے کی ناجائز اولاد سمجھ کر پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا تھا! ایک جنونی نے بچی کو ملٹری کے سپرد کرنے کا نعرہ بھی لگایا تھا! کسی نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ حضرت موسیٰ کو بھی اپنی ماں نے خود پانی کے سپرد کر دیا تھا — مگر وہ بیٹا تھا! ایک بیٹی نہیں تھی! یعنی نوعیت بدل جاتی ہے! کسی نے فرقہ واری کی شکار ہو چکی اور پھر خودکشی کر چکی ماں کو اپنی اولاد کو بچانے کی کوشش کو ایک فرقے کا مقصد بتا کر دُور بیٹھے دوسرے فرقے کی فطرت کا نام دیا تھا! اس سے پہلے کہ خیالات کروٹ بدل کر ایک تکرار کو جھگڑے میں بدل دیتے یا راکھ کے نیچے دبائے گئے شعلوں کو ہوائیں دیتے! گھاٹ پر اپنی اپنی باری کا، صبر و تحمل سے نہانے کے لیے انتظار کرنے والے ایک ایک کر کے چل پڑے تھے — امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے!

دیکھتے ہی دیکھتے گھاٹ خالی ہو گیا تھا! میں کپڑے پہنے بغیر دریا میں کھڑا تھا جبکہ حسن چاچا ٹوکری گود میں لے کر یہ بھول گئے تھے کہ ان کے بھیگ چکے کپڑوں سے سیڑھیوں پر گرتا ہوا پانی دریا میں جا رہا تھا! وہ خوش تھا کہ اس نے بچی کو پانی میں بہہ جانے سے بچا لیا تھا!

تب میں حسن چاچا کو تجسس سے دیکھ رہا تھا جب وہ بچی کو دیکھ کر تذبذب کے شکار نظر آ رہے تھے! وہ میرے دادا کو آوازیں دے کر، ایک جانے مانے انسانی رشتوں کے قدردان اور ویدوں، پرانوں بلکہ مذہبی معلومات میں ماہر، ایک سو سے زیادہ قدیم کتابوں کے انمول ذخیرے کے تحویل دار سے، ایک آدم زاد جس کو اُس نے فخر سے لالہ رُخ کا نام دیا تھا، کے بارے میں مشورہ لینا چاہتا تھا — مگر تب جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سے ٹپک رہے پانی سے گھاٹ کے پتھروں کو تر کر رہا تھا! میرے مرحوم دادا نہائے بغیر مندر میں جا کر شیولنگ پر پانی چڑھانے گئے تھے!

بات شاید ختم ہو گئی ہوتی اگر دوسرے کنارے پر چند اجنبی لوگ، ایک بچی کو مرکز بنا کر، ایک مسئلے کو ایک سیاسی دائرے کی حیطہ میں قید کرنے کے اشارے نہ دیتے!

اچانک اُس پار مسجد میں اور اِس پار مندر میں سوچ کا ڈھنگ بدل گیا تھا! چونکہ بٹوارہ مذہب کی بنیاد پر ہو چکا تھا کوئی اپنی مذہبی شناخت سے انکار کیسے کر سکتا تھا؟ کیونکہ اپنی اپنی قطار میں شامل ہونا اہم بھی تھا اور لازم بھی تھا! لڑکی ہندو ہے یا مسلمان؟ مجرم ہے یا مظلوم؟ میرے دماغ میں ایسی باتیں آ نہیں سکتی تھی مگر حسن چاچا شاید ایک زبردست ذہنی تناؤ کے شکار تھے!

میری ماں کھڑکی سے جھانک کر، بار بار مجھے یہ اشاروں میں سمجھا رہی تھی کہ وہ بچی کو حسن چاچا کی گود سے چھین کر اپنے گھر لے آؤں! مگر بچے عقل کے کچے ہوتے ہیں نا؟ مگر وہ خود یہ نیک کام کرنے کی خاطر گھاٹ پر نہیں آئی تھی! میں چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پایا تھا—

اچانک حسن چاچا گھاٹ پر چھا چکے سناٹے کو توڑ کر، ٹوکری کو سینے سے لگا کر بول پڑا تھا— انسان کا بچہ ہے! کوئی اس کو پناہ دے یا نہ دے، میرے گھر میں سورج کے چھ رنگ آ چکے ہیں! لالہ رُخ ساتواں رنگ ہے! اُجالا میرے گھر میں آفتاب اپنے ساتوں رنگ لے کر دَر اور دریچوں سے داخل ہوگا!

میں گواہ ہوں اُس لمحے کا جب حسن چاچا نے میری موجودگی میں، فاطمہ چاچی کے ڈھکے ہوئے پستانوں کو عیاں کر کے لالہ رُخ کو اپنی نوزائیدہ بیٹی عابدہ کے دودھ کی شریک بنا ڈالا تھا!

میری ماں مجھ سے ناراض تھی کیونکہ اُس کو یقین تھا کہ لالہ رُخ کے چہرے پر عیاں نور یہ ثابت کر رہا تھا کہ بچی میرا (Meera) کا پُنر جنم ہے! وجہ یہ کہ اُس روز گوکل اشٹمی یعنی بھگوان کرشن کا جنم دن تھا جو اتفاقاً میرا بھی جنم دن تھا— بقول میری ماں، بچی عمر میں چھوٹی ہے ورنہ رادھا بھی ہو سکتی ہے اس لیے بچی میری ہے! دوسرے محلوں سے آئے چند رشتے داروں نے حسن چاچا کو نہ صرف روکا تھا بلکہ سختی سے ٹوکا بھی تھا— بچی اگر ہندو ہو تو؟؟

مگر حسن چاچا نے نہایت عاجزی سے بھی اور بوکھلا کر یہی کہا تھا کہ اگر یہ بچی انسان کی دریا میں پھینکی ہوئی ایک چوہے کی اولاد ہوتی تب بھی میں دریا میں بہنے نہ دیتا! ایک چیل کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لینے نہ دیتا! حالانکہ چوہے بڑی بڑی پھاٹکوں کو کُتر کُتر کر اپنے چور راستے بنا دیتے ہیں! دیواروں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں! پھر بھی ہم صوفی سنتوں کی اولاد ٹ اپنی فطرت کے غلام ہونے کی وجہ سے پکڑ چکے چوہے کو مارنے کی بجائے دریا میں پھینک کر، فیصلہ دنیا بنانے والے پر چھوڑ تو دیتے ہیں! مگر چوہے کو چیل کے پنجوں میں دیکھ نہیں پاتے! پھر یہ بچی تو نسلِ آدم ہے!

فاطمہ چاچی نے لالہ رُخ کو اپنا کر عارفانہ ... مگر ہم لوگ اس کو چاہت کے جذبوں کی

قدر کرتے ہوئے لالہ رُخ یعنی سرخ رنگ کے پھولوں کے مانند رخساروں کے نام سے آوازیں دے کر روک لیا کرتے تھے — دُکھ میں سکھ میں — غم میں یا خوشی میں، برف پوش زمین پر دھنس دھنس کر چلتے چلتے یا سرسبز مخملی گھاس پر پکھراج کے مانند چمک رہے شبنم کے قطروں کو ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے ان کے نغمے سنا کرتے تھے — اور سکون محسوس کیا کرتے تھے!

میری ماں لالہ رُخ سے اتنا ہی پیار کرتی تھی جتنا فاطمہ چاچی عارفہ کو دُلار کیا کرتی تھی! کیونکہ سرخ گالوں والی عارفہ ایک بے حد خوبصورت بچی تھی جو معمولی کپڑوں میں بھی اپنی چھ بہنوں بلکہ محلے کی تمام ہم عمر لڑکیوں میں اپنے چال ڈھال اور خاص طور پر آنکھوں میں چمک کی وجہ سے الگ سی نظر آیا کرتی تھی! اس لیے میری ماں اکثر بالوں میں تیل لگانے کے بہانے یا اس کے لیے خود خریدے کپڑے پہنانے کے بہانے گھنٹوں اپنے ساتھ رکھ کر کچھ مزاحیہ انداز میں مگر زیادہ اوقات پر سنجیدگی سے لالہ رُخ کو یقین دلایا کرتی تھی کہ وہ ہندو ہے! کبھی بھری بزم میں لالہ رُخ کو کرشن کی رادھا ثابت کرنے کی خاطر نوٹنکیوں کا سہارا لے کر کہا کرتی تھی کہ ست یگ میں رادھا کرشن بھگوان سے عمر میں بڑی تھی اس یگ میں وہ عمر میں چھوٹی ہے! اس چکر میں لالہ رُخ اکثر میری ماں کے پلّو سے بندھی ہوئی نظر آیا کرتی تھی! ایک ساتھ ایک مسلمان ماں اور ہندو ماں کی شگفتگی کے قصے محلے میں بطور تفریح بھی سنے سنائے جاتے تھے اور کبھی بطور تنقید بھی بحث میں آجایا کرتے تھے! مثلاً وہ لالہ رُخ سے ہی پوچھا کرتے تھے کہ آج اُس کا مسلمانوں والا روزہ ہے یا ہندووالا فاقہ (برت) ہے؟

لالہ رُخ تقریباً آٹھ سال کی تھی جب میری ماں نے اس کے ماتھے پر چندن کا تلک لگا کر خود منتروں کا جاپ کرتے ہوئے شیولنگ پر دودھ چڑھا رہا تھا تب اُس نے پہلی بار میری ماں کو محلے کی دوسری عورتوں کی موجودگی میں ٹوک کر آس پاس کے ماحول کو پل بھر کے لیے مفلوج کر دیا تھا کیونکہ وہ پوچھ بیٹھی تھی کہ وہ ایک پتھر کو کیوں دودھ پلا رہی ہے؟ جب اس کا پیٹ نظر نہیں آتا؟ بلکہ اس کا منہ بھی نہیں ہے؟ اس سے اچھا ہے کہ یہ دودھ کسی بچے کو پلا دو؟

محلے میں اس واقعہ کا چرچا ہوا تھا! اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا کہ پتھر کیا بھوکے ہوتے ہیں؟ میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو مجھے بھی پہلی بار چونکا دیا تھا — یہ کہہ کر کہ بھگوان دن بھر اس کمرے میں کیوں رہتا ہے جہاں پجاری تالا لگا کر چلا جاتا ہے؟ بھگوان کیا کھو جاتا ہے؟ یا کوئی اس کو چُرا سکتا ہے؟

رفتہ رفتہ محلے والے جان گئے تھے کہ لالہ رُخ کی باتوں میں معصومیت تو ہوتی ہے مگر عام روش سے ہٹ کر ایسا مواد بھی ہوتا تھا جس کے بارے میں سمجھ دار خاموشی اختیار کر لیتے تھے اور ناسمجھ باتوں کو گنگنایا کرتے تھے غالباً تصوف کے احساسات کو جگا کر رِشی منیوں، پیروں فقیروں کے ذہنوں پر دستک دینے کی خاطر!

مجھے یاد ہے وہ دن جب اس کی بڑی بہن کی شادی کی تقریبات میں ایک بارہ سال کی لڑکی نے اپنے ہونے والے بہنوئی کے استقبال میں ایک روایتی لوک رقص میں گانے کے الفاظ بدل کر ایک درویش کو اس قدر چونکا دیا تھا کہ وہ وجد میں آ کر غیر روایتی انداز میں رقص کرتا رہا!

وہ منظر یاد آتے ہی گویا سامنے آ جایا کرتا ہے! آج بھی وہ منظر گویا میری آنکھوں کے سامنے اُبھر رہا ہے؟ آس پاس پھیلے بادل کے ٹکڑوں کو چیرتا ہوا!!

ایک طرف کھڑی لڑکیاں، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر جھوم جھوم کر گا رہی تھیں جس کا جواب سامنے کھڑی لڑکیوں نے جھوم جھوم کر دینا تھا! ایک طرف کھڑی لڑکیوں نے دولھے کے نام کے قصیدے پڑھ کر کہا:

"دولھے راجا! جلدی سے آ جا! ہم کر رہے ہیں تیرا انتظار!"

تو جواباً لالہ رخ کی آوازیوں گونج پڑی تھی گویا آسمان بول پڑا تھا:

"ویسے ہی جیسے دھان کے پودے کرتے ہیں بارش کا انتظار!"

اس کے بعد ہماری لالہ رُخ کے نغمے ہندو اور مسلمانوں کی شادیوں میں عام زندگی سے جڑے غم اور خوشی کے موضوعات کو احساسات، تصوف اور وحدت ساتھ ساتھ چاہت، الفت، محبت کی خوشبو سے آشنا ہو کر، تذبذب، تجسس، تناؤ جیسے سکون شکن حالات اور واقعات کا محنت اور مشقت کی قوتوں سے مقابلہ کرنے کا سلیقہ سکھاتے رہے!

مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں لالہ رُخ کے بالکل قریب رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا! وہ جب بھی مجھے دیکھا کرتی تھی تب میرا ہاتھ پکڑ کر گھاٹ پر لے جایا کرتی تھی! پھر ہم دونوں سیڑھیوں پر بیٹھ کر دریا کے اِس پار مندر اور اُس پار مسجد کو دیکھتے رہتے تھے! وہ عام باتیں بھی ایسے کرتی رہتی جیسے وہ شعر سُنا کر شاعری کا مفہوم بھی گنگنا کر سُناتی رہتی تھی!

پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا تھا، لیکن مجھے اپنی جوانی کے وہ دن یاد ہیں جب میں اُس کے جسم کی سہانی آنچ محسوس کرنے کی خاطر اس کے ساتھ چپک کر بیٹھا کرتا تھا، لیکن اُس کی باتیں سُن کر

میں جسمانی طور پر ایک تپش محسوس کیا کرتا تھا جبکہ ذہنی طور پر یوں لگا کرتا تھا گویا کسی برف پوش پربت پر کسی خدادوست کی ٹھنڈک محسوس کرر ہا ہوں! وہ جو باتیں کیا کرتی تھی وہی اُس کی پہچان تھی

دنیا بنانے والے! تم نے زمین بنادی — اچھا کیا — !

مگر دو براعظموں کے درمیان — بحر کیوں بنا دیئے؟

ایک ہی براعظم کے آر پار ممالک کے درمیان — خلیج کیوں بنا دیئے؟

ایک ہی ملک میں — خلیج سے جڑی جھیل بنا کر — پانی کا تناؤ کیوں پیدا کر دیا؟

انسان اور انسان کے درمیان — فتنہ کیوں پیدا کر دیا؟

تم نے ہوا میں کوئی لکیر نہیں ڈال دی ہیں — اچھا کیا ہے!

ورنہ دنیا میں ہر جاندار سانسوں کے لیے لڑ رہا ہوتا — !

اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو تمھاری بجد سے ابدی کی کہانی شروع ہونے سے پہلے ختم ہو گئی ہوتی!

ہو گی ہوتی نا؟ جواب دو؟

ہمارے لڑکپن میں میری ماں اَدھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر اکثر بڑے اشتیاق سے ہمیں دیکھتی رہتی تھی اور پھر میرے گھر میں داخل ہوتے ہی سوالات کرتی رہتی تھی اور میرے جوابات سن کر اُن پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی!

ایک روز میرے منع کرنے کے باوجود وہ لالہ رُخ کو رادھا بنا کر اپنے مندر میں لے گئی تھی اور چندن کے پلنے پر بھگوان کرشن کی تصویر رکھ کر، پلنے کی ڈور لالہ رُخ کے ہاتھ میں تھما کر لوری نما بھجن گا کر، بقول اس کے، کرشن بھگوان کو سلانے کے لیے اصرار کر رہی تھی — ! اور اپنی خوشیوں کو دوبالا کرنے کی منتظر تھی، لیکن لالہ رُخ نے اپنے مخصوص انداز میں، یعنی گنگنا کر کہا تھا کہ ایک چشمے کا پانی — جانے کس پہاڑ کی چوٹی سے — پگھل کر — دریا بن گیا! اور کب زمین میں جذب ہو کر — ایک چشمہ بن کر — ایک مسیحا کی طرح نمودار ہوا — ! تاثیر مسیحائی دکھانے کی خاطر — صدیوں سے دونوں کناروں کو — ایک دوسرے سے جوڑ کر — اِس پار اور اُس پار — پیاسوں کی پیاس بجھاتا رہا — اِس پار پرستش کرنے والوں کی اور اُس پار عبادت کرنے والوں کی — تشنگی محسوس کرتے ہوئے — ! وقت چلتا رہا اور زندگی رنگ بدل بدل کر جنم لیتی رہی اور مرتی رہی!

آج پانی کو کاٹ دینے کی سازش ہو رہی ہے — یہ جان گئی ہوں! اور دو نقطوں کو ملا دینے والی وہ لکیر! — جس کو گرداب جڑی ہوئی ہے! گرداب کا شکار ہو چکی ہے! یہ میں دیکھ چکی

ہوں!— میں دریا پار کیسے کر پاؤں گی؟ یہ سمجھ نہیں پارہی ہوں!— اور تم میرے واحد مددگار!— اور تم؟ میری کشتی کے ناخدا کو— سلانے کی کوشش کر رہی ہو؟—؟ کیسی ماں ہو تم —؟؟

یہ کہہ کر وہ دیوانگی کے عالم میں یوں دوڑتی اور ہانپتی ہوئی نظر آئی تھی گویا کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا! یا وہ کسی کو بھگا دینے کی خاطر اس کے پیچھے پڑ گئی تھی!!

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب حسن چاچا نے بھی مجھ سے آنکھیں چرا کر دوریاں بنا ڈالی تھیں— حالانکہ وہ اکثر گنگنایا کرتا تھا— روٹیاں پکاتے پکاتے —!

کوئی ہندو کوئی مسلمان— دونوں باہم ایک ہیں!

جس طرح اعداد جمنا— اور زم زم ایک ہیں!

کوئی مجھ سے پوچھے تو بتا دوں— عارفہ اور اور لالہ رُخ ایک ہیں!!

روح اللہ کی طرح غیر فانی ہے— جسم ہندو یا مسلمان کا ہو وہ فانی ہے!

میں لالہ رُخ کی یادوں میں کھو چکا تھا جب کھوجی ہیلی کاپٹروں نے یہ اطلاع دی کہ وہ جزیرہ نظر آ چکا ہے جہاں جہاز کا ملبہ نظر آ رہا ہے مگر وہاں فوری طور پر پہنچ پانا دُشوار نظر آ رہا ہے! وجہ موسم کی خرابی بتا گئی!

میرے ہم سفر خوش تھے! وہ اس لیے کہ کسی کے زندہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا! چونکہ حادثے کے چوتھے دن ملبے کے نیچے لاشیں ہی مل سکتی تھیں اس لیے یہ سوچ کر وہ فوری طور پر مقامی اور عالمی دباؤ ڈال کر عارفہ کی میت کو وادی میں دفن کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے! عارفہ کی آواز بلند کرنے کی خاطر! جبکہ میں دعائیں کرتا رہا کہ کوئی ایسا کرشمہ ہو جائے جس کی بدولت وادی کے کونے کونے میں ہماری لالہ رُخ کی آواز سن کر اُبل رہے سیاسی حالات میں عوام یہ اُبال دینے والے ایندھن کو اُکھاڑ کر پھینک دیں! ایسا تب ہو سکتا ہے جب سچ اُن کے سامنے آ پائے! ورنہ نہیں!

امید جب پھول رہے سانسوں کو تھام لیتی ہے تو یادیں پھر تعاقب کرنے لگتی ہیں! واقعات کے گزر جانے کے دوران موسم بدلتے رہتے ہیں! سال گزر جاتے ہیں— صدیاں گزر جاتی ہیں مگر بیتے دنوں کی یادیں ہوا کے جھونکوں کی طرح چھُو کر، کبھی گرمی اور کبھی ٹھنڈک کا احساس دلاتی رہتی ہیں—! میں بھی ایسی کیفیت کا شکار ہو گیا ہوں وہ اس لیے کہ حساس ہوں!

پچاس برس گزر چکے ہیں— بچپن گزر چکا ہے— جوانی بیت چکی ہے اور اب بوڑھاپا تڑپا رہا ہے! ماضی کی یادیں عذاب کی شدت کا احساس دلاتی رہتی ہیں! کاش میری ماں نے اُس

روز لالہ رُخ کو رادھا کا لبادہ پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی کہ لالہ رُخ پیدائش سے ہندو ہے! کاش ہندو اور مسلمان، دونوں ہم آہنگ اور ہم نوا ہو کر دُنیا کو بتا دیتے کہ لالہ رُخ وادی کی بیٹی ہے!

وہ دن قیامت خیز ثابت ہوا تھا— میری ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رادھا کے ملبوسات پہن کر لالہ رُخ نے ہندوؤں کی ایک تقریب میں وہی نغمے سنائے تھے جن کو سننے والے اشتیاق سے سن کر جھوم اٹھا کرتے تھے لیکن جانے کیوں ایک خیالاتی زلزلے کی زد میں آ کر، اپنے آپ کو شادی بیاہ کے بندھوں سے کوسوں دُور رکھنے والی زاہدہ یا جوگن حالات کے بھنور میں پھنس گئی تھی!

تب جب ایک عوام میں بے حد مقبول انسان کا ہندو ہونا یا مسلمان ہونا سیاسی رنگ پکڑ چکا تھا لالہ رُخ کو اپنے ایک مداح اور انسانی رشتوں کی قدر کرنے والے وادی کے ایک نیک اور امریکی شہریت والے ڈاکٹر کے ساتھ نکاح کے بعد امریکہ میں رہنا پڑا تھا مگر تب بھی اُس کا پاس رہنا یا دُور ہو جانا بے معنی ثابت ہوا تھا کیونکہ ان کے نغموں کو مندروں یا عبادت گاہوں میں کم، دُکھ سکھ کو بانٹنے والی سماجی اور ثقافتی محفلوں کے علاوہ شادی بیاہ کی تقریبات میں، سنجیدگی سے انسانی رشتوں کو مضبوط کرنے کی خاطر، ملک کے مختلف علاقوں میں مستقل طور پر رہنے والے وادی کے لوگ، وادی کے گلوکاروں کو موٹی رقمیں دے کر سکون طلب کرنے کی سعی کرتے ہیں بلکہ وادی کے جنگلوں میں صوفی سنتوں کو لالہ رُخ کی آواز سنائی دے رہی ہے! گویا نغموں کا مفہوم وادی کے گلستانوں، بوستانوں اور کھیتوں میں مہکتا ہوا محسوس کیا جا رہا ہے!

یہ وہ سچ ہے جو کھوجی ہیلی کاپٹر میں بیٹھے میرے ہم سفر نہیں جانتے ہیں! وہ اس لیے کہ وہ نغموں کے قدردان نہیں بلکہ ان کے سوداگر ہیں!!

میں الیکٹرانک میڈیا کا ایک ایماندار رُکن ہونے کا دعویٰ یہ سمجھ کر رہا ہوں کیونکہ کیمرہ ہر رنگ کو اپنے رنگ میں ہی قبول کرتا ہے، ہاں دُھند میں رنگ پھیکا ہو سکتا ہے! آواز بدل بھی جائے تو مفہوم نہیں بدل جاتا ہے!! وحدت اور تصوف کے قدردان تبدیلیوں کو تب قبول کرتے ہیں جب ٹھکرائی ہوئی سوچ میں خامیاں ہوں اور اپنائی ہوئی سوچ میں خوبیاں ہوں!

یادوں کے تعاقب کی وجہ سے لالہ رُخ کے بارے میں مختلف زاویوں سے نظر آنے والی خوبیوں اور خامیوں میں مصنوعی رنگوں کی آلودگی دیکھ کر میری فکر تحقیق اور تذبذب سے جاگ پڑتی

ہے! وہ اس لیے کہ میڈیا کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے میں لالہ رُخ کی جڑواں بیٹیوں کے بارے میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں بیٹیاں اپنی ماں کی گلوکاری میں سنگت کرتی رہتی ہیں اور وہ کئی برسوں سے بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے عارضی طور پر رہنے والے یا امریکہ کینیڈا میں مستقل طور پر شہریت لینے والے اکثر اپنے مخصوص پروگراموں میں لالہ رُخ کے نغمے سنتے رہتے ہیں! سکون بخش مواد کی خاطر! یہ کوئی جان لینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے کہ ایک بیٹی نے ہندو کے ساتھ شادی کیوں کی ہے؟ شاید اس لیے کہ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کی یہ پہلی ہندو مسلمان کی شادی تو ہے نہیں—؟!—!؟

اور اگر کسی نے بھی، آج تک، مذہب کے نام پر سازش رچ کر، اپنی ماں یا نانی کو قتل کرکے، اپنا نام دینے کی کوشش کی ہوتی تو لالہ رُخ کا قتل ہو سکتا تھا! یعنی موقعے کا فائدہ اٹھا کر لالہ رُخ کا ہندو نواسہ اُس کا اپنے دھرم کے طریقے سے ایک مسلمان کو سپردِ آتش کر سکتا تھا! ایسا تاثر مجھے میرے ہم سفروں نے دیا تھا! اور ان کے منصوبوں اور ارادوں کی کیفیت بھانپ کر میں یہ سمجھ گیا تھا کہ کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار کی گئی، لالہ رُخ کو عارفہ بنا کر، وادی میں دفن کرنے کی سازش اگر کامیاب ہو جائے تو یہ وادی کے دشمنوں کی منظم سیاسی جنگ ہو گی!

اچانک ایک زور کا جھٹکا محسوس کرتے ہوئے میرے خدشات اور یادداشت کے سلسلے لرز کر بکھر گئے! اور میں منظر دیکھ کر کانپ اُٹھا!

ایک مکمل طور پر برف سے ڈھک چکے جزیرے کے بارے میں ایک جدید ترین ہیلی کاپٹر میں بیٹھے چند کھوجی افسران نے اپنے ساتھ آئے چھ عدد ہیلی کاپٹروں میں بیٹھے اپنے عملے کو، جن میں میڈیکل ٹیم بھی شامل تھی، یہ ہدایات دیں کہ کوئی جزیرے پر اُترنے کی کوشش نہ کرے! وجہ یہ بتائی گئی کہ جزیرے کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں! آس پاس کوئی بحر ہے یا خلیج؟ یہ بھی معلوم نہیں! کیونکہ دوربینی نظریں، طاقتور مصنوعی روشنی کے باوجود ہر منظر دھندیا کہر کی چادر اوڑھ کر وجود کو محسوس کرتے ہوئے بھی خدا کے وجود کی طرح نظر نہیں آتا ہے یہ احساس دلایا گیا کہ یہ کسی علامتی یا کسی انہونی واردات کا اشارہ ہو سکتا ہے کیونکہ باہر کی حرارت منفی بیس ڈگری سلیسیں ہے جو اور بھی گر سکتا ہے! ہمیں انتظار کرنا پڑے گا—ایک امید کے سہارے کہ ہم سب کی دعا قبول ہو اور ہمیں دنیا بنانے والا زندہ رکھے جب تک ہمارا رابطہ بحال ہو سکے! اور جو ہیلی کاپٹر ہمارے منع کرنے کے باوجود یہاں تک آ چکا ہے ان کے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس سہولیات نہیں

ہیں اس لیے وہ اپنے بارے میں فیصلہ لے سکتے ہیں! ہمیں مشن کو پورا کرنے کی خاطر یہاں رُک جانا پڑے گا ورنہ جواب طلبی ہوگی!

میرے ہم سفروں نے مجھے نیچے اُتر کر عارفہ کو تلاش کرنے کا حکم دیا! وہ اس لیے کہ میں ہی اپنی لالہ رُخ کی تلاش کر سکتا تھا وہ اس لیے کہ جن اجنبی ہم سفروں نے جس کو کبھی دیکھا نہیں ہے وہ اُس کی شناخت کیسے کر سکتے ہیں؟! یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے اپنے ساتھ لانے کا مقصد کیا تھا!—؟!

جزیرے پر پھسل کر چلتے ہوئے مجھے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھ کر کھوجی ٹیم سربراہ مجھے ایک لائف جیکٹ دے کر، میرے ساتھ جہاز کا بلیک بکس کھول کر، یہ جان گیا ہے کہ جہاز کو جزیرے پر اُتارا تو گیا تھا مگر سرد ہواؤں کی وجہ سے کوئی بچ نہیں پائے گا! یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا—!!

میں نے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں سے کیمرے پکڑ کر دُھندلی نگاہوں سے چارسو دیکھا تو ایک شیشے کے مانند قالب میں اپنی لالہ رُخ کو پہچان لیا! میں نے فوٹو کھینچ کر اپنے ہم سفروں کو یہ اطلاع دی کہ ہماری لالہ رُخ نے وادی کے صوفی سنتوں کی طرح اپنے جسم کو برف میں ڈال دیا ہے!

ایک گرج دار آواز نے ٹوک کر کہا— نہیں— ہم مرحومہ کو جزیرے میں دفن کرنے کے بعد لوٹ کر جا رہے ہیں! وادی کے لوگوں کو اطلاع دینے کی خاطر! فوری طور پر!!

میرے ہم سفر جو میرے ہم نوا ہونے کے فرضی واقعات بنانے میں مصروف تھے جبکہ اُن کے قہقہوں کی آڑ میں، اُڑان کے دوران، میں اپنے کیمرے، اپنی مادری زبان میں، صداقت کو بیان کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں! اور سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ مجھے قتل بھی کر دیں گے تب بھی وہ میرے کیمرے میں قید کی گئی تصاویر کے ساتھ میری آواز سُن کر، ایک سنسنی خیز حقیقت سے آشنا ہوں گے! اور اگر ایسا ہوا تو شاطر حملہ آور کا چہرہ ویسے ہی نظر آ جائے گا جیسے شیطان کے کرتوت!!

میری آواز ہماری مادری زبان میں ہے، میرے ہم سفروں کے فاتحانہ قہقہوں میں ایک بچے کے رونے کی آواز کی طرح! کوئی ماں میری باتوں کا مفہوم سمجھ پائے اس لیے میں بار بار بولتا رہا! اور بولتا رہوں گا— اور بول رہا ہوں!

"میرے ہم وطنو—! میں اپنی لالہ رُخ کو دیکھ کر آیا ہوں—! بہہ رہی دریا کی موجوں کے ساتھ ہمارے گھاٹ تک آنے والی فاطمہ چاچی کی لاڈلی عارفہ نے اور میری ماں کی دُلاری رادھا نے ایک نامعلوم جزیرے میں برف میں اپنا ایک جسم بند کر دیا ہے! غالباً یہ سوچ کر کہ دنیا بنانے

والا خود کفن کے بندھ کھول دے گا! جو جشن منا رہے ہیں! وہ نہیں ہیں ہمارے ہم سفر بلکہ وہ ہیں ہمارے خود ساختہ چارہ گر ہیں اور ہمارے کرب سے بے خبر! — اصل میں وہ ہیں ستمگر!! گویا ہمارے نوحہ گر ہیں آنسوؤں کے سوداگر!!

میں شاید آپ کو مل نہیں پاؤں گا! — اس لیے کہ کیمرہ چھین کر مجھے مار ڈالیں گے میرے ہم سفر! مجھے فخر ہے کہ میں لالہ رُخ کو بچپن سے جانتا ہوں! — اور میں ان کے نغموں کو آخری دم تک گنگناتا رہوں گا!

اُس سے زیادہ فخر اس بات کا کہ میں حسن نانوائی کو بھی جانتا ہوں!

وہ نہ ہوتے تو ہماری لالہ رُخ بھی نہ ہوتی!! وہ گایا کرتے تھے!

روح اللہ کی طرح غیر فانی ہے! جسم عارفہ کا ہو یا لالہ رُخ کا — فانی ہے! جسم مٹی ہے! — ہوا ہے! — جو ایک پاکیزہ کو اپنا کر خوشبو بکھیرتی ہے!!

OO



ویریندر پٹواری
ای-8، سیکٹر-41، نوئیڈا-201303 (اتر پردیش)

کوائف

- نام : پنڈت ویریندر کمار پٹواری

ولد : مرحوم پریم ناتھ پٹواری مسرور کشمیری

قلمی نام : ویریندر پٹواری

پیدائش : 11 ستمبر 1940ء

جائے پیدائش : سری نگر، کشمیر

تعلیم : سول انجینئرنگ گریجویٹ، ممبر انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز انڈیا

- **پہلی کہانی** : 'سسکیاں' جو 1965ء میں شائع ہوئی تھی۔ تا حال تقریباً 270 کہانیاں جو ملک کے انٹرنیشنل لیول پر شائع ہونے والے ادبی جرائد مثلاً 'آجکل'، 'شاعر'، 'بیسویں صدی'، 'انشا'، 'امکان'، 'روزن'، 'ایوانِ اُردو'، دل رس، 'تمثیل'، 'شیرازہ'، 'مباحثہ' جیسے معیاری جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔



- **کتب** 8 عدد افسانوں کے مجموعے:

'فرشتے خاموش ہیں' (1981)، 'دوسری کرن' (1986)

'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' (1988)، 'آواز سرگوشیوں کی' (1995)،

'ایک ادھوری کہانی' (2002)، 'اُفق' (2003)، 'دائرے' (2010)،

'آفتوں کے دور میں' (2011)۔ لالہ رُخ (2013)

دو عدد ڈراموں کے مجموعے:

'آخری دن' (1983)، 'انسان' (2006)

ہندی میں ناولٹ: 'کب بھور ہوگی' (2000)

کشمیری افسانوں کا مجموعہ 'علم' (2007)

ڈرامے پہلا ریڈیو ڈرامہ 'گھر' 1981ء

پہلا ٹی وی ڈرامہ 'ماں' 1981ء

تا حال 16 عدد ریڈیو ڈرامے، 7 عدد ٹی وی پلیز،

6 عدد ٹیلی فلمز، 18 عدد ٹیلی سیریلز، تقریباً 100 قسطیں

- **تحقیقی مطالعے میں آچکے دو عدد مجموعے** (بابت ایم فل جموں یونیورسٹی)

(1) بے چین لمحوں کا تنہا سفر (افسانوں کا مجموعہ)

(2) انسان (ڈراموں کا مجموعہ)

- **انعامات**: اُردو اکادمی بہار: دوسری کرن،

آواز سرگوشیوں کی، اُفق

دہلی اُردو اکادمی: 'انسان'